روشنیوں کے عذاب
نگہت سیما

فہرست

نمبر شمار | عنوانات | صفحہ
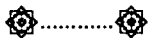
روشنیوں کے عذاب

''یہ ہیں مسز شگفتہ حمید۔'' جامی اپنے کسی دوست سے اس کا تعارف کرا رہا تھا۔''
اور یہ عارف ہے میرا دوست۔''

''شگفتہ حمید۔'' عارف نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا'' وہ جس کا سوسائٹی میں اتنا شہرہ ہے۔''

''ہاں، یہ میں ہوں شگفتہ۔ بہت ہی سویٹ، بہت ہی پاپولر۔'' اس نے سوچا۔'' اور یہ میں ہوں مسز شگفتہ حمید۔'

اس نے میز کی چمکیلی سطح کو اپنی لانبی انگلیوں سے چھوا۔'' تو پھر وہ کون ہے؟ وہ میلے کپڑوں والی احمق سی لڑکی، جو ان بھاری پردوں کے پیچھے سے سہمے سہمے سے انداز میں جھانک رہی ہے۔ جو ماضی اور حال کو الگ کرتے ہیں۔''

اس نے لاشعوری طور پر میز پر اپنے نوکیلے ناخن سے ترچھی لکیر کھینچی۔'' یہ پردے ہم نے اپنے ماضی پر کیوں ڈال رکھے ہیں۔ اور ان رنگین لبادوں سے ہم نے اپنے آپ کو کیوں چھپا رکھا ہے۔ پتا نہیں ہمیں ہر چیز کو چھپانے کا اتنا شوق کیوں ہے۔ اور وہ بیوقوف سی لڑکی ان دبیز پردوں کے پیچھے سے اب تک کیوں جھانک رہی ہے۔'' وہ جھنجھلا سی گئی۔''

''اوہ۔ نان سنس۔'' اس نے حقارت سے منہ بنایا۔ اور پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔'' یہ انٹر کانٹینٹل ہے اور میں مسز شگفتہ ہوں۔'' اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

''کیوں ٹھیک ہے نا مسز حمید۔'' جامی نہ جانے کس بات پر ہنستا ہوا اچانک اس سے مخاطب ہوا۔

"اوہ...... ہاں۔" اسے ہنستا دیکھ کر اس نے ایک مترنم قہقہہ لگایا، اور سوچنے لگی۔ "پتا نہیں۔ وہ کون سی بات پر اتنا ہنس رہے ہوں گے؟ یہ غلط بات ہے۔" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "میں اس وقت دو شریف آدمیوں کے ساتھ بیٹھی ہوں اور اس طرح ان کی طرف سے لاتعلق ہو جانا تہذیب کے خلاف ہے۔" وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہاں تو مسز حمید، یورپ کا ٹور کیسا رہا؟ جامی نے پوچھا۔

"سو سو۔" اس نے گلاس ہاتھ میں لے کر چسکی لی۔

"وہاں کی زندگی تو بڑی کلرفل ہو گی؟" عارف نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو دیکھنے والی آنکھ پر منحصر ہے۔ ورنہ رنگینی کہاں نہیں ہوتی۔" جامی کہہ رہا تھا۔

"جامی ہمیشہ شاعرانہ باتیں کرتا ہے۔" اس نے سوچا، یہ عارف ہے۔"

عارف نے قہقہہ لگایا۔ "یہ عارف ہی تو ہے جامی کا کوئی دوست۔ لیکن وہ کون ہے جو مسلسل میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے؟

"شگو...... شگی۔" وہ پور پور محبت اور مٹھاس میں بھیگا ہوا لہجہ۔ ارے وہ تو سلیم عارف ہے، جس نے ایک سہمی سہمی احمق سی لڑکی سے محبت کی تھی۔ وہ سلیم عارف کتنا خوش رہا کرتا تھا۔ ہر وقت ہنستا مسکراتا، اور یہ جو عارف ہے ناں جامی کا دوست، اس کے چہرے پر کیسا تہہ در تہہ جمے ہوئے کہرے کی طرح اداسی کا غبار ہے۔ ہنستا ہے قہقہہ لگاتا ہے تو آنکھیں دھواں دھواں ہو جاتی ہیں۔ اور چہرہ چٹخنے لگتا ہے اور یہ بات طے ہے کہ اس عارف کا اس سلیم عارف سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے سر اٹھا کر عارف کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مگر اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے نگاہیں چرا لیں۔

"یہ بار بار میری آنکھوں کو دھوکا سا کیوں ہونے لگتا ہے۔ جیسے یہ شخص، یہ جو جامی کا دوست ہے نا یہ۔ شاید میری آنکھوں سے پہچان ختم ہو گئی ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ اور رومال سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے سوچا۔ نہیں میری آنکھوں سے پہچان ختم نہیں ہوئی۔ اگر میری آنکھوں سے پہچان ختم ہو جاتی تو میں سجو کو کیسے پہچانتی؟ ہاں وہ سجو ہی تو تھا۔ آج صبح میں نے اسے کتنے برسوں بعد دیکھا تھا۔ سجو وول ہاؤس سے اون لے کر نکل رہا تھا۔ اور وہ میجر امتیاز کے ساتھ چائنیز ریسٹورنٹ کے باہر کھڑی نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ سجو کے بال ہمیشہ کی طرح بکھر کر اس کی پیشانی پر آ گئے تھے۔

اس کا جی چاہا کہ پیار سے اس کے بال پیچھے کرتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لے تب ہی سجو نے اسے دیکھ لیا۔ لمحے بھر کو وہ ٹھٹھک گیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ حقارت سے اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

اس کے اٹھے ہوئے بازو نیچے گر گئے۔ چمکتی ہوئی آنکھیں بجھ گئی تھیں اور دل چٹخنے لگا تھا "خدا کے لیے سجو! یوں منہ موڑ کر نہ جاؤ۔ میں نے تو تمہیں گودوں کھلایا ہے اور راتوں کو تمہارے لیے جاگی ہوں۔ تمہیں لوریاں دے کر سلایا ہے سجو۔ میرے بھائی۔ میرے منے، میرے بیٹے! تم نے تو میرا لہولہو جسم دیکھا تھا۔" میری ساری غلطیوں کو معاف کر کے ذرا کی ذرا رک کر مجھ سے پوچھا ہوتا۔ "بڑی آپا! تم دکھی ہو۔ آؤ میں تمہارے زخموں پر مرہم رکھ دوں۔ تنہا ہو۔ چلو میں تمہارا درد بانٹ لوں۔" اور میں سارے ناتے توڑ کر تمہارے سنگ چل پڑتی۔ کہ میری گھائل روح کو تو پیار کے پھاہوں کی ضرورت تھی، اور تم اجنبیت کے زخم لگا کر چلے گئے۔"

حلق میں اکٹھا ہو جانے والے آنسوؤں نے اس کے اندر آگ لگا دی اور اس نے اپنی لانبی لانبی انگلیوں والے نازک ہاتھوں کو بے چینی سے مسلا۔

"آپ کے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں، بے حد۔ اتنے کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں چھو کر دیکھوں۔ لیکن میرا ہاتھ لگنے سے یہ میلے ہو جائیں گے۔" جامی کی فطرت میں بڑی بے باکی ہے وہ جو کچھ سوچتا ہے برملا کہہ دیتا ہے۔

اس نے جامی کو دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ دیکھنے لگی۔

"تمہارے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں شگو۔ کیا میں انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھ لوں۔"

"اوہ...... ہوں...... بالکل نہیں۔" وہ ہاتھ چھپا لیتی۔

"صرف ایک بار۔"

اوہ...... یہ کیسی آوازیں ہیں؟ اجنبی، انجانی لیکن جانی پہچانی سی۔ یہ آوازیں، جو رہ رہ کر اس کے اندر گونجنے لگتی ہیں۔

"ان ہاتھوں کو چھونے کا حق تو صرف ایک شخص کو ہو گا۔"

"کس کو؟" ننھے منے دو لفظ اشتیاق کے شہد میں بھیگ جاتے اور اس کی آنکھوں

میں ستارے سے جلنے بجھنے لگتے۔ رخساروں پر آگ سی جل اٹھتی۔

''نہیں۔ مگر ابھی نہیں۔''

اس نے اپنا سر زور سے جھٹکا اور جامی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اب تو ان ہاتھوں کو ہر کوئی چھو سکتا ہے۔ جانے اس نے انہیں اپنے ہاتھوں میں لیا ہوگا۔ ہونٹوں سے لگایا ہوگا۔ ایک دم اسے اپنے ہاتھوں سے کراہت ہونے لگی۔ غلیظ گندے ہاتھ، میلے نوٹوں کی طرح، جو بہت سے ہاتھوں سے گزرنے کے بعد گندے اور بوسیدہ ہو جاتے ہیں اگرچہ ان کی افادیت اور ان کی حیثیت برقرار رہتی ہے، حتیٰ کہ لوگ انہیں بنک میں واپس کر کے نئے نوٹ لے لیتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا بینک نہیں، جہاں سے وہ ان ہاتھوں کو واپس کر کے نئے ہاتھ لے لے؟ بالکل صاف ستھرے ان چھوئے، پاکیزہ مقدس ہاتھ جنہیں کبھی کسی نے نہ چھوا ہو۔ کسی نے نہ دیکھا ہو اور انہیں دیکھنے انہیں چھونے کا، حق صرف ایک شخص کو ہو بلکہ وہ تو اپنا سارا وجود ہی بدل ڈالے۔

''کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے مسز حمید؟ شاید میرا اس طرح تعریف کرنا آپ کو برا لگا۔''

''اوہ...... نہیں۔ نہیں تو۔'' وہ چونک پڑی۔

''کیوں عارف؟'' وہ عارف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''میں نے ٹھیک کہا ناں؟ مسز حمید کے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں۔''

''ہاں...... شاید...... نہیں۔''

''نہیں کے بچے۔ کیا تم نے اپنی زندگی میں اتنے خوبصورت ہاتھ دیکھے ہیں؟'' جامی نے اس کی پیٹھ پر دھپ لگائی۔

''ہاں۔ واقعی خوبصورت ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''یہ شخص اس طرح قہقہہ کیوں لگاتا ہے؟ اتنا اونچا لیکن بے جان مردہ قہقہہ جو آدمی کے وجود کی ساری عمارت کو ہلا دے۔ اور اس کے ان قہقہوں سے میرے وجود کی عمارت میں زلزلہ سا کیوں آجاتا ہے؟ جیسے ابھی دھڑام سے یہ عمارت گر پڑے گی۔ اور اس کے ملبے کے نیچے آکر سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ختم ہو جائے گا۔ مگر میرا اندر تو بالکل خالی ہے اور دل بھی بالکل غیر آباد اور ویران ہے۔ اجنبی اور دور دراز جزیروں کی طرح، جہاں کبھی کسی نے قدم نہ

رکھا ہو۔ اور اگر کوئی بھولے سے، غلطی سے کسی جزیرے پر نکل آیا ہو تو وہاں کے کھارے پانی اور بنجر زمین اور وحشی جانوروں نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا ہو۔ میرا دل بھی تو سمندروں کے اندر بہت دور ایک اجنبی ویران جزیرہ تھا۔ جس میں بسنے والی خواہشوں کے وحشی جانوروں نے اس پر قدم رکھنے والے اکلوتے شخص کو، اس پہلے اور آخری شخص کو واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور تب سے یہ جزیرہ غیر آباد ہے۔ اور کسی دن سمندر کا پانی اس کے ساحل کو کاٹتا ہوا اپنے اندر چھپا لے گا۔ اپنی بانہوں میں لے لے گا۔ مگر کب؟'' کب کٹے گا یہ تنہائی کا عذاب۔''

''یار عارف! میں تمہیں اس لیے ساتھ نہیں لایا تھا۔ کہ تم یہاں بقراط بن کے بیٹھ جاؤ۔ ارے بھئی یہ مسز شگفتہ حمید ہیں جن کی کمپنی کی خواہش بڑے بڑے لوگ کرتے ہیں اور۔''

''اچھا۔ یہ مسز شگفتہ حمید ہیں۔'' عارف نے اسے یوں دیکھا جیسے اب تک وہ اس کے وجود سے بے خبر تھا۔

''ہاں۔ یہ مسز شگفتہ ہی ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑی خوبصورت باتیں کرتی ہیں۔ کیوں مسز حمید؟'' جامی نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ''یہ میں بیٹھے بیٹھے کہاں کھو جاتی ہوں؟'' اس نے سوچا اور جامی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''عارف صاحب واقعی بہت چپ چپ سے ہیں۔'' اس نے عارف کی آنکھوں میں دیکھا۔ اف کتنا اندھیرا تھا وہاں۔ اس نے ڈر کر نگاہیں جھکا لیں۔ اندھیروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔

''تمہاری آنکھوں میں ہر وقت کیسی روشنیاں سی کوندتی رہتی ہیں عافو! میں ان میں دیکھتی ہوں تو میرا سارا ڈر دور ہو جاتا ہے۔'' وہ ایک ڈری ڈری بزدل لڑکی، دبیز پردوں کے پیچھے کھڑی جانے کس سے کہہ رہی تھی۔ پھر وہ مدھم سی سرگوشی، محبت میں بھیگی ہوئی نرم نرم شبنم کی پھواریں۔

''پتا ہے۔ یہ روشنیاں اس لیے ہیں کہ تمہیں ڈر نہ لگے۔ تم جو رہتی ہو ان آنکھوں میں۔''

''اور اب یہ روشنیاں کیوں بجھ گئی ہیں؟ اتنا اندھیرا کیوں ہے ان آنکھوں میں؟ کیا

اب میں ان آنکھوں میں نہیں رہتی؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے عارف کی طرف دیکھا، پھر دل ہی دل میں ہنس دی۔ ''یہ میں ایسے سوال اس شخص سے کیوں پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ جو میرے لیے اجنبی ہے۔ بالکل اجنبی صرف جامی کا دوست ہے جو ابھی چند لمحے پہلے اسے اور جامی کو اچانک مل گیا تھا اور جامی اسے زبردستی اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ اور پھر وہ جامی کو بھی تو زیادہ نہیں جانتی، سوائے اس کے کہ وہ سیٹھ حمید کے کسی دوست کا بھتیجا ہے۔ جو چند سال قبل جرمنی سے صحافت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے۔ اور یہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا چاہتا ہے۔ سو چند ماہ سے ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

''یار عارف! آخر تم اتنی دیر سے کیا سوچ رہے ہو؟'' اللہ کے بندے کچھ اپنی سناؤ، کچھ ہماری سنو۔''

''میں تو ان ہاتھوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو اتنے ہی خوبصورت، اتنے ہی نازک تھے۔ انہیں دیکھ کر انہیں چھونے اور انہیں چومنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ ہاتھ بڑے پوتر، بڑے مقدس تھے، وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اور اسے لگا جیسے کوئی چیز اس کے اندر چٹخنے لگی ہو۔ جو ابھی چند لمحوں میں ٹوٹ جائے گی۔

''گویا حضرت ابھی تک وہیں الجھے ہوئے ہیں۔'' جامی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''میں بھی کہوں کہ آخر کون سا لاینحل مسئلہ حل کیا جا رہا ہے۔ بائی دا وے وہ ہاتھ کس کے تھے؟'' تمہاری اسی کزن کے؟''

جامی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے سامنے رکھی کوک کی خالی بوتل سے اسٹرا نکال لیا اور اضطراری کیفیت میں اسے دانتوں سے کچلنے لگا۔

''مسز حمید۔'' جامی نے شگفتہ کی طرف دیکھا۔ جس کے رخساروں کی سرخی سپیدی میں بدل رہی تھی۔

''یہ جو عارف ہے نا، یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ پورا ڈفر ہے۔ وہاں جرمنی جیسے ملک میں بھی اپنے کمرے میں گھسا رہتا تھا۔ ہمیں تو وہ کوئی ماورائی مخلوق لگتی تھی۔ ایسے لمحوں میں بھی جب بڑے بڑے زاہدوں کے پاؤں پھسل جائیں یہ نہیں ڈگمگایا۔ ہم سب کی گرل فرینڈز تھیں۔ جن کے ساتھ ہم گھومتے تھے، انجوائے کرتے تھے۔ خود میری کئی فرینڈز تھیں۔ لیلیٰ، نینا، شیلا، الزبتھ۔'' وہ انگلیوں پر گننے لگتا۔

''بس مجھے یقین آ گیا کہ تمہاری بے شمار فرینڈز تھیں۔'' شگفتہ نے خوش دلی سے کہا۔

''اور یہ بور آدمی۔'' جامی نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا'' کہا کرتا تھا۔ پورے جرمنی میں ایک لڑکی بھی اسی جیسی نہیں ہے۔ وہ ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ حسین ہے۔ سب سے الگ اور منفرد ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کے بال، ارے بھئی تمہاری ان ساری فرینڈز میں ایک بھی ایسی نہیں کہ میں کہہ سکوں۔'' اس کی آنکھیں، ہونٹ اور ہاتھ اس سے ملتے ہیں۔ ویسے یار عارف!'' وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تمہاری وہ کزن یا منگیتر مسز حمید سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پورے پاکستان میں ان جیسی خوبصورت عورت کم از کم اس صدی میں تو پیدا نہیں ہوئی ہو گی۔''

''ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ پورے پاکستان میں ان جیسی خوبورت عورت کم از کم اس صدی میں تو پیدا نہیں ہوئی ہو گی۔'' اس نے جامی کی بات دہرا دی۔

''سنئے، مسز حمید! آج تو سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل آیا ہے۔ وہ شخص آپ کے حسن کا اعتراف کر رہا ہے، جس کی نظر میں دنیا کی کوئی عورت جچتی ہی نہیں ہے۔''

اس نے مسکرانے کے لیے ہونٹ پھیلا دیے اور میکانکی انداز میں تھینک یو کہا۔ اب تو وہ ان باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ کوئی اسے کے حسن کی تعریف کرتا تو اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ پچھے چند سالوں میں لوگوں نے اسے بے تحاشا سراہا تھا۔ اس کے حسن کی جی کھول کر داد دی تھی۔ ہاں البتہ بہت سال پہلے جب۔ اور وہ میلے میلے کپڑوں والی معصوم سی لڑکی، اپنے الجھے الجھے سے بال ہاتھوں سے سنوارتی دبیز پردوں کے پیچھے سے ایک بار پھر جھانکنے لگی۔

''ان ناگنوں کو یوں نہ الجھنے دیا کرو۔ جب کنگھی کے دندانوں سے یہ بنفشے ل ءتار ٹوٹتے ہیں تو کسی غریب کے دل پر قیامت گزر جاتی ہے۔''

وہ سرخ پڑ جاتی۔ اس کا سارا وجود ایک انجانے سے احساس سے تپ اٹھتا، اور وہ اپنے بالوں میں جلدی جلدی برش کرتے ہوئے معصومیت سے کہتی۔ ''اتنا کام ہوتا ہے، مجھے کہ بال سلجھانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔''

''مجھ سے کہا کرو، میں تمہارے کام کر دیا کروں گا۔'' لفظ شہد میں ڈوب گئے۔

''ہا۔ ئے نہیں عافو! تم پہلے ہی کتنے تھکے ہوئے ہوتے ہو۔ اپنی پڑھائی، ٹیوشن اور

پھر سارے بچوں کو پڑھانا۔''

''تمہیں دیکھ کر تو روح میں گلاب کھل اٹھتے ہیں۔ جب آنکھوں کے ہیرے، رخساروں کا سونا، اتنا بڑا خزانہ ہو تو ساری تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔'' وہ نہ جانے کہاں کہاں سے تشبیہیں ڈھونڈ لاتا تھا۔''

''اللہ۔ عافو! ایسی باتیں نہ کیا کرو، مجھے شرم آتی ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی۔ اور اس کی آنکھوں میں قمقمے جل اٹھتے۔

''پتا ہے شگی۔'' تمہاری یہی ادا تو مجھے مار ڈالتی ہے۔''

''ارے مسز حمید! آپ کے وہ لاثانی صاحب تو ابھی تک نہیں آئے۔''

''ہاں۔'' وہ چونکی۔ آخر یہ آوازیں، یہ سرگوشیاں اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔

یہ انٹرکونٹینل ہے شگفتہ حمید۔'' اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔ اور تم جو بڑی با اعتماد اور بہادر بنتی ہو تم میں اتنی جرأت نہیں کہ تم اس احمق لڑکی کو یوں اس طرح بار بار ڈسٹرب کرنے پر روک دو۔ وہ بے وقوف سی لڑکی تو اپنی چھوٹی سی گلی میں بھی نکلتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اور وہ کہتا تھا۔

''اتنا ڈرا مت کرو شگی۔ اپنے اندر تھوڑا سا اعتماد پیدا کرو۔ آخر تم اس گھر کی سربراہ ہو۔''

اور یہ کیسا اعتماد اس کے اندر پیدا ہوا تھا کہ وہ گلی کیا ساری حدیں پھلانگ گئی تھی۔

''ہیلو۔ مسز حمید!'' جامی نے اپنی انگلیوں سے میز بجائی۔

''ہاں۔ کیا کہہ رہے تھے تم۔''

''میں کہہ رہا تھا کہ آپ کے وہ لاثانی صاحب سچ مچ ہی لاثانی نکلے چار بجے کا ٹائم دے کر ابھی تک ندارد ہیں۔''

''کہا تو انہوں نے یہی تھا کہ میں ٹھیک چار بجے انٹرکون میں پہنچ جاؤں گا۔ بہر حال میں فون کر کے پتا کر لیتی ہوں۔ کہ کیا بات ہے۔'' وہ اٹھ کر ریسپشن کی طرف چلی گئی۔

جامی کو اپنے اخبار کے لیے کچھ سرمائے کی ضرورت تھی۔ اور سیٹھ حمید نے کہا تھا کہ لاثانی صاحب اس کام میں سرمایہ کاری کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ جامی کو ان سے ملوا دے، اور جہاں تک ہو سکے جامی کی سفارش بھی کر دے۔ جب وہ فون کر کے جامی اور عارف کی پشت پر پہنچی تو جامی کہہ رہا تھا۔

''تو عارف یار! یہ جو سیٹھ حمید ہے نا۔ انتہائی بدشکل اور بے ڈھنگا سا آدمی ہے، اس کی عمر پچاس برس سے کہیں زیادہ ہی ہوگی۔ پہلوئے حور میں لنگور والی مثال اس پر صحیح صادق آتی ہے۔ مجھے تو مسز حمید پر ترس آتا ہے پور گرل۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی خوبصورت اور حسین لڑکی کو ایک بوڑھے سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب بھی اگر وہ حمید صاحب سے طلاق لے لے تو بہت سے لوگ اسے اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے اپنی بہن بھائیوں کے مستقبل کی خاطر یہ قربانی دی تھی۔''

''نہیں۔ یہ جھوٹ ہے، غلط ہے۔'' شگفتہ نے کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے اس کی آواز کو ابھرنے نہ دیا۔ اس کے غیرت مند بھائی اور خود دار ماں نے تو اس کی مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سیٹھ حمید سے شادی کے بعد جب وہ پہلی بار اپنی لمبی سی گاڑی میں قیمتی تحفوں سے لدی پھندی گھر پہنچی تو اس کے غیر مند بھائی نے جو اس وقت بمشکل اس کے کندھوں تک آتا تھا، ایک دم بڑا بن کر کہا تھا۔

''تمہاری یہ بڑی سی گاڑی ہماری اسی چھوٹی سی گلی میں نہیں آ سکتی بڑی آپا۔ تم یہاں مت آیا کرو۔''

اس نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''اور تم یہ مت سمجھنا بڑی آپا! کہ تمہارے بعد سب بھوکے مر جائیں گے۔ میرے بازوؤں میں اتنی قوت ہے کہ میں سب کے لیے روٹی مہیا کر سکوں۔''

اس کی خود دار ماں نے اسکے لائے ہوئے سارے تحفے اس کے منہ پر دے مارے تھے۔'' آئندہ اس گھر میں مت آنا شگو۔ امیروں اور غریبوں کا کوئی ناتا نہیں ہوتا۔ ہم سمجھیں گے تو مر گئی۔''

پھر شاید اس نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیا تھا۔ اور سوچا تھا کہ آخر ان سب کو کیا ہو گیا ہے؟ اماں اور سجاد اتنے بیوقوف تو نہ تھے؟ وہ ان تحفوں کو قبول کیوں نہیں کر لیتے؟ اس نے تو شادی سے پہلے ہی سیٹھ حمید سے بات کر لی تھی کہ وہ اس کے بہن بھائی کی کفالت کرے گا۔ اور اگر سیٹھ حمید انکار کر دیتا تو شاید وہ ان سے شادی نہ کرتی۔ سجو کو انجینئر بننا تھا۔ نغمی کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ تب اس نے اماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اماں! میں نے حمید سے بات کر لی تھی۔'' وہ ہر مہینے ایک معقول رقم۔''

اماں نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور سجاد نے عجب کھوئے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ ''بڑی آپا! ہمیں سیٹھ حمید کی بھیک کی ضرورت نہیں ہے، اور تم دیکھ لینا نغمی ضرور ڈاکٹر بنے گی اور میں۔

تب اس نے مڑ کر سب کی طرف دیکھا تھا۔ جو خاموشی سے ایک طرف کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ نغمی کو، جواد کو، منے کو اور بے بی کو۔ سبھی نے اپنے ہاتھ پیچھے چھپا رکھے تھے۔ وہ بوجھل قدموں سے مڑی تب ہی اسے لگا جیسے منے نے سسکی لی ہو۔ ''بڑی آپا!

یہ سب اسے کتنے پیارے اور اس کے کتنے قریب تھے، یہ سوچتے ہوئے اس کا جی چاہا وہ دوڑ کر سب کو بھینچ لے، سجاد کو منا لے، نغمی سے پوچھے۔ ''نغمو! تو مجھ سے کیوں روٹھی ہوئی ہے؟'' وہ بے اختیار پلٹی لیکن سجاد نے ان چاروں کو اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ نغمی کو، جواد کو، منے کو اور بے بی کو، اور ان کے بالوں پر چہرہ رکھے پتا نہیں ان سے کیا سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اماں اس کی طرف پیٹھ کیے سامنے کی دیوار تک رہی تھیں۔ سب نے اپنے آپ کو اس کے لیے اجنبی بنا لیا تھا۔ ''اماں! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ شادی کرنا گناہ نہیں ہے۔ میں نے تو۔''

''بس۔ آگے اور کچھ نہ کہنا شگو۔ اور اب چلی جا۔ مزید دکھ نہ دے ہمیں۔ اور نہ آزما اور دیکھ دوبارہ یہاں نہ آنا۔'' اماں نے دیوار کی طرف تکتے ہوئے کہا تو وہ بھاگتے ہوئے سڑک تک آ گئی۔ باوردی ڈرائیور نے فوراً کار کا دروازہ کھولا، اور احترام سے ایک طرف ہو گیا۔ اس نے سر جھکائے ڈرائیور کو دیکھا۔ اور پھر اس لمبی سی ایئر کنڈیشنڈ کار کو۔ اداسی کا وہ غبار جو اماں اور سجاد کی باتیں سن کر اس کے دل پر چھا گیا تھا آپ ہی آپ اتر گیا اور وہ کمندیں جو بار بار اسے پیچھے لوٹنے پر مجبور کر رہی تھیں، خود بخود ٹوٹ گئیں۔ اس کے اندر غبار سا بھر گیا اور اس نے سوچا۔ یہ لوگ کتنے عجیب ہیں۔ بجائے خوش ہونے کے اس پر خفا ہو رہے ہیں، وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں نے کیا حاصل کیا ہے؟ انہیں خوش ہونا چاہیے تھا کہ میں اب ایک آرام دہ پرآسائش زندگی گزارنے جا رہی ہوں۔ میں اب وہ سب کچھ حاصل کر سکتی ہوں۔ جسے پہلے صرف دیکھ سکتی تھی۔ خوابوں اور خیالوں میں، اور اگر وہ یوں اپنا آپ اس سے کھینچ نہ لیتے تو وہ انہیں بھی یہ آسائشیں مہیا کر سکتی تھی۔

کوئی کسی کے لیے قربانی نہیں دیتا دوست سب اپنے لیے ہی قربانیاں دیتے ہیں صرف اپنی خاطر، اپنے خوابوں اور اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے۔'' عارف سچ ہی کہہ ر

تھا۔ اس نے سب کچھ اپنے لیے کیا تھا۔ اپنی خاطر اس سے وہ کتنی خودغرض ہو گئی تھی۔ لیکن عارف کے لہجے میں کتنی تلخی ہے؟ جیسے ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا ہو۔ اور یہ زہر اس کے اندر اترنے لگا۔ اس کے ہونٹوں اور حلق کو کڑوا کرتا ہوا ہولے ہولے اس کے وجود میں سرایت کرنے لگا۔ وہ کھڑے کھڑے لہرا گئی۔ ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔

''ارے۔ ارے یہ مسز حمید کو کیا ہوا؟''

جامی نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کی طرف لپکا۔ ''کیا ہوا مسز حمید؟''

''کچھ نہیں یونہی ذرا چکر آ گیا تھا۔''

ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ زبردستی مسکرائی، اور جما جما کر قدم رکھتے ہوئے واپس آ گئی۔ عارف اسی طرح اسپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور ابھی تک اس کے ہاتھ میں اسٹرا تھا جسے وہ دانتوں میں کچل رہا تھا۔

''ہاں تو لاثانی صاحب سے بات ہوئی؟'' جامی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ باہر سے کچھ مہمان آ گئے تھے۔ آدھ گھنٹے تک آ رہے ہیں، البتہ تم مطمئن رہو۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارے اخبار میں پیسہ لگانے کے لیے تیار ہیں۔''

''ہرا...... جامی نے خوشی سے نعرہ لگایا۔'' کیا خیال ہے کہ اسی خوشی میں ایک ڈرنک اور نہ ہو جائے؟''

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سر ہلا دیا۔

جامی نے تینوں کے لیے...... کوک منگوائی اور مینو اٹھا کر نشان لگانے لگا۔ مینو بیرے کے حوالے کرتے ہوئے اس نے شگفتہ کی طرف دیکھا۔ ''ہاں تو مسز حمید! مجھے اتنے دن ہو گئے آپ کے ساتھ رہتے ہوئے مگر آپ کے کسی عزیز سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کے والدین اور بہن بھائی کیا اسی شہر میں رہتے ہیں؟''

لمحے بھر کو جیسے اس کا دل ڈوب سا گیا۔ اس نے گلاس اٹھا کر دو گھونٹ بھرے۔

''سوری۔ میرے سوال سے شاید آپ کو تکلیف ہوگئی ہے۔'' جامی شرمندہ ہو گیا۔

''دراصل مجھے ہر چیز کے متعلق تجسس ہوتا ہے۔ صحافی جو ہوا'' اس نے وضاحت کی۔

''نہیں تو۔'' اس نے ایک گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ اور جامی کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

"اوہ تھینک یو......تو پھر؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرا کوئی نہیں ہے، ماں، باپ، بہن، بھائی، کوئی بھی نہیں۔" اسے لگا جیسے وہ جان کنی کی اذیت سے گزر رہی ہے۔

عارف نے چونک کر کوک کی بوتل میز پر رکھ دی، اس نے عارف کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ان دیکھی آگ میں جل رہا تھا۔ جیسے اس کے اندر کچھ ڈھے گیا ہو ختم ہو گیا ہو۔ اس نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ اور ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھ لیا اور بہت سے چہرے ادھر ادھر کونوں کھدروں میں چھپے دبیز پردوں کے پیچھے سے جھانکنے لگے۔

یہ اتنے شاندار سے آدمی، جن کی آنکھوں اور جن کے چہرے سے ہمہ وقت محبت و شفقت ٹپکتی تھی۔ اس کے ابا تھے۔ اتنے اچھے، اتنے پیارے اور محبت کرنے والے ابا۔ وہ گھر آتے تو سارے بچوں کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیتے اور اسے لگتا جیسے ابا کے گھر آتے ہی سارا گھر روشن ہو گیا ہو، درودیوار ہنسنے لگے ہوں۔ وہ کام کرتے ہوئے تھوڑی دیر بعد چپکے سے انہیں دیکھا کرتی تھی۔ اسے ابا بہت اچھے لگتے تھے۔ پھر جب انہیں فالج ہوا تھا، تب بھی وہ یونہی ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ سارے بچوں کو اپنے اردگرد اکٹھا کیے کبھی کیرم کھیلتے، کبھی لوڈو اور کبھی لطیفے سنا سنا کر سب کو ہنساتے۔

"رونی رونی شکلیں بنا کر مت پھرا کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔ یہ تو تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔" وہ پلکوں تک آئے ہوئے اس کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھ دیتے۔

"دیکھی! خوش رہا کرو ابھی تو میں زندہ ہوں اور یہاں چارپائی پر بیٹھ کر بھی تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

اور وہ اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے سارا دن اپنے گرد بانس کے تنکے، گڈی کاغذ، روغن اور خدا جانے کیا کیا الا بلا اکٹھا کیے رکھتے۔ ان کے ہاتھ چلتے رہتے اور ان کے سامنے رنگ رنگی پتنگیں، کاغذ کی ڈگڈگیاں۔ ٹرٹر کرتے ہوئے مینڈک اور بھمبیریوں کا ڈھیر لگا رہتا۔ اور وہ کہا کرتے۔ بچپن میں سیکھی ہوئی چیزیں بھی کبھی کتنے کام آتی ہیں۔" شام کو جواد کے ہاتھ وہ ساری چیزیں گلی کے نکڑ والے دکان دار کے پاس بھجوا دیتے۔ جونہی سب بچے اپنے اپنے اسکولوں سے آجاتے تو وہ ساری چیزیں ایک طرف رکھ دیتے۔ مبادا بچے دکھی

ہوں، اور جب رات کو سب سو جاتے تو پھر اپنا کام شروع کر دیتے۔

"بابا......! آپ یہ ساری چیزیں کب بنا لیتے ہیں؟" منا حیرت سے پوچھتا تو وہ اسے گدگداتے ہوئے کہتے "رات کو ایک فرشتہ سرہانے رکھ جاتا ہے۔"

منے کے سوالوں کا سلسلہ جاری رہتا اور وہ ہنستے ہنساتے جواب دیتے رہتے۔ پھر ایک دن یہ ہنستا کھیلتا شاندار آدمی منوں مٹی تلے جا سویا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ابا کے پیچھے سے جھانکتا یہ دبلا پتلا، نحیف و نزار سا وجود اماں کا تھا۔ جواد کی پیدائش کے بعد سے ہی اماں بیمار رہنے لگی تھیں پھر منا اور بے بی بھی آ گئے۔ جڑواں بچوں کی پیدائش نے انہیں اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ یوں چھوٹی عمر میں ہی اس نے گھر کے کام کاج سنبھال لیے تھے۔ نغمی بھی اسکول سے آ کر اس کی تھوڑی بہت مدد کرتی تھی۔ اماں بیمار رہتی تھیں۔ اسی لیے اس نے مڈل کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اماں اسے کام کرتے دیکھ کر کڑھتی تھیں۔

"ہائے شگو۔ تو برتن نہ دھو تیرے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔ میں ابھی دھو دوں گی۔"

"یہ اتنے ڈھیر سارے کپڑے تو کیسے دھوئے گی چندا؟"

وہ گرتی پڑتی اٹھتیں تو وہ زبردستی انہیں لٹا دیتی ان کی محبت سے اس کا دل سرشار ہو جاتا۔ اماں کا وجود اس گھر کے لیے کتنی بڑی نعمت تھا۔ وہ بیمار رہتے ہوئے بھی سارے گھر پر چھائی ہوئی تھیں۔

"اف۔" اس کے اندر ایک آہ اٹھی اور اندر ہی کہیں دم توڑ گئی۔

اماں کے پاس ہی تو نغمی بھی جھانک رہی تھی۔ نغمی اس سے دو برس چھوٹی تھی۔ دونوں نے بے بی اور منے کو بانٹ لیا تھا۔ منا اس کا تھا، بے بی نغمی کی تھی۔ سجاد اس کا تھا اور جواد نغمی کا۔ وہ منے اور سجاد کے سارے کام کرتی تھی، اور نغمی بے بی اور جواد کے۔ نغمی کی طبیعت میں کتنی شوخی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد وہ شرارت سے چڑایا کرتی تھی۔ "میری بے بی تو بہت پیاری ہے۔ اور آپ کا منا، چھی گندا۔"

وہ ہر وقت بے بی کو سنوارے سجائے رکھتی تھی۔

اور یہ نغمی کے سنگ سنگ کون کھڑا تھا، ارے یہ سجاد ہی تو تھا۔ کتنا پیارا تھا اسے وہ، اور وہ بھی تو اس پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ اکثر اس کی حمایت میں نغمی کو چھیڑا کرتا تھا۔

''میں جب انجینئر بن جاؤں گا تو میں اور بڑی آپا ایک شاندار بنگلے میں رہیں گے اور چھوٹی آپا تم، بس کسی اچھے سے بھنگی کو دیکھ کر اس سے تمہاری شادی کر دیں گے۔'' وہ اسے مارنے کو دوڑتی تو وہ شگفتہ کے گلے میں بانہیں ڈالے اس کے پیچھے چھپ جاتا۔'' ہائے بڑی آپا مجھے اس چڑیل سی بہن سے بچاؤ۔''

اور ان سب سے پرے، چپ چاپ سر جھکائے یہ کون کھڑا تھا، سب سے الگ تھلگ۔ ارے یہ تو عافو تھا۔ اس کے دل کے جزیرے پر قدم رکھنے والا پہلا اور آخری شخص جسے اس نے خود لوٹا دیا تھا۔

عارف اس کی خالہ کا بیٹا تھا۔ خالہ کے مرنے کے بعد جب خالو نے دوسری شادی کر لی تو اماں اسے ساتھ لے آئی تھیں۔ وہ ان سب سے بڑا تھا بچپن میں وہ ان کے ننھے منے جھگڑوں کے فیصلے کرتا اور انہیں مزے مزے کی کہانیاں سناتا۔ ابا کہتے تھے وہ ان کا اپنا بیٹا ہے انہوں نے کبھی اس میں اور دوسرے بچوں میں کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ اور عارف نے بھی تو بیٹوں سے بڑھ کر ان کی خدمت کی تھی۔ جب انہیں فالج ہوا تھا تو وہ خود ہی انہیں اٹھاتا بٹھاتا۔ ان کے کپڑے بدلتا، نہیں باتھ روم میں لے جاتا، ابا کو اس پر کتنا فخر تھا۔ جب فالج کے بعد قبل از وقت ہی وہ پنشن لے کر گھر بیٹھ گئے تو عارف نے خود ہی کچھ ٹیوشن کر لیے اور فری لانسر کی حیثیت سے کئی اخباروں اور رسالوں میں لکھنے لگا۔

وہ جرنلزم میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ جب چپکے سے وہ اپنی ٹیوشن کے پیسے لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اور وہ جا کر ابا کو دے آتی، تو ابا کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ عافو نے ہی تو اسے گھر پر پڑھا کر پرائیویٹ طور پر میٹرک اور ایف اے کا امتحان دلوایا تھا۔ جب ابا زیادہ بیمار ہوئے تو انہوں نے دونوں کی منگنی کا اعلان کر دیا ان دنوں عارف کے مزاج میں کتنی شوخی آ گئی تھی۔ وہ آتے جاتے اس پر فقرے اچھالتا رہتا۔ پھر ابا نے ان سب کا ہاتھ عارف کے ہاتھ میں دبا کر مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہمیشہ کے لیے۔ تب ان کی بند آنکھوں کو چومتے ہوئے عارف نے اپنا عہد دہرایا تھا۔ کہ وہ ان سب کو کبھی بے سہارا نہ رہنے دے گا۔ اسی لیے تو جب اسے اعلا تعلیم کے لیے یونیسکو کی طرف اسکالرشپ ملا تو اس نے سوچا کہ وہ اسکالرشپ لینے سے انکار کر دے اور یہیں کسی اخبار میں چھوٹی موٹی نوکری کر لے، لیکن اماں نے اور اس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ یہ اسکالرشپ نہ ٹھکرائے۔ اماں کا خیال تھا کہ چند سال

اوکھے سوکھے گزر ہی جائیں گے۔ لیکن اگر اس کا مستقبل سنور گیا تو شاید باقی سب کے بھی سنور جائیں اور وہ چلا گیا۔ لیکن جرمنی جا کر بھی وہ اپنے اسکالرشپ سے پیسے بچا کر انہیں بھیجتا رہتا تھا۔

عافو کے بالکل پیچھے کھڑے جواد، منا اور بے بی بھی اسے شکوے بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔'' ہمارا تم سے کوئی رشتہ نہیں بڑی آپا۔ کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے۔''

اس نے اپنی سسکی ہونٹوں تلے دبالی۔

''آئی ایم رئیلی ویری ساری مسز حمید۔ مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کا کوئی عزیز نہیں ہے۔''

''ہاں۔ میرا کوئی نہیں۔'' لفظ اس کے ہونٹوں پر آ کر کانپ گئے اور یوں لگا جیسے ماضی سے اس کا ہر تعلق ٹوٹ گیا ہے اور وہ ماضی کی دیوار کے اس پار بالکل تنہا کھڑی رہ گئی ہے۔ لیکن وہ ملگجے شکن آلود کپڑوں والی سادہ دل لڑکی ماضی کی اس دیوار کے اس پار سے بار بار دستک دینے لگی۔ اسے یاد آیا ابا کے مرنے کے بعد وہ مہینوں روتی رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے سسک پڑتی اور عارف کو تو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں جل تھل ہو اٹھتیں۔ اور اس کا دل چاہتا کہ اس کے فراخ سینے سے لگ کر بہت سارے آنسو بہا ڈالے، لیکن وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی اور اپنے آنسو عارف سے چھپانے کی کوشش کرتی لیکن عارف دیکھ لیتا۔

''تو پھر رو رہی ہے شگی۔'' وہ شکوہ کرتا۔

''کیا کروں عافو! میرا دل گھبراتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ڈر سا لگتا رہتا ہے۔ ابا کے جانے کے بعد اس گھر میں کتنی بے رونقی ہو گئی ہے ابا ہوتے تو کیسے سارے گھر میں ہنسی کے پھول بکھراتے رہتے تھے۔ چار پائی پر پڑا ان کا وجود کتنا قیمتی تھا عافو۔ سجو اور جواد کو کیسی چپ لگ گئی ہے۔ منا، بے بی اور نغمی کیسے سہمے سہمے سے رہنے لگے ہیں۔''

اور عارف اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنے نرم نرم میٹھے میٹھے لہجے میں اسے سمجھاتا۔'' بہت سی باتیں اپنے بس میں نہیں ہوتیں شگو۔ ان کا دکھ، ان کا کرب، اپنی جگہ پر لیکن تم نے اگر یوں حوصلہ ہار دیا تو ان سب کا کیا ہوگا۔ یہ پھول تو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائیں گے۔ تجھے تو ان سب کے آنسو پونچھنے ہیں۔ انہیں تسلیاں دینی ہیں۔ تو اپنے دل کو مضبوط کر۔ لے شگو۔''

مگر وہ اپنے دل کو کیسے مضبوط کرتی؟ وہ تو ذرا سی آہٹ پر سہم جاتی تھی۔ ذرا دیر کے لیے بجلی چلی جاتی تو اماں سے لپٹ کر بیٹھ جاتی تھی، اور اس کی رنگت زرد پڑ جاتی۔ وہ اپنی گلی میں جاتے ہوئے بھی خوف کھاتی تھی۔ جن دنوں وہ میٹرک اور ایف اے کا امتحان دینے امتحانی سنٹر جاتی تو سہمی ہوئی ہرنی کی طرح عارف کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی۔ قریب سے کوئی لڑکا ہنستا یا سیٹی بجاتا ہوا گزر جاتا تو ڈر کر عارف کا بازو تھام لیتی۔ عارف نے کئی بار سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا یوں کیوں کر گزر ہو گی شگو۔ اب تم اس گھر کی سربراہ ہو۔ تمہیں تو سب کے دکھ درد بانٹنا ہیں۔''

اور اب اسے اسکالرشپ ملا تھا تو اسنے کہا تھا۔

''اگر میں چلا گیا شگو تو سب کا کیا ہوگا؟ تم اتنی بزدل سی ڈرپورک سی لڑکی ان سب کی ذمے داری کیونکر نبھا سکو گی؟ نہیں شگو میں نہیں جاؤں گا۔''

اور تب وہ ایک دم بہادر بن گئی اس کے مستقبل کی خاطر وہ جو اسے بہت عزیز بہت پیارا تھا۔

''نہیں عافو! تم چلے جاؤ تمہارا مستقبل سنور گیا تو پھر سجو بھی انجینئر بن جائے گا۔ نغمی بھی ڈاکٹر بن سکے گی۔''

اور وہ چلا گیا۔ ابا کے ساتھ ہی ان کی پنشن کا آسرا بھی ختم ہو گیا تھا۔ اماں نے اپنے نحیف و نزار وجود کے ساتھ سلائی شروع کر دی تھی۔ عارف بھی کچھ نہ کچھ بچا کر بھیجتا۔ اتنے سارے لوگوں کا پیٹ تو بھر جاتا مگر کئی دوسری سہولتوں سے وہ محروم ہو گئے تھے۔ سجاد کے جوتے پھٹ چکے تھے۔ نغمی کے پاس کوئی چادر نہ تھی۔ وہ یونہی دوپٹہ اوڑھ کر اسکول جاتی۔ بے بی کے پاس، کوئی ڈھنگ کی فراک نہ تھی۔ منا اور بے بی انگلش اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے یونیفارم پرانے ہو چکے تھے۔ پھر وہاں کے اخراجات، اماں نے کئی بار چاہا کہ انہیں کسی دوسرے اردو میڈیم اسکول میں داخل کروا دے مگر اس کا دل نہ مانا۔

ابا نے بڑے چاؤ سے انہیں داخل کرایا تھا۔ اور جب منا اپنی توتلی زبان میں ''بابا بلیک شیپ اور ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار'' سناتا تھا تو ابا کتنے خوش ہوتے تھے۔ تب اس نے اپنا سارا ڈر، سارا خوف اور سارا وسوسہ دل کے ایک گوشے میں چھپایا اور اندر ہی اندر سکڑتی، سمٹتی ہوئی گھر سے نکل آئی اور اخبار میں ایک ریسپشنسٹ کلرک کی جگہ خالی دیکھ کر اس نے درخواست

دی اور انٹرویو میں کامیاب بھی ہو گئی۔ حالانکہ وہ تو سوچ رہی تھی کہ نوکری کی خاطر نہ جانے اسے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ جب اس نے گھر میں سب کو بتایا تو سب کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے احساسات بھی بڑے عجیب ہو رہے تھے۔

''تو نوکری کرلے گی۔ شگو؟'' اماں کی آنکھیں خودرنگ ہو گئیں۔ ''مگر کیسے؟''

''کرلوں گی اماں۔'' وہ زبردستی ہنس دی تھی اور سجاد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''کاش میں آپ سے بڑا ہوتا بڑی آپا، تو آپ کو کبھی نوکری نہ کرنے دیتا اور اب بھی اگر آپ نوکری چھوڑ دیں تو میں اسٹیشن پر قلی بھرتی ہو جاتا ہوں۔''

''پگلے۔'' اس نے بارہ سالہ سجاد کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''تو پڑھے گا۔ انجینئر بنے گا۔ بس اور کچھ مت سوچنا سمجھے۔''

وہاں اس کے سارے کولیگز اچھے اور ہمدرد تھے۔ کچھ دن تو وہ ڈری ڈری سی رہی، پھر ہولے ہولے عادی ہوتی گئی۔ باہر کتنی روشنیاں تھیں۔ آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی، جگمگ جگمگ کرتی روشنیاں، لوگوں کے پاس کتنی آسائشیں تھیں۔ کاریں، کوٹھیاں، فریج، ٹی وی اور اس کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ وہ جو بڑی مطمئن رہا کرتی تھی، اب بے سکون رہنے لگی۔ اس کے دل میں نت نئی خواہشیں جنم لینے لگیں۔ کار، کوٹھی اور بہت سی ایسی چیزوں کی جو اس کی دسترس سے باہر تھیں، پھر اس کی ساتھی کلرک زیبا احمد جو طرح طرح کے لباس پہن کر آتی تھی۔ اسے احساس دلاتی رہتی کہ اس کی پیدائش غلط جگہ ہوئی ہے۔ اسے تو کسی بڑے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اور یہ احساس سلو پوائزن کی طرح ہولے ہولے اس کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ سچ مچ ایک ایسی حسین تصور ہے جسے کسی نہایت بوسیدہ اور بھدے فریم میں لگا دیا گیا ہو اور اگر اسے اس بوسیدہ فریم سے نکال کر کسی قیمتی فریم میں لگا دیا جائے تو یقیناً اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ اس طرح وہ بزدل سی سہمی سہمی لڑکی ایک نئی جون بدلنے لگی۔ جیسے وہ موم کی بنی ہوئی تھی اور موم کی مورتیاں جب ایک خاص درجہ حرارت سے باہر نکلتی ہیں۔ تو پگھلنے لگتی ہیں۔ باہر روشنیاں تھیں۔ اتنی تیز اور چبھتی ہوئی کہ ان کی حدت سے ہولے ہولے اس کے نقوش مٹنے لگے۔ پھر ایک دن وہ ساری کی ساری پگھل گئی۔

پہلی بار سیٹھ حمید نے اس کے قریب آ کر مسٹر لاکھانی کو اپنی آمد سے مطلع کرنے کے لیے کہا تھا تو اس نے سیٹھ حمید کی پرشوق نظروں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ نہ جانے ان

میں کتنے لوگ اسے یونہی پرشوق نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیکن دوسری بار سیٹھ حمید جب مسٹر لاکھانی سے ملنے آئے تو وہ اس کے لیے ایک ہیرے کی انگوٹھی بھی لائے تھے۔

''آپ کے حسن کی نذر، یہ حقیر سا نذرانہ۔''

اور حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ زبان گنگ ہوگئی تھی۔ تیسری بار سیٹھ نے اسے اور زیبا احمد کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی تھی اور وہ اس کی ہزاروں گز پر پھیلی ہوئی وسیع کوٹھی کو اس کے بیڈروم کو جس کی فضا بڑی خوابناک تھی اس کے ڈرائنگ روم کو جو فارن سامان سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اور دبیز قیمتی قالینوں کو جن میں پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر وہ سب کچھ اس کی آنکھوں میں بس گیا تھا۔ اور ان ساری چیزوں کو اپنانے کی خواہش بڑی شدت سے اس کے دل میں پیدا ہو گئی۔ کاش یہ سب کچھ میرا ہوتا۔ میرا اپنا، سیٹھ حمید اسے آئے دن قیمتی تحفے دینے لگے۔ مگر یہ تحفے پا کر اس کے اندر تشنگی بڑھتی گئی۔ وہ خواہشوں کی ایسی منزل پر تھی کہ سب کچھ ایک ہی جست میں حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو جب سیٹھ حمید نے اسے پروپوز کیا تو وہ انکار نہ کر سکی، حالانکہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑا تھا۔ اور اس کی اپنی مرحوم بیوی سے شگو کی ہم عمر دو بیٹیاں بھی تھیں، جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ انتہائی بھدا اور بے ڈھنگا سا تھا۔ سیاہ رنگ، بڑھی ہوئی توند، ناٹا قد، کثرت شراب نوشی سے آنکھوں کے نیچے کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ پھر بھی سیٹھ حمید اسے وہ پارس نظر آیا جس کے...... چھونے سے ہر چیز سونا بن جاتی ہے اور وہ ہر قیمت پر اس پارس کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔

اماں نے سنا تو مارے دکھ کے کچھ نہ کہہ سکیں۔ بہت دیر تک یونہی خالی خالی نظروں سے اسے تکتی رہی۔ جیسے انہیں اپنی سماعت پر اعتبار نہ ہو ہو۔ ''نہیں شگو۔ تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں اماں۔''

''تجھے شاید یاد نہیں تیرے باپ نے مرنے سے پہلے تیرا ہاتھ عارف کے ہاتھ میں دیا تھا۔''

''ارے اماں!'' وہ ہنس دی۔ ''میں جانتی ہوں ابا نے اس لیے میرا ہاتھ عارف کے ہاتھ میں دیا تھا کہ میرے ناتے سے وہ آپ سب کا سہارا بن جائے اگر سیٹھ حمید ابا کے سامنے مجھے مانگتے تو ابا خوش ہو کر ہاں کر دیتے۔ اماں آپ فکر نہ کریں میں نے سیٹھ حمید سے

بات کر لی ہے۔ وہ تم سب کی کفالت کرنے کو تیار ہے۔ یوں بھی وہ بہت اچھا ہے۔ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ اسے پروا تک نہیں ہوتی کہ اس کا روپیہ کہاں خرچ ہو رہا ہے۔''

''یہ تو کیا کہہ رہی ہے شگو۔ تو۔ تو۔'' اماں کی آواز حلق میں میں پھنس گئی تھی۔ پھر سب ہی نے اسے سمجھایا تھا نغمی نے سجاد نے، حتیٰ کہ ننھے سے جواد نے بھی، مگر اس کی آنکھوں کے سامنے تو روشنیاں کوند رہی تھیں۔ سو وہ اس سہمی سہمی سی لڑکی کو گھر کی چوکھٹ کے اندر ہی چھوڑ کر خود اس گھر کی دہلیز پار کر کے سیٹھ حمید کی محل نما کوٹھی میں آ گئی تھی۔ وہ محل نما کوٹھی جس کے برآمدوں میں، سیڑھیوں پر، اور کمروں میں ہر جگہ دبیز قالین تھے۔ جہاں بیڈروم کی فضا بڑی خواب ناک تھی۔ اور جہاں لان میں دیسی بدیسی خوشبوؤں والے رنگ برنگے پھول تھے۔ اور چاروں طرف روشنیاں تھیں۔ جگمگ کرتی۔ سورج کو شرماتی ہوئی۔ اسے تو ہمیشہ سے اندھیروں سے ڈر لگتا رہا تھا نا۔ اس لیے وہ بہت دنوں تک ان روشنیوں سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

اس کے اردگرد خوشیاں تھیں۔ پارٹیاں، ڈنر، بوفے شور، ہنگامے، زندگی میں کتنا بہت سا گلیمر پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ہولے ہولے اس کے اندر اندھیرا اترنے لگا۔ جوں جوں باہر کی روشنیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اندر کی روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔ بیڈروم کے خوابناک ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ سیٹھ حمید کی بوڑھی رفاقت زہر لگنے لگی۔ لیکن اب تو واپس جانے کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اس نے تو اپنی کشتیاں خود اپنے ہاتھوں سے جلا ڈالی تھیں۔ اور اب اجنبی ساحلوں پر حیران وہ پریشان کھڑی تھی جانے کس امید پر، شاید کوئی جہاز بھولے بھٹکے ان اجنبی ساحلوں پر آ جائے اور اسے ان زمینوں کی طرف واپس لے جائے جنہیں وہ چھوڑ آئی تھی۔ مگر یہ انتظار کتنا بے فائدہ اور بیکار تھا۔ پھر وہ تو خود ہی اپنی مرضی اپنی خواہش سے اپنی زمین چھوڑ آئی تھی۔ تاکہ وہ پارس حاصل کر سکے، جسے چھوتے ہی ہر چیز سونا بن جاتی ہے۔ اور اب جبکہ اس نے وہ پارس حاصل کر لیا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف سونے کے ڈھیر لگے تھے۔ تو یہ کیسا پچھتاوا تھا۔ جو رہ رہ کر اس کی روح میں ڈنک مارتا رہتا تھا۔ اس لالچی شہزادی کی طرح جس نے اسی کی مانند پارس حاصل کر لیا تھا۔ اور پھر اس کے پارس نے اس کے ماں باپ بہن بھائیوں سبھی کو سونے کے مجسموں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور وہ تنہا رہ گئی تھی۔ سجو، جواد، نغمی، ۔ ربی، منا، ماں سبھی اس کے لیے، اپنے جیتے جاگتے وجود ختم کر کے بے

حس، بے جان مجسمے بن گئے تھے، اور یہ سارا قصور کس کا تھا؟ اس کا اس کا اپنا۔

''تم نے بتایا نہیں عارف کہ تم پڑھائی کے بعد بھی اتنے سارے سال وہاں جرمنی میں کیا کرتے رہے؟'' جامی کی بات پر چونک کر وہ سیدھی ہو گئی۔

''میں'' عارف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں نے وہاں سروس کر لی تھی۔ اس لیے کہ میرے سامنے چھوٹے بہن بھائیوں کا مستقبل تھا۔ اور جب کہ میرے کندھوں کا بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا ہے تو میں آ گیا ہوں۔ نغمی ڈاکٹر بن گئی ہے، اور سجو کا انجینئرنگ میں یہ آخری سال ہے۔''

سفید کوٹ پہنے گلے میں اسٹیتھسکوپ لگائے نغمی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ عہد تو اس نے کیا تھا۔ کئی بار نغمی کو گلے سے لگا کے اس نے کہا تھا۔ ''نغمو! تو ذرا فکر نہ کر، میں تجھے ضرور ڈاکٹر بناؤں گی۔''

اس نے متشکر نظروں سے عارف کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ نگاہیں جھکائے میز کی سطح پر جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔

''آج کل تم کیا کر رہے ہو؟'' جامی نے پوچھا۔

''یہاں پاکستان میں ہی مجھے بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔''

''او۔ ونڈرفل، خوش قسمت ہو یار۔'' جامی نے بڑے جوش سے اسے مبارک باد دی۔ ''نوکری بھی کر لی اور کندھوں کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا تو اب شادی کب کر رہے ہو؟''

''بہت جلد۔'' اس نے سلگتی ہوئی نظروں سے شگفتہ کی طرف دیکھا۔ ''بلکہ کل شام میرا نکاح ہے۔ رخصتی ایک ماہ بعد ہو گی۔''

''یعنی ......کل نکاح ہے اور تم نے ابھی تک ذکر بھی نہیں کیا تھا اگر میں نہ پوچھتا تو تم۔ بہت بدل گئے ہو یار۔'' جامی نے شکوہ کیا۔

''ہاں، شاید بدل گیا ہوں۔''

''تم بدلے ہو تو بدلتے رہو۔ ہم تو جھاڑ کے کانٹے ہیں۔ بن بلائے ہی پہنچ جائیں گے۔ اب جلدی سے اپنے گھر کا حدود اربعہ بتا دو۔''

''اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو، دعوتی کارڈ پر پتا موجود ہو گا۔'' ہلکی سی مسکراہٹ عارف کے لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔

''ہائے داوے، تمہاری شادی اسی لڑکی سے ہو رہی ہے۔ جس کے گن تم گایا کرتے تھے۔ اور جس کی محبت کے احترام میں تم نے ساری نعمتیں اپنے اوپر حرام کر رکھی تھیں۔''

''نہیں، اس کی بہن سے۔ وہ تو مر گئی۔''

''مر گئی؟''

شگفتہ کو دھچکا سا لگا۔ اور وہ بیٹھے بیٹھے ساکت ہو گئی کوئی چیز اس کے اندر کرچی کرچی ہونے لگی۔

''سوری عارف! مجھے بہت افسوس ہوا بے حد۔ کیا ہوا تھا اسے؟'' جامی نے دکھ سے پوچھا۔

''اسے روشنیوں نے ڈس لیا تھا۔'' عارف کا چہرہ۔ سپاٹ تھا۔ لیکن آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔ جیسے سیاہ پانی سے بھرے بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا ہو۔

جامی نے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے عارف کے حواس پر شک ہو، عارف ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے تم جا رہے ہو۔ ٹھہرو۔ ابھی تو ہم نے ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر کسی اکیلے گوشے میں جا کر بیٹھتے ہیں اور میں تم سے اپنی ٹینا، شہلا، لیلیٰ، سب کے بارے میں پوچھوں گا۔'' جامی نے حیرت سے کہا۔ لیکن وہ جانے کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔

اس نے جاتے ہوئے عارف کو دیکھا۔ اور وہ سہمی سہمی سی بزدل لڑکی، جو راہ چلتے ہوئے آدمیوں کو دیکھ کر عارف کا بازو تھام لیتی تھی۔ اب اتنے بڑے ہجوم میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان تنہا کھڑی تھی۔

''عافو......عافو......'' لیکن آنسوؤں نے اس کی آواز کو پھر ڈبو دیا۔

''یار عجیب آدمی ہو رکو تو۔''

''پھر ملیں گے یار۔'' عارف نے مڑ کر جامی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل گیا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عافو! خدا کے لیے مجھے یوں تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے

اپنی پناہ میں لے لو عافو۔" اس کے ہونٹ کھلے پھر بند ہوئے۔ بے شمار لفظ اس کے اندر ہی کہیں گونج کر رہ گئے۔ مر گئے۔

عارف شاید اب سڑک پر پہنچ گیا ہوگا۔ اور وہاں سے کسی ٹیکسی پر بیٹھ کر اس کی آواز سے، اس کی پہنچ سے دور چلا جائے گا۔ اچانک اس کے اندر کا اندھیرا گہرا ہونے لگا وہ جو برسوں سے اس کے اندر شام کا ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ رات کے گہرے سیاہ اندھیرے میں بدل گیا۔ گھور اندھیرا جیسے چاند کی آخری تاریخوں میں کسی رات اچانک بجلی چلی گئی ہو، اور ہر طرف گہرا سیاہ اندھیرا ہو۔ وہ خوف سے زرد پڑنے لگی۔ اسے اندھیرے سے خوف آتا تھا اور وہ اندھیرے سے ڈر کر اماں سے لپٹ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور کرسی پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے گھٹنوں پر چہرا رکھ کر منہ چھپا لیا اور چلائی۔

"اماں...... اماں۔ تم کہاں ہو؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اف یہاں کتنا اندھیرا ہے۔ اماں۔ اماں۔" وہ زور سے چیخی۔ "بہت اندھیرا ہے۔"

جامی حیران ہو کر سوچنے لگا۔ یہ اچانک مسز حمید کو کیا ہو گیا ہے؟" ابھی تو یہ اچھی بھلی تھیں۔ لوگ اپنی جگہوں سے اٹھ اٹھ کر اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ سب جامی سے پوچھ رہے تھے کہ مسز حمید کو کیا ہو گیا ہے۔ لیکن خود جامی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کے کندھے چھوئے۔

"مسز حمید!"

اس نے سر اٹھا کر جامی کو دیکھا اور چیخ کر جامی سے لپٹ گئی۔ "خدا کے لیے روشنی کرو۔ مجھے اندھیرے سے خوف آتا ہے۔"

لوگوں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"شاید ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔" کسی نے تاسف سے کہا۔

باہر روشنیاں تھیں۔ جگمگ جگمگ کرتی، سورج کو شرماتی ہوئی اور اس کے اندر اندھیرا تھا۔ گہرا سیاہ اندھیرا دم بدم بڑھتا ہوا۔

❁............❁
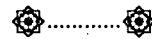
ڈیکوریشن پیس

"مرد کی محبت کیا شے ہوتی ہے۔"

رافعہ سید نے زور زور سے پاؤں ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"مرد کی محبت!"

نائلہ احمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوبصورت شے ہوتی ہے، یوں جیسے چلچلاتی دھوپ میں ٹھنڈے سایہ دار درخت کی چھاؤں۔"

اور رافعہ کو یوں لگا جیسے وہ برسوں سے چلچلاتی دھوپ میں چل رہی ہو۔ "مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو رافی ڈیئر، جبکہ تمہاری شادی کو بھی دو برس بیت گئے ہیں۔"

رافعہ نے سوچا۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کی زندگی میں مرد تو آیا تھا لیکن محبت نہیں آئی تھی۔ شادی کر لینا، دو تین بچوں کی ماں بن جانا اور بات ہے محبت کرنا اور بات۔ اور محبت تو اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ نہ شادی سے پہلے نہ شادی کے بعد وہ تو بچپن سے ہی ننگے پاؤں چلچلاتی دھوپ میں کھڑی تھی اور کوئی شجر سایہ دار نہیں ملا تھا۔

"لوگ شادیاں بھی کر لیتے ہیں زندگیاں بھی گزر لیتے ہیں۔ لیکن انہیں محبت نہیں ملتی۔ وہ محبت نہیں کر پاتے۔"

انعم حیدر نے فلسفہ بگھارا۔

"ہاں، تم صحیح کہتی ہو انعم۔"

رافعہ نے آہستگی سے کہا۔

''لوگ شادیاں بھی کر لیتے ہیں زندگیاں بھی گزار لیتے ہیں۔لیکن انہیں محبت نہیں ملتی۔وہ محبت نہیں کر پاتے۔

''رافو تم۔یہ آج تم اتنی ڈیپریس کیوں ہو رہی ہو۔کیا بات ہے کیا معین صاحب نے کچھ کہا؟''

نائلہ نے غور سے اس کے تھکے تھکے مضمحل چہرے کو دیکھا۔

''کچھ نہیں۔''

وہ کھڑی ہوگئی۔

بھلا معین صاحب نے کیا کہنا ہے اوران کے پاس کچھ کہنے کے لیے وقت ہی کہاں ہے؟

''ارے تم کھڑی ہوگئی ہو، بیٹھو نا ابھی تو آئی ہو۔''

''نہیں اب چلتی ہوں پھر آؤں گی۔''

نائلہ اور انعم دونوں چچا زاد بہنیں تھیں اور کالج میں اس کی دوستی ان سے ہوئی تھی۔ اور اب بھی جب کبھی اس کا دل گھبراتا وہ ان سے ملنے چلی آتی۔ان سے باتیں کر کے ان سے مل کر دل کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا تھا۔لیکن آج پتا نہیں کیوں یہاں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔

''رافو! تم کچھ اپ سیٹ ہو۔اینی پرابلم۔''

انعم نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

''نو، کچھ نہیں۔''

وہ زبردستی ہنسی۔

''یہ حقیقت ہے رافی کہ معین الدین تمہارے قابل نہ تھے۔''

نائلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو۔تم خوش نہیں ہو رافی۔''

''ناخوشی کیسی؟''

اس نے نگاہیں چرالیں۔

''اچھا خدا حافظ۔''

''خدا حافظ!''

دونوں باہر تک اسے چھوڑنے آئیں۔ڈرائیور نے اسے آتے دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور جب وہ اپنے بڑے سے گھر کے پورچ میں اتری تو اس کا سانس رکنے لگا۔جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔جیسے کسی نے اس کے چاروں اور آکسیجن بند کر دی ہو۔اس نے بے چینی سے اپنے گلے کو مسلا اور منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لیے۔

''کیا ہوا جی۔''

چوکیدار نے اسے گیٹ کا سہارا لیے کھڑے دیکھا تو اس کی طرف لپکا۔

ڈرائیور نے بھی اسے گلا مسلتے دیکھ لیا تھا۔وہ گاڑی لاک کر کے ادھر ہی آ گیا تھا۔

''آپ کی طبیعت خراب ہے جی، ڈاکٹر کی طرف لے چلوں''

نہیں۔''

اس نے مڑ کران دونوں کی طرف دیکھا۔اور تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی اور پھر بے دم سی ہو کر اپنے بیڈ پر گر پڑی۔اس کا دل چاہا وہ خوب چیخ چیخ کر روئے زور زور سے، اتنے زور سے کہ اس بڑے شاندار گھر کی دیواریں ہل جائیں ڈھے جائیں۔سب کچھ ملبے کا ڈھیر بن جائے اور وہ خود ہی اس ملبے میں دب کر رہ جائے۔وہ بے چینی سے تکیے پر سر پٹخنے لگی۔اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے بیڈروم کی چاروں دیواریں ہولے ہولے اس کی طرف بڑھ رہی ہوں۔اور لمحوں میں اسے اپنے شکنجے میں کس لیں گی اور وہ ان کے درمیان پس جائے گی۔

''اوہ میرے خدا، رانی منجو، بابا۔''

وہ خوف سے چیخی۔

''بیگم صاحبہ جی! کیا ہوا؟''

''رانی نے آ کر اس کا سر سہلایا۔اور پلٹ کر بوڑھے ملازم سے کہا۔

''بابا، بابا جلدی کرو، ڈاکٹر صاحب کو فون کرو۔''

ملازم دروازے سے ہی پلٹ گیا۔

''کیا ہوا جی۔''

رانی نے اس کی بند مٹھوا ،کو کھولنا چاہا۔

"میرا دم گھٹ رہا ہے رانی، سارے دروازے ساری کھڑکیاں کھول دو۔"

"اللہ خیر!"

رانی نے جلدی سے پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آئے تو وہ ذرا سنبھلی۔

"رانی!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پانی پلاؤ مجھے خوب ٹھنڈا یخ۔"

"جی۔"

وہ دوڑتی ہوئی چلی گئی اور جب پانی لے کر آئی تو اس کی حالت پھر پہلے جیسی ہو گئی اور وہ بار بار اپنا سر تکیے پر پٹخ رہی تھی۔

"کیا ہوا جی آپ کو، درد ہے کہیں۔"

رانی نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے مجھے۔"

اس نے رانی کی طرف دیکھا۔

"میرے اندر آگ لگی ہے۔ میرے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ میرا سر تپ رہا ہے۔ جیسے کوئی بھر بھر انگاروں کے تھال میرے اوپر انڈیل رہا ہو۔ میں جل رہی ہوں۔ رانی۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بیگم صاحبہ جی، یہ پانی لیں۔"

رانی نے گھبرا کر گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"ارے کوئی سایہ کوئی چھاؤں۔"

وہ چیخنے لگی۔

"میں جل رہی ہوں۔ آگ لگی ہے مجھے۔"

اس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن رانی نے پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔

"بیگم صاحبہ کو شدید بخار ہو گیا ہے۔"

اس نے منجو کو بتایا جو شور سن کر ادھر ہی آ گئی تھی۔

"نہیں، نہیں، ظالمو بخار نہیں ہوا۔ میں تو بس ننگی دھوپ میں کھڑی ہوں۔ پاؤں

کے نیچے تپتی ریت ہے اور سر پر جلتا سورج۔ ارے میرے پاؤں تو کوئی دیکھو کتنے آبلے پڑ گئے ہیں۔ اور میرا سر۔ میرے مولا۔ کیا میرے نام کا کوئی بادل نہیں۔"

وہ پھر دھاڑیں مار مار رونے لگی۔

رانی اور منجو حیران پریشان اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"بخار سر کی طرف چڑھ گیا ہے۔"

منجو نے سرگوشی کی۔

"صاحب کو فون کر دیں؟"

"کر ہی دیں مجھے تو حالت خراب ہی لگتی ہے۔"

منجو نے مشورہ دیا تو رانی باہر چلی گئی۔

ڈاکٹر خالد سیٹھ معین الدین کے فیملی ڈاکٹر ہی نہ تھے دوست بھی تھے۔ سو فون ملتے ہی چلے آئے۔

"کیا ہوا ہے بھئی۔"

انہوں نے منجو سے پوچھا جو اس کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

"بخار سر کی طرف چڑھ گیا ہے جی۔"

منجو نے بتایا اور کھڑی ہو گئی۔ رافعہ نے جلتی ہوئی آنکھیں کھول کر ڈاکٹر خالد کو دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔

"مجھے بخار نہیں ہے ڈاکٹر...... لیکن میرے اندر آگ لگی ہے۔ میں میں جل رہی ہوں۔"

اس نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔

"میں!" اس نے اپنی بند مٹھیوں کو کھولا اور بند کیا۔

"عجیب سی تشنگی اور پیاس ہے کہ دل چاہتا ہے گھڑوں پانی پی جاؤں۔"

ڈاکٹر خالد غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ بیس سال کی ہو گی۔

اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کا اور سیٹھ معین الدین کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور سیٹھ معین الدین کا بڑا بیٹا مبشر معین الدین بھی عمر میں اس سے بڑا ہو گا۔

"میں...... میں کیا کروں ڈاکٹر! میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا اور رونے لگی۔

''حوصلہ کریں بیگم صاحبہ! آپ کو کچھ نہیں ہے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔''

انہیں نے اسے سکون آور انجکشن دیا۔

''آپ زیادہ سوچا نہ کریں۔''

''میں، میں تو کچھ نہیں سوچتی۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل گھبراتا رہتا ہے۔ ہر وقت۔''

''ٹھیک ہو جائے گا سب۔''

ڈاکٹر خالد نے اسے تسلی دی۔

''آپ لیٹ جائیں۔ جب آپ اٹھیں گی تو بالکل نارمل ہوں گی۔''

ڈاکٹر خالد نے نرمی سے کہا اور کھڑے ہو گئے۔

تب ہی معین الدین صاحب اندر داخل ہوئے۔

''خیریت ڈاکٹر۔''

''ہاں خیریت۔''

ڈاکٹر خالد انہیں ساتھ لیتے ہوئے باہر چلے آئے۔ ''معمولی ڈپریشن ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ اب سکون میں ہیں۔''

''اچھا۔''

وہ ڈاکٹر خالد کے ساتھ ہی پلٹ پڑے۔

''رانی نے تو مجھے بوکھلا دیا تھا۔ مجھے ایک ضروری میٹنگ بھی بلانی تھی۔''

''میرے خیال میں یہ ڈپریشن۔''

ڈاکٹر خالد نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔

''ان کے لیے کوئی مصروفیت ہونی چاہیے۔''

''مصروفیت۔''

معین الدین نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر خالد کی طرف دیکھا۔

''کیا ہو سکتی ہے۔ کلب کی ممبر شپ ہے ان کے پاس ایک دو تنظیموں کی رکنیت بھی ہے۔''

''کوئی بچہ۔''

''اوہ نو!'' سیٹھ معین الدین نے قہقہہ لگایا۔

''مجھے مزید بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مبشر، نجیب، سبین دو بیٹے اور ایک بیٹی ۔ ہماری فیملی بالکل مکمل ہے۔''

''مگر۔'' ڈاکٹر خالد نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اپنا بچہ بھی ہو۔ میرے خیال میں اگر ایک بچہ ہو جاتا تو۔''

''Leave it چھوڑیے، ڈاکٹر میں نے پہلے روز ہی اسے بتا دیا تھا کہ یہ شادی میں نے بچوں کے لیے نہیں کی۔ اور پھر اس کے پاس کیا نہیں ہے۔ دولت، اسٹیٹس، عزت، ایک متوسط طبقے کی لڑکی کی خواہش اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر یہ ڈپریشن میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

سیٹھ معین الدین کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں تو ڈاکٹر خالد خاموش ہو گئے۔ حالانکہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے کہیں کہ عورت کی خواہشوں کو تم جیسے آدمی جو صبح سے شام تک پیسے کے چکر میں پڑے رہتے ہو کہاں جان سکتے ہیں۔ عورت صرف پیسہ تو نہیں چاہتی۔ اور پھر ایک ایسی لڑکی جو عمر میں تمہاری بیٹی کے برابر ہو تم اس کی خواہشوں اور اس کے جذبات کو کہاں جان سکتے ہو۔''

''اچھا ڈاکٹر بائے، وہاں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''بائے۔''

ڈاکٹر خالد رک کر رانی کو ہدایت دینے لگے۔

''دیکھو، جب بیگم صاحبہ اٹھیں تو انہیں ہلکا سا مشروب دے دینا۔ اور جب تک وہ خود نہ اٹھیں انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ چاہے وہ شام تک سوتی رہیں۔''

لیکن وہ تو دو گھنٹے بھی نہیں سو سکی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ جانے کیسی بے چینی تھی، کیسا اضطراب تھا کہ سکون آور انجکشن بھی اسے نہ سلا سکا تھا۔ کمرے میں خنکی تھی۔ اے۔ سی چل رہا تھا لیکن اس کے اندر آگ لگی تھی۔ سارا وجود جل رہا تھا۔ تپ رہا تھا۔ آنکھیں، ہاتھ، بدن، پاؤں کے تلوے سب میں آگ لگی تھی۔ اس نے

اٹھ کر بیڈ روم فرج کھولا اور برف والے ٹھنڈے پانی میں تولیے بھگو بھگو کر اپنے تپتے ہوئے پاؤں، آنکھوں اور ہاتھوں پر رکھنے لگی۔ مگر جلن اور تپش تو جیسے اور بھی بڑھ گئی تھی۔

اس نے ٹھنڈے تولیے اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے گرد لپیٹے ہوئے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

زندگی نے اس کے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کیا تھا۔ ابھی اس نے دنیا میں آ کر آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ اس کے باپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کی ماں اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔

''یہ کوئی عمر ہے پہاڑ سی عمر کیسے گزرے گی۔''

جو دیکھتا ٹھنڈی آہ بھرتا۔

''ماں باپ کب تک ساتھ دیں گے بھائی کوئی ہے نہیں، ہوتا بھی تو بھلا کب بوجھ اٹھاتے ہیں۔''

سو ماں باپ نے بیوگی کے دو سال بعد اسے پھر رخصت کر دیا۔ فاروق اچھا شوہر ثابت ہوا اور وہ اپنی دو سالہ بیوگی کا سارا غم بھول گئی۔ حتیٰ کہ اپنی بچی کو بھی جسے وہ ماں کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ لیکن ماں کی موت کے بعد قسمت نے اسے پھر اس کی جھولی میں ڈال دیا۔

لیکن چھ سال کے اس عرصہ میں وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی اور آٹھ سالہ رافعہ کے لیے اس کے دل میں اتنی محبت نہ تھی جتنی دوسرے بچوں سے تھی۔ فاروق کو اس کی آمد پر کوئی اعتراض نہ ہوا اور یوں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگی۔

فاروق نے نہ کبھی اسے ڈانٹا نہ کبھی پیار جتایا یہی حال چھوٹے بہن بھائیوں کا تھا۔

بچپن سے ہی اس کے اندر ایک احساس محرومی پرورش پانے لگا تھا۔ جب فاروق اپنے بچوں سے لاڈ کرتا۔ انہیں گود میں اٹھاتا ہوا میں اچھالتا ان کے ساتھ ہنستا، کھیلتا، بولتا تو وہ دور کسی کونے میں چھپ کر چپکے چپکے اسے دیکھتی۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے سے پہلے اس نے صرف نانی کی محبت دیکھی تھی۔ وہاں اس گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا فاروق اس کے ساتھ بھی اتنا ہی پیار کرے۔ اور وہ بھی یوں ہی اس کے ساتھ لاڈ کرے۔ اس سے چمٹ جائے۔ ضد کرے۔ فاروق اس کے ساتھ کھیلے، اسے گدگدائے، ہنسائے، باتیں کرے، لیکن فاروق نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ بلکہ دھیان سے کبھی اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔

ایک بار ٹیپو، پپو کی طرح اس کے دفتر سے آنے کے بعد وہ بھی دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی لیکن فاروق نے نرمی سے اسے الگ کر دیا تھا۔ تب اس کی ترسی ہوئی نگاہیں فاروق کے چہرے پر ٹک گئی تھیں۔ مگر شاید فاروق نے ان معصوم آنکھوں کے پیچھے چھپی حسرت نہیں دیکھی تھی۔ وہ نومی کو گود میں اٹھا کر اچھالنے لگا تھا۔ اور اس کی نگاہوں میں کوئی التفات نہ پا کر مایوس لوٹ آئی تھیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی آنکھوں میں آنسو چھپائے کچن میں ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ماں نے شاید اسے فاروق کی ٹانگوں سے لپٹے اور پھر فاروق کو اسے اپنے سے الگ کرتے دیکھا تھا کہ بغیر اس کی طرف دیکھے اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

''رافو! وہ تیرا باپ نہیں ہے۔''

''وہ میرا باپ نہیں ہے۔''

اور آٹھ نو سالہ رافعہ کے دل پر جیسے گھونسا سا آ کر لگا تھا۔

''تو پھر میرا باپ کہاں ہے؟ پہلے میں نانی کے پاس کیوں رہتی تھی اب یہاں کیوں چلی آئی ہوں؟ اور یہ عورت کیا یہ بھی میری ماں نہیں ہے؟ اور ٹیپو، پپو نومی اور فرحی کیا یہ سب میرے بہن بھائی نہیں ہیں۔''

وہ اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر سکتی تھی اور اتنی چھوٹی تھی کہ اپنے سوالوں کا جواب نہیں پوچھ سکتی تھی۔ مگر اس کے ننھے سے دل میں جیسے سوراخ ہو گیا تھا۔ وہ کٹ رہا تھا۔ ٹوٹ رہا تھا۔ تب وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر بھاگ کر کچن سے باہر آ گئی تھی اور اسٹور کے مخصوص کونے میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور چپکے چپکے رونے لگی تھی اور پھر روتے روتے وہیں سو گئی تھی۔

ماں جو کچھ اسے سمجھانا چاہتی تھی شاید اس نے اسے سمجھ لیا تھا۔ کہ اب وہ فاروق کے آنے پر دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ بھاگ کر اس کے قریب نہ جاتی۔ بلکہ کواڑ کے پیچھے چھپ کر اسے بچوں کے ساتھ لاڈ کرتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جتنی دیر فاروق گھر پر رہتا وہ اس کے سامنے نہ جاتی بلکہ ادھر ادھر کونوں کھدروں میں چھپتی پھرتی۔

لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ننھے سے دل سے یہ خواہش نہیں مٹا سکی تھی کہ فاروق اس سے بھی اتنا ہی پیار کرے جتنا اس کے بہن بھائیوں سے کرتا ہے۔ یہ حسرت اس کی

آنکھوں میں منجمد ہوگئی تھی۔ اس کی ترسی ہوئی نگاہیں بار بار فاروق کی طرف اٹھتیں اور پھر مایوس لوٹ آتیں فاروق کی آنکھوں میں اس کے لیے عجیب سی سرد مہری اور بیگانگی ہوتی تھی۔ اور یہ بیگانگی یہ اجنبیت اسے انجانی سے اذیت میں بتلا کر دیتی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے پھر وہ یونہی بلاوجہ روئے چلی جاتی۔ چھپ چھپ کر اور جب تھک جاتی تو خاموشی سے آکر ماں کے پاس بیٹھ جاتی اور اسے کام کرتے دیکھتی رہتی۔

”جا رافو! تو بھی کھیل جا کر۔“

کبھی کبھی کام کرتے کرتے ماں اس کی طرف دیکھتی مگر وہ یونہی چپ بیٹھی رہتی۔

جب وہ ذرا سمجھدار ہوئی تو اس کے اندر اور بھی بے کلی اور بے چینی پیدا ہوگئی۔ جب اسکول میں سہیلیاں اپنے ابو اور بھائیوں کی باتیں تو یہ بے کلی بڑھ جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ برسوں سے پیاسی کھڑی ایک بوند پانی کو ترس رہی ہو۔ حالانکہ پانی اس کے چاروں اور اردگرد ہر طرف چھم چھم برس رہا تھا۔ لیکن اس کے نصیب میں صرف پیاس لکھی ہے۔ اس کی حسرت بھری نگاہیں اب فاروق کے ساتھ ساتھ ٹیپو اور پپو کی طرف بھی اٹھنے لگی تھیں۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہنسے بولے، ان پر رعب جمائے۔ وہ غلط کام کریں، شرارت کریں تو ان کے کان کھینچے، وہ روٹھیں، وہ منائے وہ اسے باجی کہیں، بجو کہیں، آپی یا آپو کچھ بھی کہیں مگر ان میں بھی فاروق والی سرد مہری اور بیگانگی تھی۔ اور پھر وہ انتہائی لاپرواتھے۔ دونوں کی اپنی دلچسپیاں تھیں، اپنے شوق تھے، انہوں نے تو شاید کبھی دھیان سے اسے دیکھا بھی نہ تھا کہ وہ ان کی بڑی بہن ہے اور ان کے گھر میں رہتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی وہ نومی فرحی سے لاڈ کرتے انہیں چھیڑتے، کسی کی چٹیا کھینچ لی، کسی کا منہ چڑا لیا۔ اور وہ دور بیٹھی حسرت سے انہیں دیکھتی رہتی اور آنسو خود بخود چپکے چپکے اس کے اندر گرتے رہتے۔ اور وہ ضبط کیے بیٹھی رہتی۔

سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ کتنی اکیلی اور تنہا تھی۔ وہ بھرے پڑے گھر میں رہتی تھی۔ پھر بھی اکیلی تھی۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اپنی سہیلیوں کو فخر سے بتائے کہ آج اس کے پاپا اس کے لیے یہ لائے ہیں آج اس نے ابو سے یہ فرمائش کی ہے۔ آج ٹیپو سے یوں لڑائی ہوئی۔ کیرم کھیلتے ہوئے پپو نے کتنی بے ایمانی کی۔ وہ کس طرح روٹھی پپو نے اسے کیسے منایا لیکن اس کے پاس تو کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ جب بھی کچھ کہنے کے لیے منہ

کھولتی اس کا اندر خالی خالی ہو جاتا۔ وہ تو بالکل تہی دامن تھی۔ تب وہ آنسو پی لیتی اور سہیلیوں کی باتیں سننے لگتی۔ سب ہی اسے اپنے سوا بڑے خوش اور مطمئن لگتے تھے۔ ایک بس وہی تھی جس کا کوئی نہیں تھا۔

وقت یوں ہی دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ وہ اسکول سے کالج میں پہنچ گئی۔ کالج میں بے شمار لڑکیاں اس کی دوست بن گئی تھیں۔ وہ تھی بھی تو بے انتہا خوبصورت لمحہ بھر کو تو نگاہیں اس کے چہرے پر ٹک کر رہ جاتی تھیں۔ بے تحاشا خوبصورت آنکھوں والی رافعہ ایاز کالج کی ایک مقبول اسٹوڈنٹ تھی۔ لڑکیاں اسے چاہتی تھیں۔ ٹیچرز اسے پسند کرتے تھے۔ لیکن یہ چاہتیں، یہ محبتیں اس کے اندر کی تشنگی کو ختم نہ کر سکی تھیں۔ اس کی آنکھیں اب بھی اسی حسرت سے فاروق کی طرف اٹھتی تھیں اور پھر مایوس لوٹ آتی تھیں۔

فاروق کے رویے میں روز اول والی بیگانگی تھی۔ تب اپنے کمرے میں بیٹھ کر کتابیں سامنے رکھے وہ سوچتی رہتی کہ کوئی تو ہو جو اس کی اس تشنگی کو مٹائے، کوئی تو ایسا ہو جس کی محبت ٹھنڈے سایہ دار درختوں کی چھاؤں کا احساس دلائے کون ہوگا ایسا؟ وہ خود سے ہی سوال کرتی، کیا کوئی ایسا ہو سکتا ہے۔ جو میری باتیں غور سے سنے اس کی آنکھوں میں میرے لیے، محبت کے دیے روشن ہوں۔ اور وہ مجھے اتنا چاہے، اتنا چاہے کہ عمر بھر کی تشنگی ختم ہو جائے۔ آخر اس کی اتنی بڑی دنیا میں کوئی تو ہوگا کہیں تو ہوگا جس کے پاس میرے لیے محبت ہوگی۔ بس ایک بار مجھے ٹوٹ کر ملے کوئی۔

پھر اس کے بعد بکھر جاؤں ریت کی صورت۔“ وہ ہولے ہولے گنگناتی اور اس کے اندر دور کہیں ایک چراغ جل اٹھتا امید کا چراغ اور پھر یہ چراغ اس دن اور زیادہ لو دینے لگا جب سیٹھ معین الدین نے کالج کے ایک فنکشن میں اسے دیکھ کر پروپوز کر دیا۔

”مگر اس کی عمر زیادہ ہے۔ اس کے جوان بچے ہیں۔“

اس کی ماں نے دبا دبا سا احتجاج کیا تھا۔

”وہ بے تحاشا امیر ہے۔ تمہاری بیٹی عیش کرے گی اور پھر دوسری بیوی کو تو مرد ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھتا ہے۔“

فاروق کا فیصلہ حتمی تھا۔ اس کی ماں چپ ہوگئی لیکن وہ نادم تھی اور اس سے نگاہیں چراتی تھی۔

"تیری اور اس کی عمر میں بہت فرق ہے رافو۔"

ایک روز اس نے اس کے دوپٹے پر گوٹا ٹانکتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا۔

"لیکن تیرے ابو کہتے ہیں کہ وہ تیرے لیے بہت مناسب ہے، بہت پیسہ ہے اس کے پاس تو عیش کرے گی خوش رہے گی۔"

اس نے معین الدین کو نہیں دیکھا تھا لیکن سوچا تھا کہ کیا ہوا جو اس کی عمر زیادہ ہے اور کیا ہوا جو اس کی پہلی بیوی مرچکی ہے۔ وہ اسے پسند کر کے اپنی خواہش سے اسے اپنی زندگی میں شامل کر رہا ہے تو ظاہر ہے اس کے لیے اس کے پاس ڈھیروں محبتیں ہوں گی۔

مگر اس کے خواب پہلے روز ہی بکھر گئے تھے۔ اور وہ خوابوں کی کرچیاں اپنے زخمی ہاتھوں میں سنبھالے ویران آنکھوں سے معین الدین کو تکتی رہ گئی تھی۔ جنہوں نے ایک نظر بھی اس پر نہ ڈالی تھی اور ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ کیونکہ مری ہوسٹل سے نجیب کی بیماری کی اطلاع ملی تھی اور پھر جوں ہی ڈرائیور نے آکر بتایا کہ پنڈی کے لیے سیٹ کنفرم ہو گئی ہے تو وہ بغیر اس سے معذرت کیے چلے گئے تھے اور اسے لگا تھا جیسے اس کے دل کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ یہ شخص تو پہلے ہی بہت سی محبتوں میں بٹا ہوا ہے۔ بھلا اس کے پاس میرے لیے کیا ہوگا مگر پھر بھی وہ امید کا چراغ ہتھیلیوں پر جلائے ان کا انتظار کرتی رہی۔

اور جب وہ آئے تو سارا وقت اپنے بچوں کی باتیں کرتے رہے کہ کیسے نجیب کو فوڈ پائیزن ہو گیا تھا اور سبین کیسے پریشان ہوگئی تھی۔ اور یہ کہ ان دونوں کو اپنے ایگزام کی وجہ سے اپنے پپا کی شادی میں شریک نہ ہو سکنے کا دکھ ہے۔ انہوں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ کہ انہیں مزید بچوں کی ضرورت نہیں ہے یہ کہ پارٹیوں اور فنکشنز میں انہیں تنہا شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے جب انہوں نے اسے کالج میں دیکھا تو سوچا کہ وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیں۔

"تم بہت خوبصورت ہو رفی، بہت حسین۔"

انہوں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی تھی، مگر نہ اس کا دل دھڑکا نہ اس کے چہرے پر شفق اتری بس اس کے اندر جلتا امید کا چراغ بھڑک کر بجھ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی حسرت آن کر ٹھہر گئی، منجمد ہوگئی۔ جو بچپن سے اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔ اس نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

لیکن اس کے اندر آگ بھڑکتی رہتی تھی۔

اور آنکھوں میں دھول اڑتی رہتی تھی۔

اسے لگتا تھا جیسے زندگی اس کے اندر مرگئی ہے۔

سبین اور نجیب نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ چھٹیوں میں گھر آتے تو زیادہ تر اپنے ہی کمرے میں گھسے رہتے۔

نجیب پہلی بار اسے دیکھ کر ہنس پڑا تھا۔

"ارے سبو یہ تو تم سے بھی چھوٹی لگتی ہیں۔"

سبین سنیر کیمبرج کر رہی تھی۔

اور وہ ابھی تو سیکنڈ ایئر میں تھی۔ جب معین الدین نے اسے فنکشن میں دیکھا تھا۔

کاش! وہ اتنی خوبصورت نہ ہوتی۔

اس کا دل چاہتا اپنا یہ حسین چہرہ نوچ نوچ کر مسخ کر دے۔

کاش! وہ ایک معمولی شکل کی لڑکی ہوتی اور پھر اس کی کسی بہت ہی معمولی آدمی سے شادی ہوتی مگر وہ اس سے محبت کرتا سچی، خالص اور بے ریا محبت وہ اسے محض ایک شوپیس بنا کر گھر میں نہ سجاتا بلکہ اسے اپنے دل میں جگہ دیتا۔ بلا سے وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی لیکن یہ محرومیاں اس کا مقدر نہ بنتیں۔

"ایمان سے سچ بتائیں کیا پاپا نے آپ کو خریدا ہے۔"

وہ آٹھویں میں پڑھتا تھا لیکن بہت منہ پھٹ تھا۔ ٹپ ٹپ آنسو اس کے اندر گرنے لگے۔

"ہش۔"

سبین نے اسے ٹوکا تھا۔

"ان کے والدین سگے نہ ہوں گے یا پھر۔ یا پھر۔"

دونوں بہن بھائی بہت تیز تھے۔ اور وہ جو انہیں بتانے آئی تھی کہ وہ ان کی ماں ہے۔ حیرت سے آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"How beautiful you are" (کتنی خوبصورت ہیں آپ)

سبین نے اس کی تعریف کی تھی۔

اور پھر وہ دونوں چلے گئے تھے اور وہ بہت دیر تک سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہی تھی۔ مبشر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئے ہوئے تھے سو ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ مگر نجیب اور سبین کبھی اس کے قریب نہ آ سکے تھے۔ اس نے بھی شاید ان کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی وہ مری میں پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں آتے تھے اور اپنی ہی دلچسپیوں میں کھوئے رہتے یوں وہ ان دو سالوں میں کچھ بھی تو حاصل نہ کر پائی تھی نہ ان دونوں بچوں کی محبتیں اور نہ ہی معین الدین صاحب کی چاہتیں۔

معین الدین صاحب شاید ساری محبتیں، سارے لفظ پہلے ہی خرچ کر چکے تھے۔ وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ وہ ہر وقت بنی سنوری رہے۔ خوبصورت نظر آئے اور جب وہ پارٹیوں میں ان کے ساتھ جائے۔ تو لوگوں کی ستائشی نظریں بار بار ان کی طرف اٹھیں۔ وہ بڑے فخر سے اسے دوسروں سے متعارف کراتے تھے۔

''مائی وائف رافعہ!''

ایسے میں ان کی آنکھوں میں عجیب سی مغرورانہ چمک ہوتی تھی مگر محبت، محبت کہیں نہیں تھی۔ بس ایک احساس تفخر ہوتا تھا۔ اور اس کا دل کٹ کٹ کر گرنے لگتا کیا میں محض ایک شوپیس ہوں، جسے معین الدین نے میرے گھر سے اٹھا کر اپنے گھر میں سجا لیا تھا۔

وہ دکھ سے سوچتی رہتی۔

ان دو سالوں میں کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ معین الدین سے اپنا حق مانگے ان سے کہے انہیں بتائے کہ وہ ایک انسان ہے۔

ایک جیتا جاگتا انسان۔

اس میں اور امریکہ سے آئی ہوئی اس چینی کی نازک گڑیا میں بہت فرق ہے جو ڈانس کے انداز میں پوز بنائے کھڑی ہے۔ اور لمحہ لمحہ میں زاویے بدلتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں آنے والوں کی پہلی نظر اسی پر پڑتی تھی۔ اور معین الدین بڑے فخر سے بتاتے تھے۔ کہ امریکہ میں ان کے ایک سنگاپوری دوست نے انہیں یہ ڈیکوریشن پیس گفٹ کیا تھا۔ اور پھر دوسری نگاہ اس کے حسن کو ستائش پیش کرتی اور معین الدین متعارف کرواتے۔

''مائی وائف۔''

اور اسے لگتا جیسے اس میں اور چینی کی اس گڑیا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ بھی ایک

ڈیکوریشن پیس ہے اور بس۔

لیکن اس کے ہونٹ سل جاتے۔

لفظ اس کے اندر ہی چکرا کر کہیں گم ہو جاتے۔

بھلا محبتیں بھی کبھی یوں ملی ہیں مانگ کر۔

اگر ایسا ہوتا تو شاید بچپن میں ہی لڑ کر جھگڑ کر مانگ کر فاروق سے، ٹیپو سے، پپو سے اپنے حصے کی محبتیں لے لیتی۔ اسے تو مانگنا چھیننا ضد کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے تو وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہتی سلگتی رہتی۔

معین الدین کہتے تیار ہو جاؤ تو وہ تیار ہو جاتی۔

وہ کہتے بیوٹی پارلر۔ جا کر بالوں کا اسٹائل تبدیل کروالو۔'' وہ کروا لیتی۔

''وہ کہتے ''عاصم صاحب سے فرینکلی بات کرو ہنس کر۔'' وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لیتی کہ شاید اس کی یہ فرمانبرداریاں معین الدین صاحب کے دل میں اس کے لیے محبت پیدا کر دیں۔ لیکن معین الدین صاحب کے پاس شاید محبت کے لیے وقت نہیں تھا۔ ان کی اپنی بہت سی مصروفیات تھیں۔

انہیں یہ خدشہ تھا کہ پیسے کی دوڑ میں وہ کہیں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس لیے وہ سارا وقت مصروف رہتے تھے۔ اور جو وقت ملتا بھی ملتا تھا وہ نجیب، مبشر اور سبین کے مستقبل کی پلاننگ کرنے میں گزر جاتا سو اس نے یونہی دو سال بتا دیے تھے۔ لیکن اب پچھلے دو تین ماہ سے اسے یوں لگنے لگا تھا۔ جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا وہ ریزہ ریزہ ہو جائے گی عجیب بے کلی تھی بے چینی تھی جو اسے مضطرب رکھتی تھی وہ بے قرار ہو جاتی اور پھر روتے چلی جاتی۔ بغیر وجہ کے دھاڑیں مار مار کے۔

''کیا بات ہے مسز معین الدین کیا محسوس کرتی ہیں آپ۔''

ڈاکٹر خالد پوچھتے۔

''کچھ نہیں۔'' وہ بے بسی سے انہیں دیکھتی۔

''بس میرا دل گھبراتا ہے اور جی چاہتا ہے زور زور سے رووٴں خوب چیخیں مار مار کر۔''

کوئی پرابلم کوئی پریشانی۔''

"کچھ نہیں۔"

وہ اپنے چاروں اور دیکھتی۔

کیا نہیں ہے اس کے پاس۔ آسائشیں سہولتیں سب کچھ مگر ایک محبت نہیں۔ ایک محبت بھری نظر نہیں جو اس کے اندر کی ساری تشنگی کو مٹا دے، ساری پیاس ختم ہو جائے بس ایک نظر اور ڈاکٹر خالد اسے سکون آور دوا دے کر چلے جاتے۔ وہ نرم تکیوں پر سر رکھے سوئی رہتی۔ اور جب اٹھتی تو پھر وہی اضطراب وہی بے چینی جب کبھی کبھی انعم اور نائلہ کی طرف چلی جاتی تو ذرا سا سکون ملتا مگر آج۔ آج تو وہ اور بھی بے سکون ہو گئی تھی۔ یہ کیسی آگ سی اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔

یہ نائلہ احمد نے کیا کہہ دیا تھا۔

مرد کی محبت۔

یوں جیسے چلچلاتی دھوپ میں ٹھنڈے سایہ دار درختوں کی چھاؤں۔

اور اسے یہ چھاؤں کہیں نہیں ملی تھی کبھی نہیں ملی تھی۔ پاؤں کے تلوؤں اور ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آگ نکل رہی تھی اس نے تولیے اپنے پیروں پر سے ہٹائے اور کھڑے ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

"یہ میں ہوں رافعہ سید۔

سیٹھ معین الدین سید کی دوسری بیوی۔

شہر کے سب سے دولت مند شخص کی بیوی۔

جو کتنی فیکٹریوں اور پلازوں کا مالک ہے۔

لیکن پھر بھی کتنی تشنہ لب کتنی تہی دامن۔

اور لوگ مجھے خوش نصیب سمجھتے ہیں۔

یہ خوبصورت آنکھیں

یہ قاتل ہونٹ

یہ دلفریب چہرہ

یہ دلربا قد و قامت

یہ سب دھوکا ہے۔ اندر۔ سے تو یہ خوبصورت عورت دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ

بدنصیب ہے۔ کہ جس کی جھولی میں کبھی پیار کی ایک بوند نہیں پڑی۔ جس کا دل سدا خالی رہا جو سدا پیاسی نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔

آنسو اس کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پر آ کر اٹک گئے۔ اس نے انگلیوں کی پوروں سے اپنے آنسوؤں کو پونچھا اور اس کا دل چاہا وہ چیختی ہوئی باہر نکل جائے اور حلق...... پھاڑ پھاڑ کر چیخ چیخ کر سب کو بتائے کہ اس بڑے گھر میں رہنے والی، ریشمی کپڑے اور قیمتی زیورات پہننے والی خوبصورت عورت دنیا کی سب سے بدنصیب ہستی ہے۔ بڑی بد قسمت۔ بڑی بدنصیب ہے۔ جو بھرے سمندر میں پیاسی کھڑی ہے۔ پانی اس کے چاروں اور چھل چھل بہہ رہا ہے لیکن وہ تشنہ لب ہے۔

نڈھال نڈھال سی وہ پھر اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے، کیا اپنے گھر لوٹ جائے ماں کے پاس لیکن وہاں بھی تو اس کے لیے کچھ بھی تھا۔ نہ محبتیں نہ چاہتیں بس فاروق کی آنکھوں کی وہ سرد مہری بیگانگی تھی جو اسے توڑتی رہتی تھی۔ ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ اور لوگ کہتے تھے فاروق عظیم ہے جس نے پرائی اولاد کو سینے سے لگا کر رکھا۔ اف تک نہ کیا۔

مگر کاش۔ اے کاش انہیں پتا ہوتا کہ فاروق نے اسے سہولتیں تو مہیا کیں۔ روٹی، کپڑا تعلیم سب کچھ مگر اس کی روح کو تو پیاسا رکھا تھا۔ کیسی پیاس تھی کہ جو بجھتی ہی نہ تھی۔ کیسی طلب تھی جو ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ بس ایک محبت بھری نظر کی طلب۔ کاش! فاروق نے اسے اس چاہت کا ہزارواں حصہ ہی دے دیا ہوتا جو اسے نومی، فرحی، ٹیپو اور پپو سے تھی تو شاید آج وہ اتنی بے چین نہ ہوتی۔

"ہاں وہ کہاں جائے؟"

جہاں اس کے لیے محبتیں ہوں، چاہتیں ہوں۔ جہاں عمر بھر کی تشنگی ختم ہو جائے۔

ایسی جگہ کہاں تھی بھلا اسے تو یہیں رہنا تھا سیٹھ معین الدین کی اس محل نما کوٹھی میں ڈیکوریشن پیس بن کر۔ یکا یک روم میں اس امریکن چینی گڑیا کے ساتھ سج کر بیٹھ جائے اسی کی طرح پٹ پٹ آنکھیں مٹکائے اور لمحہ لمحہ زاویے بدلے۔ مگر وہ بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش کو دبائے بیٹھی رہی اور اس کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہوتا رہا۔

"ہیلوم۔"

نجیب نے تھوڑا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ اس نے اپنی سرخ سرخ بوجھل آنکھیں اوپر اٹھائیں فریش، فریش سا نجیب مسکرا رہا تھا۔

Are you ill Mum کیا آپ بیمار ہیں مم۔

''نو کم آن۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

نجیب اندر چلا آیا۔

''تم اچانک کیسے آ گئے نجی۔''

''اچانک۔''

نجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں تو۔ پپا نے آپ کو نہیں بتایا کہ ہم آج آ رہے ہیں۔ سبین بھی آئی ہے۔ وہ مبشر بھائی بھی آ رہے ہیں۔ اس لیے تو ہم آئے ہیں۔''

اور معین الدین نے اس سے ذکر تک نہیں کیا تھا۔ بتایا تک نہیں تھا۔ آخر وہ کیا لگتی تھی ان کی۔ کیا رشتہ تھا اس کا ان سے۔ معین الدین اسے ان کی ماں بنا کر تھوڑا ہی لائے تھے، انہیں تو سوسائٹی میں اپنے ساتھ موو کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ وہ تو صرف وہ تو صرف ایک۔

''سوری۔''

نجیب کی آنکھوں سے یک دم بیگانگی جھانکنے لگی۔

''آپ کو بھلا کیا خبر ہو سکتی ہے کہ ہم آ رہے ہیں۔ کون سا آپ ہماری سگی ماں ہیں جو آپ کو ہمارے آنے جانے سے دلچسپی ہو۔''

وہ ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔

''نہیں۔'' وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

''اگر تمہارے باپ نے مجھے تمہاری آمد کی اطلاع نہیں دی۔ تو اس کے قصور کی سزا مجھے نہ دو۔''

جانے کس رو میں وہ آج اس کے کمرے میں چلا آیا تھا ورنہ تو۔

''رک جاؤ نجیب، میرے بیٹے، میرے شہزادے۔'' اس نے بے آواز پکارا۔

''آؤ میں تمہیں گلے سے لگا لوں۔''

اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر اس کو گلے سے لگا لے اس کے ماتھے کو اس کی آنکھوں کو اس کے چہرے کو چوم لے اسے اتنا پیار کرے اتنا کہ عمر بھر کی تشنگی ختم ہو جائے۔ کیا ہوا جو معین الدین نے اسے محبت نہیں دی۔ یہ نجیب تھا، سبین تھی آخر اس نے ان کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔ ان سے محبت کر کے کیوں نہیں دیکھا۔ ان کا کیوں نہیں سوچا۔ کیا ہوا جو وہ عمر میں اس کے برابر ہیں۔ لیکن ہیں تو اس کے بچے۔

''نجیب بیٹا؟''

اس نے پکارا، آواز دی لیکن وہ جا چکا تھا۔

وہ خالی نظروں سے تھوڑی دیر ہلتے پردے کو دیکھتی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور جب رات گئے معین الدین آئے تو وہ بے سدھ پڑی تھی۔

''اوہ!'' معین الدین جھنجلا گئے۔

آج ان کے بچے آئے تھے پھر مبشر اور آنے والے تھے پورے چار سالوں بعد، انہیں پروگرام ترتیب دینا تھا۔ وہ اس کے آنے پر بہت بڑا فنکشن کرنا چاہتے تھے اور ایسے میں اس کی بیماری۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔

''رانی۔ رافعہ!''

اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔

''آپ!''

''ہاں! کیا ہوا ہے تمہیں اور کیا مسئلہ ہے۔ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔ آخر یہ ڈپریشن کیوں ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''مجھے خود نہیں پتا کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔''

''دیکھو رافعہ میں ایک مصروف آدمی ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارا دل بہلاتا رہوں۔ یہ تم خود ہی کوئی مصروفیت تلاش کر لو۔ کوئی اور کلب جوائن کر لو۔ گھوما پھرا کرو۔ گاڑی ہے تمہارے پاس۔ ڈرائیور ہر وقت موجود رہتا ہے۔ میر؟ اسمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہاں کیا کمی ہے؟''

اس نے معین الدین کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ اور سوچا۔

''آپ کو نہیں پتا کہ مجھے کیا کمی ہے۔ اور آپ کو پتا بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے کبھی کسی کی روح میں جھانک کر دیکھا ہو تو تب نا۔ روح کی تشنگی روح کی پیاس کیا ہوتی ہے اور پھر میں جو بچپن سے آبلہ پا تپتی زمینوں پر چل رہی تھی اس آس میں کہ شاید کہیں کوئی بادل کوئی چھاؤں میرے نام کی بھی ہوگی۔ مگر اب۔ اب آن کر پتا چلا کہ مجھے تو ہمیشہ ساری زندگی تپتی ریت پر یوں ہی ننگے پاؤں چلنا ہے۔

یکایک اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے اور اندر آگ سے بھڑک اٹھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ہاں کیا کمی ہے تمہیں۔ سب کچھ تو ہے۔ جتنا چاہو خرچ کرو۔ جو چاہو خریدو۔''

''کیا کمی ہے مجھے۔''

اس کی آنکھیں خون رنگ ہو گئیں بھڑکتی آگ پر جیسے کسی نے تیل ڈال دیا۔ اس نے معین الدین کا گریبان پکڑ لیا۔

''کیا دیا ہے آپ نے مجھے؟ پیسہ، دولت، آسائشیں نہیں چاہیے مجھے۔ یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔ آپ نے مجھے یہ تک نہیں بتایا کہ بچے آ رہے ہیں۔ آپ نے بچوں کو بھی مجھ سے دور رکھا۔ آپ نے مجھے۔''

''رافی! ہوش کرو۔''

معین الدین نے نرمی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''آپ نے۔ آپ نے مجھے ایک بچے کی خوشی تک نہیں دی۔ آپ نے مجھے ماں بننے کی خوشی سے بھی محروم رکھا ہے۔''

''ہمارے بچے ہیں، ہمیں مزید بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''وہ۔ وہ میرے بچے نہیں ہیں۔ آپ کے بچے ہیں۔ آپ کے بچے ہیں۔ آپ نے انہیں مجھ سے دور رکھا ہے۔ انہیں میرا نہیں بننے دیا۔''

''وہ تمہارے بھی بچے ہیں رافی۔ ابھی وہ پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے دور رہتے ہیں۔ سبین، نجیب دونوں بہت اچھے ہیں اور تمہیں پسند کرتے ہیں۔''

''پسند۔'' وہ ہذیانی ہنسی ہنسی۔

''پسند تو مجھے بہت لوگ کرتے ہیں لیکن مجھے، مجھے۔''

اس نے ملتجی نظروں سے معین الدین کی طرف دیکھا۔ اور پھر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''پلیز۔ میں کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی کبھی کچھ نہیں۔ بس مجھے یہ چھوٹی سی خوشی دے دو۔ مجھے ماں بننے کی خوشی سے محروم نہ رکھو مجھے۔''

''عجیب عورت ہو تم۔''

معین الدین جھلا گئے۔

''کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ میری فیملی مکمل ہے ہمیں مزید بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے ایک دم مٹھیاں بھینچ لیں اور زور سے پلنگ سے سر ٹکرانے لگی۔ سبین اور نجیب بھاگتے ہوئے اندر آ گئے۔

''کیا ہوا پپا؟''

معین الدین نے ایک نظر انہیں دیکھا اور ڈاکٹر خالد کو فون کرنے لگے۔ سبین اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''مم۔ کیا ہوا؟'' اس نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''آپ کی طبیعت کیا بہت خراب ہے۔''

اس نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''سبین۔ میں تمہاری ماں ہوں۔''

''آئی نو مم۔'' میں جانتی ہوں مم۔

''پھر تم میرے پاس آتی کیوں نہیں ہو میرے پاس بیٹھتی کیوں نہیں ہو مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی ہو؟''

''مم۔ آئی۔ ایم سوری۔''

''سبو، نجی۔ میں تمہاری ماں ہوں، مجھے اپنی ماں ہی سمجھو۔ مجھ سے اپنی ماں کی طرح محبت کرو۔ میرے اندر آگ لگی ہے۔''

''مم!'' نجیب اور سبین حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

‘‘آپ ٹھیک تو ہیں نا۔’’

‘‘میں۔’’

‘‘بچو! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ جائیں اپنے کمرے میں۔ ابھی ڈاکٹر خالد آ رہے ہیں۔’’

‘‘نہیں۔’’

اس نے ملتجی نظروں سے انہیں دیکھا اور بے آواز پکارا۔

‘‘مجھے یوں اس طرح اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری محبت کی اور تمہاری رفاقت کی۔ سبین، نجیب میرے بچو میرے پاس بیٹھو۔ میں بچپن سے کسی کی محبت کے لیے ترس رہی ہوں۔ مجھے یہ بے مول دولت کہیں نہیں ملی۔ میں صدیوں سے پیاسی ہوں۔’’

‘‘یس پپا۔’’

سبین بھی کھڑی ہو گئی۔

اور پھر وہ دونوں اس پر رحم بھری نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گئے اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ معین الدین تھوڑی دیر بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ اور پھر ڈاکٹر خالد کے آنے تک وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ کچھ دنوں کے لیے وہ اسے ڈاکٹر خالد کے ذاتی کلینک میں ایڈمٹ کروا دیتے ہیں۔

‘‘لیکن سیٹھ صاحب! انہیں معمولی ڈپریشن ہے۔ کلینک بھجوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں آپ کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں گھر پر یہ زیادہ جلدی بہتر ہو جائیں گی۔’’

ڈاکٹر خالد نے مشورہ دیا۔

‘‘آپ نہیں جانتے ڈاکٹر سبین اور نجیب صبح سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اور مجھے ان کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ملا۔ دو روز بعد مبشر آ رہا ہے اور بچے بڑے ایکسائیٹڈ ہو رہے ہیں۔’’

معین الدین نے اپنی مجبوری بتائی تو ڈاکٹر خالد خاموش ہو گئے اور یوں اسے گھر سے کلینک منتقل کر دیا گیا۔

‘‘میرے خیال میں اب مجھے گھر چلے جانا چاہیے۔ میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔’’

اس نے ڈاکٹر خالد سے پوچھا جو ابھی ابھی اس کے کمرے میں آئے تھے۔ آج اسے یہاں آئے تیسرا دن تھا۔

‘‘میرے خیال میں ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ایک دو روز تک آپ کو گھر بھجوا دیں گے۔’’

ڈاکٹر خالد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

‘‘مگر مبشر آ چکے ہوں گے، ایسے میں میرا گھر میں ہونا بہت ضروری ہے۔ سیٹھ صاحب کیا سوچیں گے ان کا بیٹا اتنے عرصے بعد آیا اور۔ میں تو یوں بھی شرمندہ ہوں اپنی اس بے وقت کی بیماری پر۔ پلیز ڈاکٹر آپ مجھے جانے ہی دیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے بس یوں ہی کبھی کبھی اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔ اس بار کچھ زیادہ طبیعت خراب ہو گئی۔’’

‘‘وہ تو ٹھیک ہے لیکن سیٹھ صاحب کا خیال ہے ابھی کچھ دن آپ یہاں ہی رہیں۔’’

ڈاکٹر خالد نے آہستگی سے کہا۔

‘‘اچھا! میں خود بات کرتی ہوں۔’’

اس نے فون اپنی طرف کھسکا لیا۔

‘‘ہیلو مم! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟’’

فون نجیب نے اٹینڈ کیا تھا۔

‘‘فائن!’’ وہ مسکرائی۔

نجیب ایک دم ہی اسے بہت پیارا لگنے لگا تھا۔

‘‘آپ کو کیا ہوا تھا؟’’

‘‘کچھ نہیں بس ایسے ہی۔’’

‘‘بس ایسے ہی کیا۔ کہیں ہمارا کوئی بہن بھائی تو نہیں آ رہا۔’’

وہ بڑا منہ پھٹ تھا ریسیور اس کے ہاتھوں میں کانپ گیا۔

"نہیں۔"

اس نے آہستگی سے کہا اب بھلا نجیب کو کیا پتا کہ اسے یہ خوشی کبھی نہیں مل سکتی۔ وہ تو محض شوکیس میں سجی ہوئی ایک بے جان گڑیا ہے۔

"مبشر آ گئے ہیں۔"

اس نے بمشکل خود پر قابو پا کر کہا۔

"ہاں اور اکیلے آئے ہیں۔ خواہ مخواہ سین اور میں منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولنے کی کوشش کرتے رہے۔ ابھی تک جبڑے درد کر رہے ہیں۔ لیجیے پپا سے بات کریں۔"

"ہیلو کیسی ہو۔"

"ٹھیک ہوں، مبارک ہو مبشر آ گئے۔"

"ہاں۔ شکریہ۔"

"آپ گاڑی بھجوا دیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"نہیں، ڈیئر ابھی کچھ دن تم وہاں ہی رہو۔ ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم بالکل ریلیکس ہو کر گھر آؤ۔ ابھی مبشر کے آنے کی خوشی میں پارٹی وغیرہ کرنی ہے پھر میں یورپ کا بزنس ٹور ارینج کر رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو گی۔ تمہاری تفریح ہو جائے گی۔ اچھا بائے۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"آپ کیا محسوس کر رہی ہیں؟"

ڈاکٹر خالد نے اس کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا۔

اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے ذہن میں عجیب جھگڑے سے چل رہے تھے اور سب کچھ گڈمڈ سے ہو رہا تھا۔

نجیب کی باتیں،

سیٹھ معین الدین کی ہدایات

ڈاکٹر خالد کا تجزیہ

ایک بچہ

کوئی مصروفیت

یورپ کا ٹور

کلب کی رکنیت

نائلہ کا خیال

مرد کی محبت، ٹھنڈی میٹھی چھاؤں

فاروق جو اس کا باپ نہیں تھا۔

ٹیپو، پپو جو اس کے بھائی تھے بھی اور نہیں بھی تھے۔ پیاس، شدید پیاس سے ایک دم اس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی۔

ڈاکٹر خالد نے اسے آواز دی۔ لیکن اس نے بے چارگی سے اپنا سر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ اس کے چاروں طرف جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

وہ بے بسی سے سر پٹخنے لگی تو ڈاکٹر خالد نے گھبرا کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور نرس کو آواز دے کر انجکشن تیار کرنے کو کہا۔ لیکن اس نے ہاتھ چھڑا کر میز پر پڑا ہوا پانی کا جگ اٹھا کر اپنے اوپر الٹ ڈالا۔

"کیا محسوس کر رہی ہیں آپ مجھے بتائیں۔"

"میں جل رہی ہوں ڈاکٹر آگ لگی ہے میرے اندر میرے ہاتھ پاؤں، جسم سر سب کچھ جل رہا ہے۔" ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ سے انجکشن لے لیا۔

"بی۔ ایزی مسز معین الدین آپ کو کچھ نہیں ہے بس ذرا سا ڈپریشن ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر مجھے شاید بخار ہے شدید بخار۔"

ڈاکٹر خالد نے نرس کو ٹمپریچر چیک کرنے کے لیے کہا۔ اور خود غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بہت مضطرب بہت بے چین لگ رہی تھی۔ اور بار بار اضطراب سے سر جھٹکتی انگلیاں چٹخاتی۔

"مسز معین الدین!"

ڈاکٹر خالد نے ٹمپریچر دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"آپ سمجھدار ہیں، پڑھی لکھی ہی آپ کو اب تک حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کی اور معین الدین صاحب کی عمر میں بہت فرق ہے لیکن ہمارے ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے اور لڑکیاں، بہت خوش، باش زندگی گزار لیتی ہیں۔ بہت خوش رہتی ہیں۔ آپ

شاید سمجھوتا نہیں کر پا رہی ہیں۔ شاید اس لیے یہ بے چینی اور اضطراب ہے۔"

"سمجھوتا تو اس نے کر لیا تھا پھر۔"

اس نے مشکل سے آنکھیں کھول کر ڈاکٹر خالد کو دیکھا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔

"آپ آرام کریں اب؟" ڈاکٹر خالد کھڑے ہو گئے۔

"جب آپ اٹھیں گی تو بالکل فریش ہوں گی۔"

"ہاں سمجھوتا تو اس نے کر لیا تھا پھر۔"

اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔

"اس نے ایک بار بھی اعتراض نہیں کیا تھا کہ معین الدین عمر میں اس سے بہت بڑے ہیں یا شادی شدہ ہیں۔ وہ تو بہت سارے خواب پلکوں پر سجائے آئی تھی۔ مگر سارے خواب بکھر گئے تھے۔ معین الدین سے اسے وہ محبت نہیں ملی تھی جس کی وہ متلاشی تھی۔ وہ چاہت نہیں ملی تھی جس کی تمنا بچپن سے ہی اس کے اندر پل رہی تھی اور وہ سب نائلہ، نمیرہ اور انعم کہتی تھیں کہ اسے بے حد محبت ملے گی۔ بے حساب کیونکہ وہ ہے ہی چاہے جانے کے قابل مگر یہ بے حد بے حساب محبت کہاں تھی کہاں چھپ گئی تھی جو اسے نہیں ملی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی اسی وقت جا کر نائلہ احمد سے پوچھے کہ وہ محبت اسے کہاں ملے گی جس کی پیش گوئی وہ ہمیشہ کرتی رہی ہے۔ اس نے سر اٹھایا مگر اس کا سر بے حد بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس نے بے بسی سے سر پھر تکیے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید وہ سارا دن سوتی رہی تھی اس نے کلائی موڑ کر ٹائم دیکھا چھ بجے تھے اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا کمرے میں ملگجی سی روشنی پھیل گئی۔ لحہ بھر وہ یونہی کھڑکی کے پاس کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر باہر نکل آئی۔ آفس میں موجود نرس کو اس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین کے گھر جا رہی ہے۔ ڈاکٹر خالد پوچھیں تو انہیں بتا دینا۔

"تم رافو! اس وقت اکیلی رکشے پر آئی ہو۔" ماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"خیریت تو ہے نا۔"

"اماں! میں بہت دنوں بعد گھر آئی ہوں۔" ماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے اندر تو آنے دو۔"

"ہاں آؤ۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئی لیکن اس کی آنکھوں میں ڈھیروں سوال تھے۔

"سب ٹھیک تو ہے نا معین الدین تو۔"

بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے اماں!"

وہ ہولے سے ہنسی۔

"آپ یونہی گھبرا رہی ہیں۔ میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں صرف چند دنوں کے لیے آئی ہوں۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"گھر میں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ سب کہاں ہیں۔"

"وہ سب آج ہی ملتان گئے ہیں مسرت بھی بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں اور پھر فاروق بھی بہت دنوں سے بہن کے ہاں نہیں گئے تھے۔"

"آپ کیوں نہیں گئیں؟"

"لو بھلا میں کیسے جاتی گھر اکیلا چھوڑ کر اور پھر فاروق تو دو تین روز بعد واپس ہی آ جائیں گے میں چلی جاتی تو پھر انہیں کھانے پینے کی تکلیف ہوتی۔ بچے اب گئے ہیں تو مہینہ بھر تو رہیں گے۔ دادی پھوپھیوں کے پاس۔ تو بتا اچانک اس وقت کیسے آ گئی۔ رافو؟ پھر رکشے پہ آئی ہے۔ تیرے گھر اک نہ دو کئی کئی گاڑیاں ہیں۔"

ماں کے لہجے میں ابھی تک شک تھا اور وہ متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بس بیٹھے بیٹھے دل گھبرایا تو چلی آئی۔ کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اماں یہ میرے باپ کا گھر نہیں ہے مگر آپ کا گھر تو ہے نا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور بڑی دلگرفتگی سے سوچا۔

آپ کو کیا خبر اس بڑے محل نما گھر میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میرے وجود میں آگ لگی ہو اور میں دھڑا دھڑ جل رہی ہوں سوکھی لکڑیوں کی طرح۔"

"ارے کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تو یہیں اس گھر میں پلی بڑھی ہے یہی تیرا میکہ ہے۔ اچھا ہوا تو آ گئی میں بھی اکیلی تھی ویسے رافو۔"

اس نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"تو خوش تو ہے نا؟ سب لوگ اچھے ہیں۔"

"ہاں!" اس نے نگاہیں جھکا لیں اور سوچا۔

"مائیں تو بیٹیوں کے چہرے دیکھ کر دلوں کا حال جان لیتی ہیں اور یہ کیسی ماں ہے جسے میرے اندر جلتے الاؤ دکھائی نہیں پڑتے جسے میری آنکھوں کے پیچھے چھپی حسرتیں کبھی نظر نہیں آئیں۔ اور جسے میرے چہرے پر پھیلے دکھ اور ملال کے سائے پتا نہیں چلتے اور جو آج دو سالوں بعد پوچھ رہی ہے کہ کیا میں خوش ہوں۔"

"بچوں کا سلوک تیرے ساتھ کیسا ہے؟ وہ تیری عزت تو کرتے ہیں نا۔"

"پتا نہیں۔"

بچے اس کے پاس رہتے کہاں تھے جو وہ ان کے متعلق یقین سے کچھ کہہ سکتی۔

"میں سمجھی تھی تو بہت خوش ہوگی۔"

ماں نے آہستگی سے کہا۔

"خوش تو میں ہوں کیا نہیں ہے میرے پاس۔"

وہ پھیکی ہنسی ہنسی۔

لیکن شاید ماں نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ ہولے ہولے بولتی رہی۔

"تو شادی کے بعد ان دو سالوں میں صرف چند بار ہی تو آئی ہے۔"

"کیا تھا یہاں میرے لیے جو میں روز روز آتی کس محبت کی تلاش میں کون تھا میرا منتظر یہاں۔"

"اور وہ بھی ذرا دیر کے لیے کیا پتا چلتا مجھے کہ تو خوش ہے یا نہیں میں نے مخالفت کی تھی کہا تھا کہ معین الدین کی عمر زیادہ ہے وہ تین بچوں کا باپ ہے۔ رافو، ابھی بہت چھوٹی ہے لیکن فاروق۔"

"میں خوش ہوں اماں!"

اس نے بڑے یقین سے کہا لیکن وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اماں!" اس نے جھجکتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ دن یہاں رہ لوں۔"

"رافو۔"

ماں کی آواز اس کے حلق میں جیسے پھنس گئی۔

"اماں جب نومی کے ابو آئیں گے تو میں چلی جاؤں گی۔"

"رافو! وہ تیرا بھی باپ ہے اور یہ گھر تیرا میکہ ہے۔ تو جتنے دن دل چاہے رہ۔"

"وہ میرا باپ نہیں ہے اماں! ایک بار آپ نے ہی تو بتایا تھا۔"

اس نے سادہ سے انداز میں کہا لیکن جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ ماں کو یوں لگا جیسے بہت سارے کانچ اس کے دل میں اتر گئے ہوں۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں رافو نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ جو ملا پہن لیا اور جو دیا کھا لیا۔ مگر یہ آج یہ آج چھوٹی سی بات کر کے اس نے ایک ساتھ اس کے دل میں کئی سوراخ کر دیے تھے۔ اسے اتنے برسوں بعد اب احساس ہوا تھا کہ اس نے رافو کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کی حق تلفی کی ہے۔ باپ کی محبت تو اس سے چھین ہی گئی تھی لیکن شاید نادانستگی میں اس نے اسے اپنی محبت اور توجہ سے بھی محروم کر دیا تھا اس نے انگلیوں کی پوروں سے اپنے آنسوؤں کو پونچھا۔ رافعہ یونہی خالی خالی نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"چلو اٹھو کمرے میں جاؤ میں جلدی سے دو روٹیاں پکا لیتی ہوں۔"

"مگر مجھے تو بھوک نہیں ہے۔"

"خالی پیٹ نہیں سوتے رافو! تو چل ٹی وی دیکھ۔ میں بھی بس آتی ہی ہوں۔ پھر بیٹھ کر ماں بیٹی باتیں کریں گے۔"

ماں کے لہجے میں پہلی بار اس نے اپنے لیے پیار دیکھا۔ اس نے ایک حیرت بھری نظر ماں پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

"خدا کی قسم رافو تو آج بیمار کر دے گی ہمیں۔"

انعم حیدر نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"اول تو اس موسم میں باہر نکلنے کی تک ہی نہیں تھی۔ اور جب آ ہی گئے تھے تو پھر جلدی کرنا تھی، ایک گھنٹے سے بارش میں بھیگ رہے ہیں اور نہ کوئی بس آ پا رہی ہے اور نہ ہی کوئی رکشہ۔"

"تمہیں کیا خبر انو کہ مجھے بارش میں بھیگنا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ جیسے میرے اندر کی آگ ٹھنڈی ہو رہی ہو۔"

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور مسکرا کر انعم کی طرف دیکھا۔

"تمہیں بارش میں بھیگنا اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں۔" انعم نے برا سا منہ بنایا۔ اور دور سے آتی ہوئی بس کو دیکھنے لگی۔

وہ انعم اور نائلہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی کوئی خاص اور ضروری شاپنگ نہیں تھی۔ بس یونہی اسے اماں کے گھر آئے چھ دن ہو چکے تھے۔ سیٹھ معین الدین نے فون پر اس سے مختصر بات کی تھی اور اس نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہے۔

"آل رائیٹ جب دل بھر جائے تو فون کر دینا۔"

سیٹھ معین الدین نے فراخدلی سے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ کم از کم ایک ماہ تو رہے گی۔ خوب گھومے گی، انعم اور نائلہ کے ساتھ بازاروں کے چکر لگائے گی۔ بانو بازار میں جا کر چاٹ کھائے گی۔ سینما میں بیٹھ کر فلم دیکھے گی اور وہ سب کچھ کرے گی جو اس کی عمر کی لڑکیاں کرتی ہیں۔ اپنی ساری پرانی سہیلیوں سے ملے گی اور یونہی لایعنی باتیں کر کے خوب زور زور سے ہنسے گی قہقہے لگائے گی اور زندگی سے بھرپور لطف اٹھائے گی۔

فاروق نے اس کے رہنے پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ اماں بھی اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو خوش کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی اندر سے اس کا دل بجھتا جا رہا تھا۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے دیواروں سے سر ٹکرائے یا پھر باہر نکل جائے گلیوں میں اور دیوانہ وار قہقہے لگاتی پھرے کئی بار اس نے گھبرا کر سوچا تھا کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو رہی اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو رو پڑتی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس نے سوچ رکھا تھا کہ ابھی وہ واپس نہیں جائے گی۔ دل تو یہاں بھی گھبراتا تھا، لیکن جب زیادہ گھبراتا تو اٹھ کر چل دیتی۔ یوں ہی بے مقصد "بازاروں کے چکر لگاتی انعم اور نائلہ کے پاس بیٹھ کر لایعنی باتیں کرتی۔ آج بھی وہ انہیں زبردستی لے آئی تھی۔ حالانکہ نائلہ نے بار بار اسے موسم کی خوفناکی کا احساس دلایا تھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا رافی۔"

نائلہ نے قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ چھینٹے اڑاتا ہوا گزر گیا۔

"لعنت ہو۔" انعم بڑبڑائی۔

"اوہ!" نائلہ نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

"بارش پھر شروع ہو گئی ہے۔"

موٹی موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں رافعہ شیڈ سے باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔

"تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو رافو۔"

نائلہ نے چڑ کر کہا۔

"کیا یہ صحیح ہے نیلی کہ پاگلوں کو کسی قسم کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ نہ خوشی کا نہ غم کا۔"

"میں نے پاگلوں پر ریسرچ نہیں کی کبھی۔"

نائلہ کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی اس کی ضد پر چلی آئی تھی۔ موسم کے تیور زیادہ خطرناک ہوتے جا رہے تھے اور وہ اب شیڈ کے نیچے تینوں اکیلی تھیں۔ ایک ایک کر کے سب لوگ جا چکے تھے۔

"پلیز سر آپ کس طرف جا رہے ہیں۔"

انعم نے ہاتھ دے کر سفید نسان کو روک لیا تھا۔

"آپ کو کدھر جانا ہے۔"

سفید نسان میں بیٹھا ہوا شخص خاصا مہذب لگ رہا تھا۔

"آپ آ جائیں آپ نے جہاں جانا ہو ڈراپ کر دوں گا۔"

"مگر۔" نائلہ متذبذب سی تھی۔

"تم نے اس گاڑی کو کیوں روکا احمق کیا خبر کہاں لے جائے۔ ابھی کوئی رکشہ آ جاتا۔"

اس نے سرگوشی کی۔

"ہم تین ہیں ڈر کیسا اور پھر موسم دیکھو، بارش لحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اور کیسا اندھیرا ہو رہا ہے۔ سچی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"تھینک یو سر آپ کو تکلیف ہوگی، ابھی کوئی نہ کوئی رکشہ یا ٹیکسی مل جائے گی۔"

انہیں جھجکتے دیکھ کر رافعہ نے کہا تو پہلی بار چونک کر اس نے رافعہ کی طرف دیکھا اور لمحہ بھر کو اس کی نگاہیں رافعہ کے چہرے پر ٹک سی گئیں۔ وہ مسکرایا۔

"آپ مجھ پر اعتماد کریں موسم واقعی بہت خراب ہے۔ اور آپ کا یہاں کھڑا ہونا مناسب نہیں ہے۔"

اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس پر اعتماد کرنے کو دل چاہتا تھا۔

"پھر چلیں۔" انعم نے نائلہ سے پوچھا۔

"دیکھو انو۔"

یکا یک بادل زور سے گرجا اور نائلہ نے بات نامکمل چھوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص کو اور پھر رافعہ کو۔

"میرا خیال ہے اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر ہم تین ہیں ڈر کیسا رکشے اور ٹیکسی میں بھی اس موسم میں جانا اتنا ہی خوفناک ہے اور بس ہے کہ یوں غائب ہو گئی ہے۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"اگر آپ نے فیصلہ کر لیا ہو پلیز۔"

"چلو۔"

رافعہ نے پہل کی۔ انعم نے اندر بیٹھتے ہوئے اپنا پتا بتایا اور اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی پہلے انعم اور نائلہ کا گھر آتا تھا تم بھی ہمارے ساتھ ہی اتر چلو بارش بند ہوئی تو چلی جانا۔"

"نہیں اماں کو فکر ہو گی۔"

رافعہ کا دل ایک دم اداس ہو گیا تھا اب وہ گھر جانا چاہتی تھی۔

"گھبرانا نہیں میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔"

انعم نے اترتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ویسے بندہ شریف ہی لگتا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی اور اس نے مڑ کر تینوں کو دیکھا۔

"آپ نے کس طرف جانا ہے پلیز۔"

"اوہ!" رافعہ نے چونک کر پتا بتایا۔

"پتا نہیں کیوں آپ کی صورت کچھ شناسا سی لگ رہی ہے جیسے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہو۔"

اس نے رافعہ سے کہا تو رافعہ نے غور سے اسے دیکھا اور وہ بھی اسے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔

"شاید کبھی کہیں کسی محفل میں آپ نے مجھے دیکھا ہو۔"

"آپ پڑھتی ہیں۔"

"جی نہیں، میں نے انٹر کر کے چھوڑ دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔"

رافعہ نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا

"کیا بات ہے کیا آپ نے بھی مجھے کہیں دیکھا ہے۔"

"شاید ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"اوہ!" وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"شاید پچھلے جنم میں ہم کبھی ملے ہوں۔"

"جناب ہم مسلمان ہیں۔"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ۔" اس نے ڈرائیو کرتے کرتے مڑ کر اسے دیکھا۔

"کہ کبھی کوئی شخص ہمیں پہلی بار ملتا ہے تو پہلی ملاقات میں ہی وہ اپنا اپنا شناسا سا لگتا ہے۔ شاید ان کی روحوں کے بندھن پہلے ہی بندھ چکے ہوتے ہیں۔"

"پتا نہیں۔" رافعہ نے آہستگی سے کہا۔

"آپ اتنی اپنی اپنی سی لگ رہی ہیں ایسا لگتا ہے جیسے۔"

"پلیز کوئی اور بات کریں۔"

اس کا دم الجھنے لگا۔

"آپ کا نام۔"

"نام بتانا کوئی ضروری ہے لمحوں کا ساتھ ہے۔"

"لمحوں کا ساتھ ابدی رفاقت میں بھی تو بدل سکتا ہے۔" وہ کچھ زیادہ ہی بے باک

لگ رہا تھا۔ رافعہ خاموش رہی۔

"پلیز ادھر موڑیں۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

"آپ نے شاید میری بے تکلفی کا بُرا مانا ہے۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"آپ کو حیرت ہوئی ہو گی کہ پہلی ملاقات میں ہی یہ شخص کس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ لیکن مس آپ کا جو نام بھی ہے میں ایک بہت کھرا اور سچا آدمی ہوں، ابھی چند دن قبل باہر سے آیا ہوں اور میں وقت کو ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ پہلی نظر میں مجھے اچھی لگیں۔ دوسری نظر میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کی رفاقت میں زندگی کا سفر اچھا گزر جائے گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے پاپا سے بات کروں گا۔ اور پھر سیدھا آپ کے والدین کے پاس آؤں گا کیونکہ مجھے ہمیشہ سیدھے راستوں پر چلنا اچھا لگتا ہے میں ٹیڑھے راستوں پر چل کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔"

یکایک اس کا دل باغی ہونے لگا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس بے حد اچھے سچے اور کھرے آدمی کے ان خوبصورت جذبوں کی پذیرائی کرے۔ اور پھر یہ شخص یہ شخص اس کی عمر بھر کی تشنگی کو ختم کر دے۔ وہ اسے اتنا چاہے اتنا چاہے کہ۔

"مگر۔" اس نے اپنے آپ تنبیہہ کی۔

"تم ایک شادی شدہ لڑکی ہو رافعہ سید۔

ایک معزز شخص کی بیوی۔

اور تین جوان بچوں کی ماں۔

اور تم اپنے حصے کی خوشیاں اور غم پا چکی ہو۔

تم نے اپنا مقدر آزما لیا۔

جو تمہیں ملا وہی تمہارا مقدر تھا۔

اور جو نہیں ملا۔

وہ تمہارے مقدر میں نہیں تھا۔

لیکن میں چاہوں تو اب بھی۔

اب بھی شاید بہت سارے لوگ اپنا دامن میرے لیے وا کر دیں اس اجنبی شخص کی

طرح۔

لیکن کیا پتا تب بھی تب بھی میں تہی دامن ہی رہوں۔ تب بھی میری جھولی خالی ہی رہے۔

تب بھی میں یونہی بوند پانی کو ترستی رہوں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔ آخر آپ کی کہیں تو شادی ہو گی نا پھر مجھ سے ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یقین کریں مس بہت اچھا انسان ہوں۔"

"بس یہاں ہی روک دیں۔"

اس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"آپ کا گھر۔"

"وہ نیلے گیٹ والا۔"

اس نے اشارے سے بتایا اور شکریہ ادا کیا۔

"تو کیا میں اپنے پاپا کو آپ کے والدین کے پاس بھیج دوں۔"

"جلدی میں کیے گئے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ ہنس دیا۔

"آپ کچھ دن سوچ لیں یہ رہا میرا کارڈ اس پر میرا فون نمبر ہے۔ آپ سوچنے کے بعد فون کر لیجیئے گا۔"

اس نے کارڈ لے کر بغیر دیکھے پرس میں ڈال دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ دو تین دن سے باہر نہیں نکلی تھی۔ انعم اور نائلہ کی طرف بھی نہیں گئی تھی۔ عجیب سی بے چینی اور اضطراب کر گیا تھا۔ وہ ایک شخص چند لمحوں کے لیے ملا تھا اور اسے مضطرب کر گیا تھا۔ یہ کیا ہوا تھا جب وہ تپتی دھوپ میں جلتی آبلہ پا اپنی منزل پر پہنچ گئی تھی۔ ایسی منزل جہاں کوئی سبزہ نہیں دھوپ ہی دھوپ تھی تو یہ بادل کہاں سے اس کے سر پر چھاؤں کرنے آ گیا تھا۔ اب تو اس کا سفر تمام ہو گیا تھا۔ اب تو اسے مزید چلنا نہیں تھا۔ یہیں ٹھہر کر رک کر دھوپ کی سختیاں برداشت کرنی تھیں۔ پھر یہ ٹھنڈا سایہ دار بادل اسے کیوں لبھا رہا تھا۔ کہ آؤ میرے سائے میں چلو۔ تمہارا سفر آسان ہو جائے گا۔

اب تمہارے پاؤں نہیں جلیں گے۔

اور تمہیں پیاس نہیں لگے گی۔

"اوہ میرے خدایا۔"

اس نے اپنی کنپٹیوں کو زور سے دبایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اماں اور فاروق دونوں ہی گھر پر نہیں تھے کسی عزیز کے ہاں پرسے کے لیے گئے تھے۔ موسم آج پھر ویسا ہی ہو رہا تھا۔ بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ صحن میں کھڑی ہو کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور پھر اس سفید نسان والے اجنبی کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے حیران رہ گئی۔

"آپ۔"

"جی۔ میں آپ نے فون نہیں کیا تو میں خود آ گیا۔"

"اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گی۔"

"تو ٹھیک ہے میں واپس چلا جاتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے مجھے فون کر کے اپنے فیصلے سے مطلع ضرور کر دیجیے گا۔ آپ نہیں جانتیں آپ نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ یقین کریں میں ان تین دنوں میں ایک رات بھی ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ بار بار آپ کی صورت نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ میں اس طرح ایک نظر والی محبتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص بس ایک نظر میں ہی دل کو بھا جاتا ہے۔ اتنا کہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لینے کو جی چاہتا ہے۔"

وہ اس کے کانوں میں امرت گھول کو چلا گیا اور وہ کتنی ہی دیر تک یونہی ساکت دروازے کے پاس کھڑی رہی اور پھر بے اختیار اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"سنو۔" وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

وہ گلی کی نکڑ پر کھڑی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ ایک دم مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"تم یقین کرو اچھی لڑکی! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔"

"نہیں۔" اس نے کرب سے ہونٹ کاٹے۔

"میں میری شادی ہو چکی ہے۔"

اور پھر وہ اس کے تاثرات دیکھے بغیر تقریباً بھاگتی ہوئی واپس چلی آئی۔

تو وہ لب دریا پہنچ کر پلٹ آئی ہے۔

یونہی تشنہ لب۔

پیاسی اور آبلہ پا۔

اور بے قراری صحن میں ادھر ادھر ٹہلتی رہی اور اماں کے آتے ہی اس نے فون کیا۔

فون نجیب نے ہی اٹینڈ کیا تھا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے مم"

اسے اخلاق نبھانا خوب آتا تھا۔

"اچھے بیٹے ہو کہ خبر تک نہیں لی۔"

وہ زبردستی ہنسی۔

"سوری مم۔ آپ کو تو پتا ہے نا مبشر بھائی کی وجہ سے ادھر۔ خوب رونق رہتی ہے سچی میں اور سبین بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ آپ کب آ رہی ہیں واپس۔"

"ابھی ڈرائیور بھیج دو۔"

"آل رائیٹ۔"

اور وہ تیار ہونے چل دی۔

"اچھا اماں میں جا رہی ہوں۔ اتنے دن گھر پر رکھنے کا بہت شکریہ۔"

"رافو! ایسی اجنبیوں والی بات نہ کر اور دیکھ خوش رہا کر۔"

"میں خوش ہی رہتی ہوں اماں۔"

"نہیں تو خوش نہیں ہے۔ میں تجھ سے شرمندہ ہوں۔"

شاید وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں پلیز میں بہت خوش ہوں۔"

اور پھر وہ گھر چلی آئی۔ نجیب اور سبین اس سے خوش دلی سے ملے۔ مبشر گھر پر نہیں تھے۔ سیٹھ معین الدین نے اسکے یوں چلے آنے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ اپنے یورپ کے ٹور کا پروگرام بناتے رہے۔ اور شبیر مبشر کی شادی کی باتیں کرتے رہے۔ وہ چپ بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس کے اندر جیسے برف سے گر رہی تھی۔

''دیکھو، شام کو تیار رہنا میرے کاروبار سے متعلق کچھ لوگ شبیر سے ملنے آرہے ہیں۔ اچھی طرح تیار ہونا۔''

وہی مخصوص انداز۔

وہی بے حسی کا احساس۔

''بہتر۔''

اس نے ہمیشہ کی طرح کہا اور رانی کو کپڑے نکالنے کا کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔ آنسو باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے لیکن اس نے انہیں بہنے نہ دیا۔ واپس آنے کا فیصلہ تو اس نے خود اپنی مرضی سے کیا تھا پھر وہ اتنی اداس کیوں ہے۔

اس شخص کو بھی اس نے خود ہی لوٹایا تھا۔ صرف دو ملاقاتوں میں بھلا وہ اس کے متعلق کیا کہہ سکتی تھی۔

اگر وہ ساری کشتیاں جلا کر اس تک پہنچ بھی جاتی تو ممکن ہے وہ ہی اسے ٹھکرا دیتا۔

آخر وہ ایک شادی شدہ لڑکی تھی اور۔

''نہیں اس نے صحیح کیا تھا۔''

''لیکن کیا حرج تھا۔'' دل نے سرگوشی کی۔

''اگر وہ چند دن اس کی محبت کا امرت چکھ لیتی۔ برسوں کی پیاس بجھ جاتی۔''

اس کا دل چاہا کہ وہ اس کا دیا ہوا کارڈ ڈھونڈے اور فون کر کے اسے سے کہے۔

''میں تو برسوں سے تمہاری منتظر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تم ملے تو تھک کر میں نے تمہارا انتظار چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اگر تم چاہو اور تمہارا دل اتنا بڑا ہو تو تو۔''

''مگر نہیں یہ میں کیسی غلط باتیں سوچ رہی ہوں۔'' اس نے خود ہی اپنی بات رد کر دی اور دھیان بٹانے کے لیے میگزین دیکھنے لگی۔

وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی اور سیٹھ معین الدین اور ان کے بزنس پارٹنر شیخ نصیر احمد کی ستائشی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ شیخ نصیر نے کئی بار کھل کر اس کی تعریف کی تھی۔ مگر اس کے اندر بیزاری سی پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ نصیر کی باتیں اسے ذرا اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

''ویسے سیٹھ تم ہو بڑے لکی۔''

نصیر احمد نے نہ جانے کس بات پر ہنستے ہوئے کہا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''ہاں یار لکی تو میں ہوں۔''

معین الدین نے بھی قہقہہ لگایا تو زندگی میں کبھی گھاٹا نہیں کھایا جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا فائدہ ہی ہوا۔ مٹی کو چھوا تو وہ بھی سونا بن گئی۔''

''میں کاروبار کی بات نہیں کر رہا تمہاری بیگم کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ ہاں۔''

معین الدین نے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک مغرورانہ سی چمک تھی۔ وہی چمک جو کسی قیمتی یا خوبصورت چیز کی ملکیت پر آدمی کی آنکھوں میں آتی ہے۔ اس کی نگاہیں سیٹھ معین الدین کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ان کی آنکھیں محبت سے خالی تھیں، کوئی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی۔ اس کا اندر دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ مگر وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔ نگاہیں بار بار کارنس پر پڑی گڑیا کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

کیا فرق تھا اس میں، وہ بھی تو ایک ڈیکوریشن پیس ہی تھی کیا مصرف تھا اس کا اس گھر میں۔''

سوائے اس کہ وہ سج بن کر بیٹھ جائے اور معین الدین کے دوستوں کی تعریف سنتی رہے اور۔''

اسے آئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی مگر ابھی تک مبشر اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔

ضرورت بھی کیا تھی انہیں اس سے ملنے کی اہمیت ہی کیا تھی اس کی اس گھر میں۔

"آپ بہت خاموش طبع ہیں مسز معین الدین" شیخ نصیر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"جی بس آپ کی باتیں سن رہی تھی۔"

اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ ذہن بے قابو سا ہو رہا تھا۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی دو تین دن سے ورنہ تو۔" سیٹھ معین الدین ہنسے۔

"میں نے آپ جیسے حسین چہرے کم دیکھے ہیں۔"

"جی۔"

اب بھلا وہ کیا کہتی اس نے شاکی نظروں سے معین الدین کی طرف دیکھا کہ شاید شیخ نصیر کے اس طرح بات کرنے پر انہیں غصہ آیا ہو لیکن ان کی آنکھوں میں وہی احساس تفخر لیے ہوئے مغرورانہ چمک تھی۔

"اچھا بھئی مبشر تو ابھی تک آئے نہیں مجھے اب اجازت دو۔"

شیخ نصیر کھڑے ہو گئے۔

"اور ہاں اپنی مسز کے ساتھ آؤ نا کسی دن۔ بلکہ جب فراغت ملے بتا دینا ڈنر اکٹھا کر لیں گے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔"

وہ شیخ نصیر کو رخصت کر کے پلٹے تو انہیں مبشر آتے دکھائی دیے۔

"ارے مبشر! کہاں چلے گئے تھے تم بیٹا! شیخ نصیر انتظار کر کر کے اب گئے ہیں آؤ تمہاری ممی بھی آئی ہوئی ہیں۔"

"اب ملنا ضروری ہے کیا۔" "صبح مل لوں گا۔"

مبشر کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔

اس کے اندر جیسے برچھی سی اتر گئی۔

کیوں چاہے گا بھلا وہ اس سے ملنا۔ کیا رشتہ ہے میرا اس کے ساتھ سوتیلی ماں ہوں۔

"کوئی بات نہیں بیٹا آ جاؤ۔ آؤ ان سے ملو یہ تمہاری ممی ہیں۔ اور رانی یہ مبشر ہمارے بڑے بیٹے۔"

اس نے نگاہیں اٹھائیں اور دروازے میں ساکت کھڑے مبشر پر جم گئیں۔ وہ بھی عجیب کیفیت میں کھڑا ایک ٹک سے دیکھے جا رہا تھا۔

"تمہاری ممی کیسی لگتیں تمہیں؟ خوبصورت ہیں نا۔"

انہوں نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا جیسے اپنے انتخاب کی داد لینا چاہتے ہوں۔

"ہاں؟"

مبشر نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"واقعی بہت خوبصورت ہیں ممی بہت پیاری۔" دھڑا دھڑ اس کے اردگرد بھانبڑ جل اٹھے۔ اسے لگا جیسے وہ دہکے انگاروں پر کھڑی ہے اور اس کے اردگرد شعلوں کا رقص ہو رہا ہے اور لحہ بہ لحہ یہ شعلے بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے اسے نگلنے کو ہیں۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور وہ لب دریا پیاسی کھڑی تھی۔ سفید نسان والا اجنبی دروازے میں کھڑا زخمی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر شاید سیٹھ معین الدین نے کچھ کہا تھا اس نے سنا نہیں۔ اس کے کان تو سائیں سائیں کر رہے تھے۔

وہ دہلیز چھوڑ کر بالکل اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"یقین نہیں آ رہا کہ آپ میری ممی ہیں۔"

دکھ سے بھرا بوجھل لہجہ۔

اس نے بھڑکتے شعلوں میں گھرے گھرے اسے دیکھا۔

"میں کیا کہوں۔"

اس کی نگاہیں کارنس پر پڑی گڑیا میں الجھ گئیں۔

"یہ تم سے کس نے کہا کہ میں تمہاری ممی ہوں۔" اس نے عجیب چیختی ہوئی ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔ اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہا تھا۔

"میں تو۔ میں تو۔"

اس نے ایک نظر سیٹھ معین الدین پر ڈالی۔

"میں تو صرف ایک ڈیکوریشن پیس ہوں۔ امریکہ سے آئی ہوئی خوبصورت چینی گڑیا۔"

پھر وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگی۔

"رافی ہوش کرو کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" سیٹھ معین الدین نے سختی سے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے۔"

وہ اور زور سے ہنسی اور پھر بھاگ کر کارنس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہوش خرد کی لگامیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔ مبشر اور معین الدین ایک ساتھ اس کی طرف لپکے لیکن وہ ان سے بازو چھڑا کر پھر کارنس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

اور مبشر ساکت کھڑے انتہائی دکھ اور کرب سے اسے دیکھنے لگے۔

❁..........❁
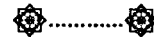
آئینہ اور پتھر

"ماما! آخر آپ کو اعتراض کیا ہے؟"

نرمین کمرے سے باہر جاتے جاتے پھر پلٹ آئی تھی اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اعتراض!"

ثمین نے تھکی تھکی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اپنے گھٹنوں پر رکھے اسکے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"ہاں ماما! آپ تو خود بڑی معروف و مشہور شخصیت رہی ہیں۔ میڈم ربانی کہہ رہی تھیں کہ تمہاری ماما ہمارے کالج کا فخر رہی ہیں اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے ناں ماما کہ میں بھی اسی کالج میں پڑھ رہی ہوں۔ جہاں آپ نے پڑھا تھا اور میڈم ربانی اور میڈم نور فاطمہ نے تو آپ کو بھی پڑھایا تھا۔ وہ آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں ماما۔"

"میڈم ربانی اور میڈم نور فاطمہ۔"

ماضی کی کسی یاد کا جگنو لمحہ بھر کو آنکھوں میں جلا اور پھر بجھ گیا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔

"میں نے کہا ناں پڑھائی متاثر ہو گی تمہاری۔"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔"

اس نے پورے یقین سے کہا اور اس کی آنکھوں میں روشنیاں سی اتر آئیں اور چہرے پر رنگوں کی دمک بکھر گئی۔

"ذرا بھی متاثر نہیں ہوگی۔ آپ دیکھ لینا ماما میں پہلے سے زیادہ نمبر لوں گی۔ اپنی پوزیشن برقرار رکھوں گی۔"

ماضی کے پردے کے پیچھے سے پھر ایک لمحہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یونہی ان کی آنکھوں میں یہ سی اتر آئی تھیں اور چہرے پر رنگوں کی دھنک بکھر جاتی تھی۔ اور وہ یقین دلاتی۔

"بابا جانی! میری پڑھائی ذرا بھی متاثر نہیں ہوگی۔ آپ دیکھ لینا پہلے سے زیادہ نمبر لوں گی۔ بس ایک میچ کے لیے تو جانا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔" بابا اس کے دمکتے چہرے کو دیکھتے۔

"لیکن کیا بابا! آپ کو پتا ہے میڈم ربانی نے کہا ہے ثمین ٹرافی ہر صورت میں ہمارے کالج کو ملنی چاہیے اور میں نہ گئی ناں تو بس ٹرافی گئی۔"

وہ اداس ہونے لگتی۔

"دراصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں تمہاری ٹرافیوں کے لیے جگہ ہی نہیں رہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا اس بار جب تم انعام جیت کر لاؤ گی تو وہ کہاں رکھے جائیں گے۔"

وہ چاروں طرف دیکھتے اور مایوسی سے سر ہلا دیتے۔

"بھئی جگہ نہیں ہے۔"

"جانے دیں نا بابا، کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔"

بڑے بھیا اس کی مدد کو آجاتے اور وہ بابا کی شرارت سمجھ کر خوشی سے کھل اٹھتی تھی۔

"اور پتا ہے ماما! وہ میڈم نور فاطمہ کہتی ہیں کہ تم نہ گئیں تو ٹرافی گئی۔"

"اُفوہ نرما! ضد نہیں کرتے جانو! جاؤ آرام کرو۔"

انہوں نے آہستگی سے اسے کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے ہٹا دیے۔

وہ شاکی نظروں سے روٹھی روٹھی سی مڑ مڑ کر انہیں دیکھتی ہوئی کمرے میں باہر چلی گئی۔ انہوں نے نڈھال سی ہو کر کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔ باہر برآمدے میں نرمین نازنین کے کندھے پر سر رکھے ان کی شکایت کر رہی تھی۔

"آخر ماما ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ وہ کیوں نہیں چاہتیں کہ میں بھی انہی کی طرح

بنوں۔ بیسٹ ڈبیٹر، بیسٹ پلیئر، بیسٹ رائٹر، بیسٹ پوئٹ۔ میں بھی تو انہی کی بیٹی ہوں۔ میرے اندر بھی یہ سب صلاحیتیں ہیں۔ میں بھی تو اپنا آپ منوانا چاہتی ہوں۔ اپنی شناخت کروانا چاہتی ہوں۔ اور اپنی ان صلاحیتوں پر فخر کرنا چاہتی ہوں۔ خالہ جانی پلیز آپ ماما سے بات کریں ناں۔"

وہ روہانسی ہو رہی تھی اور نازنین اسے تسلی دے رہی تھیں۔

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

"اور تمہیں کیا پتا نرمین صفوان فتح خان کہ یہ سب میرا فخر نہیں تھا اور شناخت کا یہ سفر کتنا مہنگا پڑا ہے۔ مجھے کہ آج تک پاؤں لہولہو ہیں۔"

جسے میں نے اپنا فخر جانا تھا۔

وہی میرے لیے طعنہ بن گیا تھا۔

اور شناخت کے اس سفر میں ہر مسام میں اذیتوں کے کانٹے چبھو دیے تھے۔ اور یہ کانٹے نکالتے عمر بتا دی لیکن پھر بھی جیسے وجود میں چبھے کانٹے کم نہیں ہوئے۔ جانو تمہیں کیا پتا تمہاری ماما کے سارے فخر اور سارے مان تو اس شخص نے لمحوں میں پاؤں تلے کچل ڈالے تھے۔ جسے قسمت نے تمہارا باپ بنا دیا تھا۔

ان کی پلکوں کے کناروں پر موتی سے چمکے اور ان کی بند آنکھوں میں آنسوؤں نے ہلچل مچا دی اور گزری اذیتوں کا ایک ایک پل جیسے ان کے دل میں اتر آیا اور وہ آنکھیں موندے بہت پیچھے ماضی میں چلی گئیں۔

"کوئی سابقہ چاہت کوئی محبت، کوئی تعلق، کوئی وابستگی۔"

سر جھکائے کسی خوبصورت جملے کی منتظر ثمین کو یوں لگا جیسے کھڑی فصلوں پر پالا پڑ گیا ہو۔

اور یہ جملہ اس شخص کے لبوں سے نکلا تھا جس تک پہنچنے کے لیے اس نے ایک لمبا سفر طے کیا تھا اور پورے خاندان کی مخالفت مول لی تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ جب وہ اس ان لمبی مسافتوں کا حال بتائے گی تو وہ اس کے زخم زخم پاؤں سے سارے خار چن لے گا لیکن۔

اس نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ گود میں دھر لیے۔

"تم اتنی خوبصورت ہو۔"

وہ اس کے سامنے ہی بیڈ پر بیٹھ گیا اور اس کی پر اشتیاق نظروں نے اس کے سجے سنورے وجود کو تولتی نظروں سے دیکھا۔

لیکن اس کے ٹھنڈے وجود میں ان پر اشتیاق نظروں نے کوئی حرارت پیدا نہ کی۔

"یک طرفہ ہی سہی کچھ تو ہوگا آخر تم اتنی معروف و مشہور شخصیت تھیں۔ بیسٹ پلیئر، بیسٹ ڈبیٹر۔

اس نے لحہ بھر پہلے کے کہے ہوئے جملے کے ساتھ ٹکڑا جوڑا۔ اور اسکے اندر جیسے موسم سرما کی ٹھنڈک اتر آئی۔ اور تیز یخ ہوائیں اس کے وجود کو کاٹنے لگیں۔

"اسٹیج پر دھواں دار تقریریں کرنے والی ثمین علی حیدر کیا اتنی مختصر سی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتی۔" وہ ہنسا۔

اور اس کی ہنسی۔

ثمین علی حیدر کو لگا جیسے وہ جو برسوں پہلے اس نے ٹی وی پر ایک کارٹون فلم دیکھی تھی اور جس میں ایک بھیانک شکل کے دیو نے ایک ننھی پری کو اپنی ہتھیلی پر بٹھا رکھا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور دیو ہنس رہا تھا۔ بالکل ایسی ہی ہنسی۔

ننھی پری دیو کی قید میں آ گئی تھی۔ اس نے اپنی بے حد خوبصورت آنکھوں پر پہرا دیتی بے انتہا لمبی پلکیں اوپر اٹھا کر مدھم لہجے میں کہا۔

"ایسی باتوں کا کیا جواب ہوسکتا ہے۔"

اور صفوان فتح خان کا قہقہہ پہلے سے بھی زیادہ بلند تھا۔

"دیکھا ثمین علی حیدر! کیسے لاجواب کیا۔ اور وہ تمہارے مداح ممتاز ملک کہا کرتے تھے کہ تم ہر ایک کو لاجواب کر دیتی ہو۔"

اور اس نے قطرہ قطرہ آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے سوچا۔ کہ آج میں نے اپنی زبان ہمیشہ کے لیے گروی رکھ دی ہے۔

اور یہ شخص صفوان فتح خان۔

جس کے متعلق نازنین آپا کی رائے تھی۔

"ثمو! یہ شخص مجھے کچھ جچا نہیں۔ بات کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے سامنے

باقی سب حقیر، فقیر ہوں عجیب سا تمسخر اڑاتا لہجہ لگا مجھے اس کا۔"

اور فرحین آپا کو حیرت تھی۔

"آخر تم نے اس میں کیا دیکھا ثمو!"

اس نے کیا دیکھا تھا۔ یہ تو وہ خود ہی نہیں جانتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی میں انگلش ڈبیٹس کی ٹرافی جیت کر اپنا پرسنل انعام اٹھائے۔ وہ سر ممتاز ملک کے پاس کھڑی ان کی داد وصول کر رہی تھی۔ کہ بالکل اچانک ہی اس کی نظر ان کے بالکل قریب کھڑے صفوان فتح پر پڑی تھی۔

کنپٹیوں سے سفید ہوتے بال۔

بے انتہا گریس فل سی شخصیت والے صفوان فتح خان کو اس نے دوبارہ ارادتاً دیکھا تھا۔ اور صفوان فتح خان کے لبوں پر بے اختیار آنے والی دلکش سی مسکراہٹ نے اس کے پورے چہرے کو جیسے روشن کر دیا تھا۔

"یہ میری ایک بہت ذہین اسٹوڈنٹ ہے۔"

سر ممتاز نے اس کا تعارف کروایا تھا۔ اور صفوان فتح خان نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھ کر ذرا سا سر خم کیا تھا۔ اور پھر مڑ کر کسی سے باتیں کرنے لگے تھے۔

"سر صفوان فتح خان بیچلر ہیں۔"

ارم نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"جانے وہ خوش نصیب کون ہوگی جس کے انتظار میں حضرت بال سفید کر رہے ہیں۔"

فرح سدا کی شوخ تھی۔

"اور کیا اچھا ہو، وہ خوش نصیب میں ہی ہوں۔"

لحہ بھر کے لیے بس ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں خیال آیا تھا۔ اور پھر وہ ان کی شخصیت کے سحر سے نکل کر پروفیسر ممتاز سے دوسرے دن ہونے والے اردو مباحثے کے متعلق بات کرنے لگی تھی اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس کے ذہن میں صفوان فتح خان کا خیال نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نے پھر کبھی انہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ یونیورسٹی اکثر جاتی رہتی تھی۔ اور پھر جب اس نے خود یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو اسے پتا چلا تھا کہ صفوان فتح خان

باہر ایجوکیشن کے لیے جرمنی گئے ہوئے ہیں۔

سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی عذرا الیاس جو اس کی فاسٹ فرینڈ، ہما صادق کی کزن تھی اکثر ان کا ذکر کیا کرتی تھی۔

ان کی وجاہت کا۔

اور ان کی زبردست پرسنیلٹی کا۔

اور ان کے اب تک ان میرڈ ہونے کا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا اگر صفوان فتح خان مجھ پر مر مٹتے۔ میں یعنی عذرا الیاس۔''

''اور تم ان سے شادی کر لیتیں اپنے سے دگنی عمر کے مرد سے۔'' ہما کو حیرت ہوئی۔

''پتا نہیں، یہ تو بعد میں سوچتے۔''

وہ بائیں آنکھیں کا کونا دباتی۔

''پتا نہیں کون خوش نصیب ہوگی وہ۔''

اور وہ ثمین علی حیدر عذرا الیاس کی باتوں پر ہولے ہولے مسکراتی رہتی اور تب اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی دن جب وہ ماسٹر کی ڈگری لے کر بابا کی اجازت سے ایک ذمے دار ادارے میں جاب بھی کرنے لگے گی تو اچانک ایک دن آپا دھماکا کر دیں گی۔

''ثمو! تمہارے لیے صفوان فتح خان کا پرپوزل آیا ہے۔''

''صفوان فتح خان یو مین ڈاکٹر صفوان فتح خان۔ سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ۔''

''تم جانتی ہو ان کو۔''

نازنین آپا نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں دیکھا تھا ایک بار بڑی زبردستی پرسنیلٹی ہے۔ ہی از اے ویری نائس مین۔''

اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے تھے۔ اور رخساروں پر دھنک اتر آئی تھی۔

''بابا کا کیا خیال ہے۔''

''بابا کا خیال؟''

نازنین نے اپنی اس بے حد نازک اور لاڈلی سی بہن کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں کو اور اس کے رخساروں پر پھیلتی دھنک کو اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''ثمو! میں بابا سے تمہاری سفارش کروں گی۔''

فرحین نے بھی اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹ اور چہرے پر اترتے دھنک رنگوں کو دیکھا تھا۔

''کیا ڈاکٹر صفوان فتح خان کی پرسنیلٹی اتنی ہی زبردستی ہے۔ افوہ اب تو اشتیاق ہو گیا ہے انہیں دیکھنے کا۔''

اور وہ دونوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی تھی اور حیران ہوتی رہی تھی کہ کبھی یوں بھی۔

یوں بھی لمحہ بھر کے لیے دل میں پیدا ہونے والی خواہش بھی پوری ہو جاتی ہے۔

اس روز یونیورسٹی سیمینار ہال کے باہر پروفیسر ممتاز ملک کے ساتھ کھڑے اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے صفوان فتح خان اس کی نگاہوں کے سامنے آگئے۔

ان کے پورے چہرے کو روشن کرتی ہوئی ان کی دلکش مسکراہٹ اور وہ خیال۔ وہ اپنی خوش نصیبی کا خیال تو یوں اس کے دل میں آیا تھا جیسے تیز ہوا سے کوئی کاغذ اڑتا ہوا آئے اور دوسرے ہی لمحے آگے نکل جائے۔ اس روز کے بعد اس نے پروفیسر صفوان فتح خان کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ عذرا الیاس اکثر ان کا ذکر کرتی تھی۔

اور اس کی تو عادت تھی۔ وہ اپنے ہر پروفیسر کے متعلق کوئی نہ کوئی ریمارکس دیتی رہتی تھی۔

اور جب وہ یونیورسٹی سے جا رہی تھی تو اس نے ہما صادق سے کہا تھا۔

''ہائے ہما! مجھے صفوان فتح خان کے متعلق ضرور بتانا کہ ان کی نظر انتخاب کہاں ٹھہری ہے کیا خبر وہ گوروں کے دیس سے ہی کوئی حسینہ پکڑ لائیں۔ ہائے ایسا ہوا تو بے چاری عذرا الیاس کا کانچ کا بنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ہاں اپنے وطن کی کوئی شہزادی ہو تو مجبوراً قابل قبول ہوگی۔''

اور وہ ہنسنے لگی تھیں۔

''ہاں اگر اپنے وطن کی ہزاروں سینکڑوں لڑکیوں کی توہین کی انہوں نے تو عذرا الیاس برداشت نہیں کر پائے گی۔ زہر پھانک لے گی ہاں۔''

اور ہما صادق نے اس کی پیٹھ پر دھموکا مارا تھا۔

''خدا کے لیے عجو تمہاری یہ بکواس اگر سلیمان بھائی سن لیں تو۔''

وہ ہما کے بھائی سے انگیجڈ تھی۔

اور اب اسے پتا چلے گا کہ صفوان فتح خان نے اسے پروپوز کیا ہے تو۔ تو کس قدر حیران ہوگی وہ۔

اور جس صفوان فتح خان کو ثمین نے کبھی نہیں سوچا تھا اب وہ مسلسل اسے سوچتی رہتی اور اس کے دل میں اتھل پتھل ہوتی رہی۔ بھلا صفوان فتح خان نے اسے ہی کیوں پروپوز کیا۔

اور کیا بیتے سالوں میں انہیں کوئی پسند نہیں آیا ہوگا۔

اور وہ ان کے اتنے سالوں کی تلاش کا حاصل ہے۔

وہ آئینے میں خود کو ہر ہر زاویے سے دیکھتی۔

یقیناً اس روز سیمینار ہال کے باہر کھڑے صفوان فتح خان اس پر دل ہار گئے ہوں گے۔ اور وہ تھی بھی اس قابل کہ اسے کوئی عمر بھر کی تلاش کا حاصل سمجھ لیتا۔ اور پتا نہیں بابا کیا فیصلہ کریں گے۔

وہ مضطرب تھی لیکن اسے یقین تھا کہ بابا کو وہ پسند آئیں گے۔ لیکن چند دنوں بعد نازنین اسے کے سامنے بیٹھی تھی۔

''چندا! تیرے قابل نہیں۔''

''کیا؟'' اس نے حیران ہو کر نازنین آپا کی طرف دیکھا۔

اتنا وجیہہ و جمیل شخص بڑی بڑی ڈگریاں باہر سے لانے والا۔ اتنا عالم۔ اس کے قابل نہیں۔

''بابا کو وہ پسند نہیں آیا۔ اس کے انداز میں بڑی رعونت ہے۔ اس کے لہجے کا غرور اور اس کی گردن کا تناؤ اور پھر۔''

نازنین آپی چپ ہو گئیں۔

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی وہ کوئی خاص شے نہیں لگا۔ بات کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے تمسخر اڑا رہا ہو۔''

''اتنا علم ہو اور اتنی ڈگریاں ہوں تو ذات میں ذرا سا غرور تو خود بخود آجاتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''اور یہ غرور ہی تو اس کی ذات کا حسن ہے۔''

''عمروں میں بہت فرق ہے۔''

بڑے بھیا کا خیال تھا۔

''وہ ایک سیلف میڈ آدمی ہے اور اس نے بہت غربت دیکھی ہے اور بہت دھکے کھائے ہیں۔ کسی بہت پسماندہ گاؤں سے تعلق ہے اس کا۔''

چھوٹے بھیا کی رائے تھی۔

''اور ایسے شخص دوسروں کی زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے رویوں میں بہت سخت ہوتے ہیں۔''

''سیلف میڈ ہونا تو اچھی بات ہے اور غریب ہونا، دیہاتی ہونا کوئی برائی نہیں۔''

وہ حیران ہو ہو کر سب کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اتنے اچھے اور اتنے بڑے دل والے بابا جانی کو کیا ہو گیا ہے۔ بابا تو انسان کی قدر کرتے تھے۔

''آپی!'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''بابا تو انسان کی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے تو کبھی ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ احسان بھائی کا پروپوزل جب آپ کے لیے آیا تو ان کا گاؤں سے متعلق ہونا یا غریب ہونا قطعی اہم نہیں جانا تھا۔ اور آپ نے دیکھا احسان بھائی کتنے اچھے ہیں۔ آپی پلیز ایک بار پھر آپ بابا سے بات کریں کہ وہ صفوان فتح خان کے پروپوزل پر غور کریں۔''

اپنے بے حد پڑھے لکھے بابا جانی کی شخصیت کی پرستار ثمین علی حیدر، صفوان فتح خاں کی علمی ڈگریوں سے متاثر تھی۔

صفوان فتح خان بھی بابا کے جیسا ہی ہوگا۔

وہ اس کے پورے چہرے کو روشن کرتی ہوئی مسکراہٹ۔

وہ ستائشی نظریں جو لمحہ بھر کو اس کے چہرے کی طرف اٹھی تھیں۔

''فرحین آپی!'' اس نے ان سے بھی التجا کی۔

''مجھے یہ شخص پسند ہے بہت باوقار اور بہت ایجوکیٹڈ۔''

''مگر ثمو! وہ تو تم سے دگنی عمر کا ہے۔''

''زیادہ عمر کے مرد اپنی بیویوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کانچ کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں اور میری ثمو بھی کانچ کی طرح نازک ہے۔''

صرف اماں کا ووٹ اس کی طرف تھا۔

''اور کیا بابا نے آپ کو سنبھال کر نہیں رکھا۔ کانچ کی طرح حالانکہ وہ تو آپ سے

دگنی عمر کے نہیں ہیں۔"

فرحین اماں کو اکثر چھیڑ جاتی تھی۔

"چل ہٹ۔" اماں شرما گئی تھی۔

"بابا جانی کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ ان چند دنوں میں صفوان فتح خان کے حوالے سے اس نے کتنے خواب دیکھ ڈالے تھے۔

"پاگل ہو تم شمو! وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں تم پر۔"

فرحین نے اسے سمجھایا۔

"بابا جانی کا تجربہ ہے وہ انسانوں کی پہچان رکھتے ہیں۔ اس شخص میں جھوٹی انا بہت زیادہ ہے۔"

"پتا نہیں کیوں اس شخص سے مل کر مجھے یہ خیال کیوں آیا کہ جیسے بھیڑیے نے بھیڑ کی کھال اوڑھ رکھی ہو۔"

چھوٹے بھیا کا تبصرہ بے لاگ ہوتا تھا۔

"وہ ناسمجھ ہے۔" بڑے بھیا نے فیصلہ دے دیا۔

"صفوان فتح خان کو انکار کر دیا جائے۔"

"وہ ناسمجھ ہے۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن میں ماسٹرز کی ڈگری لے کر بھی وہ ناسمجھ ہے۔ اور وہ جو پچھلے چھ ماہ سے ایک بڑے ادارے میں ایک ذمے دار پوسٹ پر ہے وہ ناسمجھ ہے۔

اور یہ جو اس کے کمرے میں، ڈرائنگ روم میں سارے گھر میں ادھر ادھر اس کے جیتے ہوئے کپ، ٹرافیاں، ایوارڈ اور شیلڈز پڑی ہیں، کیا یہ سب کوئی ناسمجھ لڑکی حاصل کر سکتی ہے۔"

وہ بضد تھی اور بابا جانی پریشان۔

اور پھر کتنے سارے دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔

ادھر سے تقاضے پر تقاضے تھے اور ادھر خاموشی تھی۔

اسے لگتا جیسے وہ ان چند ہفتوں میں صفوان فتح خان سے محبت کرنے لگی ہے۔ بہت

شدید، وہ صفوان فتح خان جسے دو سال قبل اس نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔

"وہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔" آخر اس نے نازنین آپی سے کہہ دیا۔

"شمو! تم نے اس شخص کو صرف ایک بار دیکھا ہے۔ ایک بار اس سے مل لو۔ بات کر کے دیکھ لو یقین کرو شمو تمہیں خود ہی محسوس ہو جائے گا کہ ہم سب صحیح ہیں۔"

وہ خاموش ہی رہی تب سب ہی ہار گئے۔

وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔

اور ضدی تھی۔

سب کی محبتوں نے اسے ضدی بنا دیا تھا۔

بابا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔

"شمو! پچھتانا نہیں۔ تھک جاؤ تو ہارنا نہیں۔ اور گھر بنانے کی کوشش کرنا۔"

تب اس نے کتنے اعتماد سے کہا تھا۔

"وہ بھلا پہلے کبھی ہاری ہے جو اب ہار جائے گی۔"

لیکن پہلی رات ہی اس شخص نے اس کی زبان کاٹ کر اپنے رکھ لی تھی اندر موسم سرما کی ٹھنڈی یخ ہواؤں نے جیسے ہمیشہ کے لیے بسیرا کر لیا تھا۔

اب جو سو ہو۔ اسے سر نہیں جھکانا تھا۔

"بڑا لمبا انتظار کروایا تمہارے والدین نے کیا۔ کوئی اور بھی تھا؟"

گھونگھٹ الٹتے ہوئے کسی شیریں جملے کی جگہ الفاظ کے پتھر اس کی جھولی میں آ گرے تھے۔

وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔

"یا پھر یہ باور کرانا مقصود تھا کہ ہم نے بڑی منتیں کروائی ہیں۔ ثمین بیگم! اس طرح عزتیں نہیں بنتیں۔ اور مجھے تو اتنے رشتے ملتے تھے۔ اتنی لڑکیاں میرے آگے پیچھے پھرتی تھیں لیکن پتا نہیں اس روز یونیورسٹی میں کیا ادا بھا گئی تھی تمہاری کہ دل نے کہا کہ اسے ہی اپنے نام کا فخر دو۔ حالانکہ تم ایسی لڑکیاں جو اتنی مشہور و معروف ہوں۔ وہ قابل اعتماد نہیں ہوتیں۔ اتنی سوشل اور ایکٹو۔"

ہر گزرتا دن اس کے اندر زخم کرتا جاتا تھا۔

اور وہ سوچتی۔

بڑے بھیا نے کتنا صحیح کہا تھا کہ وہ نا سمجھ ہے۔ ہیرا جان کر انگاروں پر ہاتھ دھر بیٹھی تھی اور اب خود سے بھی اعتراف کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔

اور کیا کوئی اس کے جیسا نادان ہوگا۔

صرف ایک روشن مسکراہٹ۔

اور ایک ستائش بھری نظر پر اس نے سب کچھ ہار دیا تھا۔

عمر بھر کی ریاضتیں اور فخر۔

ساری زندگی کا مان اور غرور اس شخص کے قدموں تلے کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

وہ اپنی شاگرد لڑکیوں کے متعلق ایسے ایسے قصے بیان کرتا کہ وہ حیران ہو کر اس وجیہہ مرد کو دیکھتی رہ جاتی۔

اور ایک وہ تھی عذا الیاس۔

''اری بے وقوف! عذرا تو مذاق کرتی تھی۔''

ہما نے بتایا تھا اتنے برسوں بعد۔

ایک روز شاپنگ سینٹر میں ہما صادق اچانک ہی اسے مل گئی تھی۔

''صفوان فتح خان سے۔''

اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

''ثمو! وہ اپنے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ والے مگر وہ تو۔ وہ تو۔''

اس نے تاسف نے اسے دیکھا تھا۔

''ہائے ثمو! تو اتنی نازک احساسات رکھنے والی اور وہ پورے بن مانس کیسے گزرتی ہے تیری۔ وہ تو بڑا چھچھورا سا مرد تھا۔ پتا ہے عجو بتاتی تھی کہ کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے جانے کہاں کہاں کے قصے گھڑ گھڑ کر سناتا تھا اور اپنی پارسائی کی کہانیاں اور اپنی کلاس کی لڑکیوں کو او باجی۔ او بہن کہہ کر بلاتا ہے۔ لیکن دیکھتا ایسے ہے جیسے۔ مائی گاڈ ثمو تو نے انکار کر دینا تھا۔ پتا ہے عجو تو بہت چڑتی تھی اس سے کہتی تھی جیسے انار کلی میں سوئیاں اور کلپ بیچنے والے لڑکے باجی۔ باجی کہہ کر پیچھے بھاگتے ہیں۔''

''مگر وہ تو۔'' وہ ہونٹ ہلا کر رہ گئی۔

''وہ تو پوری مسخری تھی۔ ایکٹنگ کرتی تھی۔''

اور اس کے صبیح چہرے پر زردیاں گھلنے لگیں اور اگر جو فرحین آپی یا نازنین آپی یہ تبصرہ سن لیتیں تو۔

خوش ہو؟'' ہما صادق نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہوں۔'' اس نے نگاہیں چرا لی تھیں۔

اب بھلا اپنا آپ ننگا کرنے سے فائدہ۔

''صفوان بہت اچھے ہیں اور بہت خیال رکھتے ہیں۔''

بابا جانی نے کہا تھا کہ ثمو پچھتانا نہیں۔

وہ پچھتانا نہیں چاہتی تھی۔ اور نہ ہی کسی کو اپنے زخم دکھانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ اور زبان گروی رکھ دی تھی۔

اور وہ چاہنے کے باوجود ہما صادق کو اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دے سکی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہما صادق کو یقین ہو جائے کہ صفوان فتح خان ایک چھچھورا مرد ہے۔

''کیسا گھر ہے تمہارا؟'' ہما نے پوچھا تھا

''بہت خوبصورت، بہت شاندار۔''

''عرفان نے بھی جوہر ٹاؤن میں پلاٹ لے لیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''بہت جلد ہم بھی اپنا گھر بنا لیں گے اپنے گھر کی خوشی ہی اور ہوتی ہے۔''

''خدا مبارک کرے۔''

''تم آنا کسی دن۔''

ہما نے بہت اصرار سے اسے گھر بلایا تھا اور اپنے فلیٹ کا ایڈریس سمجھایا تھا۔

''یار! میں کبھی کبھی عرفان سے تمہاری باتیں کرتی ہوں۔ اسے تم سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ ہم آئیں کسی دن تمہارے گھر۔''

اور اس نے اسے فوراً ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

اور پھر شاید خواہش کے باوجود وہ اس کے گھر نہ جا سکی تھی۔ اور پھر ایک دن شاید فرحین آپی یا نازنین آپی سے اس کا ایڈریس لے کر وہ اس سے ملنے چلی آئی۔

وہ اسے دیکھ کر پیلی پڑ گئی۔ شکر ہے عرفان اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"بہت بے وفا ہو تم۔ مجھے تم سے ایسی بے وفائی کی ہرگز امید نہیں تھی۔"

گلے شکوے کرتی وہ اس کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی کہ اس کی نند نے انہیں روک دیا۔

"پلیز ایک منٹ"

اور پھر دوڑ کر چادریں اٹھا لائی اور کارپٹ پر بچھا دیں۔ ہما نے اسے دیکھا اور پھر کارپٹ پر بچھی ہوئی چادروں کو دیکھا۔ ثمین نے نظریں چرا لیں۔

ایسے تماشے وہ روز دیکھتی تھی۔ وہ جتنا چھچھورا تھا اس کے گھر والے اسے سوا۔

"تمہاری نند کیا سائیکی کیس ہے۔"

ہما نے اس کے جانے کے بعد سرگوشی کی تھی۔

"پتا نہیں۔"

"کیا صوفے پر بیٹھا جا سکتا ہے یا اس کے بھی میلے ہونے کا خطرہ ہے۔"

ہما تو ہمیشہ کی تیز تھی۔ اس کی نند سر ہلاتی باہر چلی گئی تھی۔ مگر صفوان کے آنے پر کس قدر ہنگامہ ہوا تھا۔

"بھابھی کی سہیلی نے مذاق اڑایا ہے۔"

اس نے فوراً ہی شکایت جڑ دی تھی اور وہ منہ سے جھاگ اڑا اڑا کر گھنٹوں بولتا رہا تھا۔

"چیزیں اتنی آسانی سے نہیں بنتیں۔ یہ کارپٹ جو ڈرائنگ روم میں ہے۔ مارکیٹ میں سب سے قیمتی تھا۔ اور یہ صوفے۔"

"افوہ!"

اس نے کان بند کر لیے تھے۔ گھر کی سب اشیاء کی قیمتیں اتنی دفعہ اسے بتائی جا چکی تھی کہ اب اسے ازبر ہو گئی تھیں۔ اور بغیر سوچے ہر شے کی قیمت بتا سکتی تھی۔

بلیک ڈنر سیٹ۔ اٹھارہ ہزار کا۔

سفید ڈنر سیٹ دس ہزار کا۔

سٹنگ روم کا کارپٹ۔ اک سو پینسٹھ روپے مربع فٹ۔

ٹی وی لاؤنج کا فرنیچر پچیس ہزار کا۔

اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہما کے سامنے وہ کتنی شرمندہ ہوئی تھی۔ چینی کے شربت میں دو قطرے روح افزا کے ڈال کر اسکوائش کے نام پر جب اس کی نند نے سامنے رکھے اور پھر چائے کے ساتھ چھ بسکٹ گن کر ایک پلیٹ سجا دی گئی تو ذرا سی دیر کو اس کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے۔

اور یہ ہما کیوں آ گئی تھی اسے شرمندہ کرنے۔

لیکن بظاہر وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔

"یار! تیری جاب تو اتنی اچھی تھی کیوں چھوڑ دی۔"

"بس وہ صفوان کو پسند نہ تھا کہ میں جاب کروں۔"

اب وہ کیا بتاتی کہ جاب کے نام پر کیسے کیسے طعنے سنے تھے۔

"اتنی کم عمری میں اتنا بڑا عہدہ۔ یقیناً ذہانت اور تجربے سے زیادہ حسن صورت نے کام کیا ہوگا۔"

وہ تیر چلانے میں ماہر تھا اور کوئی بھی تیر رائیگاں نہیں جاتا تھا۔

"تمہاری وجہ سے آفس کے ماحول میں تو خوب رنگینی ہو گئی ہوگی۔"

وہ تاک تاک کر نشانے لگاتا تھا۔

"اور تمہارا ڈائریکٹر جنرل سنا ہے بیچلر ہے۔ بالکل ینگ۔"

وہ چپ چاپ سنتی رہتی۔

کبھی کبھی وہ مہربان بھی ہو جاتا تھا لیکن اس کے وجود میں اس کی محبت حرارت پیدا نہ کرتی۔ وہ پہلی رات کو کہے گئے جملے میخیں ٹھونکنے لگتے۔ ٹھک ٹھک اس کے اعصاب پر ہتھوڑے بجتے رہتے۔

"کیسی ٹھنڈی ٹھار عورت ہو تم۔"

وہ جھنجلا جاتا اور چھچھوری باتیں کرنے لگتا۔

وہ اور بھی برف ہو جاتی۔

"کچھ تو ہوگا کوئی وابستگی، کوئی محبت، آخر اتنی خوبصورت اتنی پاپولر تھیں تم۔"

وہ تین چار روز بعد اپنی بات دہراتا تھا۔

اور یہ ایک جملہ ساری زندگی ہی اس کے وجود میں اذیتیں اتارتا رہا۔

''خیر نہ بتاؤ'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔ تمسخر اڑاتی مسکراہٹ۔

زخم زخم کرتی۔

''میں جب لیبیا میں تھا تو وہاں میری ایک اسٹوڈنٹ تھی فاطمہ۔''

وہ پینترا بدل کر اپنی لو اسٹوری سنانے لگتا اور وہ سر جھکائے اچھی بیوی بنی سنتی رہتی۔

کتنا حوصلہ تھا اس کا۔

شادی کے ابتدائی چند مہینوں میں ہی وہ پچاس لڑکیوں کے قصے سن چکی تھی۔

''اور کیا دیکھا تھا اس نے؟''

فرحین آپی نے سچ ہی کہا تھا۔

''تھکنا نہیں ثمو! کہ یہ منزل تمہاری منتخب کردہ ہے۔''

سو وہ محض اپنی بات نبھانے کے لیے چل رہی تھی۔ ورنہ تو پہلے قدم پر ہی تھکنے لگی تھی۔ اور شکر تھا کہ اس کے گھر سے کوئی کم ہی ادھر آتا تھا۔ ورنہ اس کے چہرے پر لکھی تھکاوٹیں پڑھ لی جاتیں۔

بابا جانی بیٹیوں کے گھر جانا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

چھوٹے بھیا اور بڑے بھیا اس سے دل میں خفا میں تھے۔ کبھی کبھار اسے لینے آتے تو کھڑے کھڑے۔

فرحین آپی اور نازنین دوسرے شہروں میں تھیں۔ آتیں تو وہ خود ہی ملنے پہنچ جاتی۔ صفوان کو اس کا میکے جانا بھی پسند نہ تھا۔ سو کم ہی جاتی تھی۔ بابا جانی کی گہری نظریں اس کے اندر تک جھانک آتی تھیں۔

''ٹھیک ہو ناں بیٹا۔''

''جی۔'' وہ نظریں جھکا لیتی۔

''نئے گھر میں شروع میں ایڈجسٹ ہونے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن ہولے ہولے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

وہ اسے کچھ جتائے بغیر حوصلہ دیتے تو جیسے ڈھیروں گلوکوز اس کے اندر اتر جاتا۔ وہ نئی توانائی کے ساتھ واپس آتی تو پھر وہی مشقت۔

وہی تھکا دینے والا بیزار کن سفر۔

جس کے اختتام کی کچھ خبر نہ تھی۔

محتسب بہت سے تھے اور انصاف کرنے والا کوئی نہ تھا۔

''آج کل جاب ملنا آسان تو نہیں۔'' چھوٹا دیور جتاتا۔

''اور بھابھی نے خواہ مخواہ جاب چھوڑ دی۔ دس ہزار ماہوار۔''

''اتنے خرچے ہیں اس گھر کے اور ایک اکیلا کمانے والا۔'' ساس کیوں پیچھے رہتی۔

''ابھی دو دو بیٹیوں کا بوجھ اتارنا ہے۔''

''جانے مجھے کب جاب ملے گی۔'' دیور کن اکھیوں سے اسے دیکھتا اور وہ بنا جواب دیے کام کرتی رہتی۔

صفوان کا خیال مختلف تھا۔

''جاب کرنے والی لڑکیاں شریف نہیں رہ سکتیں اور میرے پاس بہت پیسہ ہے۔''

کبھی کبھی وہ اپنے بینک کے حساب کتاب اسے دکھاتا۔

''لیبیا میں میں نے بہت کمایا ہے۔ اور پتا ہے ایک بار ایک عورت نے مجھے۔''

اور اس کی گھٹیا باتیں شروع ہو جاتیں۔

''تمہیں تو اس بات پر بہت خوشی ہوتی ہو گی کہ تمہارے شوہر کے پاس بہت پیسہ ہے۔''

''کیا پیسہ ہی خوشی ہوتی ہے۔'' وہ اپنے آپ سے پوچھتی۔

اور خوشی۔ اس کی خوشی تو سہاگ رات اس ایک جملے نے ہی مار دی تھی۔ پھر پیچھے کیا رہ گیا تھا۔

خالی وجود۔

بھاں بھاں کرتا۔

بے روح ڈھانچہ۔

''تم انتہائی بے حس عورت ہو۔'' وہ ریمارکس پاس کرتا۔

''کہیں کسی سابقہ محبت کا سوگ تو نہیں مناتی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو خوشی سے پھول کر کپا ہو جاتی کہ اتنے بڑے گھر میں رہتی ہے اور اس کے شوہر کے پاس اتنا پیسہ ہے۔''

حالانکہ اس نے کتنا چاہا تھا کہ وہ کوئی عورت بن جائے۔

اور اپنی سی کوشش بھی کرتی تھی۔

پھر بھی صفوان کو شکوہ تھا کہ وہ سب عورتوں کی طرح نہیں ہے۔

حالانکہ اسے تو کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ کہ کبھی وہ کیا تھی۔

اپنی ساری صلاحیتیں جیسے اس نے اپنی ٹرافیوں اور انعامات والے کارٹن میں بند کر دی تھیں۔ جنہیں آج تک اس نے کھولا بھی نہیں تھا۔ اور اس نے اپنے آپ میں اور ایک دیہاتی ان پڑھ عورت میں کبھی فرق محسوس نہیں کیا تھا۔ جو شوہر کی مار کھا کر بھی اس کے پاؤں دباتی ہے۔

اس کے بچے پیدا کرتی ہے۔

اور اس کی گالیاں سنتی ہے۔

وہ بھی تو اس کی گالیاں سنتی تھی۔

سابقہ محبتوں اور وابستگیوں کے طعنے گالی ہی تو تھے اس کے لیے۔

اور یہ سب گالیاں برداشت کرتے کرتے سچ مچ اس کا وجود پتھر کا ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ تو شیشے سے بھی زیادہ نازک تھی۔ چاروں بہن بھائیوں کی لاڈلی تھی وہ ذرا کوئی انگلی بھی لگا دیتا تو بھاں بھاں کر کے رونے لگتی تھی۔

کہیں معمولی سی خراش آ جاتی تو اسے دیکھ دیکھ کر روتی۔

اور اسے بہلانے کے لیے بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کبھی کولڈ کریم لگاتے کبھی پاؤڈر چھڑکتے۔ تب بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ بابا جانی اسے چڑاتے تھے۔

فرش مخمل پہ میرے پاؤں چھلے جاتے ہیں
کیلا کھانے سے میرے دانت ہلے جاتے ہیں

"ہماری نازک سی بیٹی ہے۔ یہ بالکل اسی شہزادی کی طرح جسے سات گدوں کے نیچے پڑے باجرے کے دانے کی چبھن نے رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔"

اور اب تو سارے بستر پر کانٹے اگ آئے تھے۔ اور وہ اس کانٹوں بھرے بستر پر سو رہی تھی۔

لہولہو بدن کے ساتھ ہونٹ سیئے بیٹھی تھی۔

اور بابا کو پتا چلے تو وہ کتنا حیران ہوں۔

وہ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھتی جو جگہ جگہ سے جلے ہوئے تھے۔ اسے تو کچن میں جانے کی عادت ہی نہیں تھی۔

سب فرحین اور نازنین آپی کر لیتی تھیں۔

یہ نہیں کہ وہ کھانا پکانا نہیں جانتی تھی لیکن بڑی بہنوں کی موجودگی میں اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اور یہاں اتنے بڑے خاندان کے لیے وہ اکیلی کھانا پکاتی۔

برتن دھونے سے لے کر گھر کی صفائیوں تک کا سب کا۔ پھر بھی کوئی خوش نہ تھا۔

اور وہ کیسے ان کو خوش کرے۔ ان سب کو۔

وہ ان سب کو خوش کرنے کی کوشش میں تھکی جا رہی تھی اور حقیقت میں وہ ایک شخص بھی اس سے خوش نہ تھا جسے خوش رکھنا اس کا فرض تھا۔

پتا نہیں اس نے اس سے شادی کیوں کی تھی۔

کئی دفعہ اس کی جی چاہا وہ اس سے پوچھے لیکن پھر اسے لگتا جیسے وہ کبھی کچھ نہ پوچھ سکے گی۔

سوال کرنے کا حق اس کے پاس تھا ہی نہیں۔

یہ حق تو روز اول ہی صفوان فتح خان نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

"سنو۔" اس روز وہ بڑے موڈ میں تھا۔

جب میں نے پہلی بار تمہیں اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا ناں تو ادھر دل میں کچھ ہوا تھا۔ اور میں مسلسل تمہیں دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر جب ممتاز ملک نے تمہارا تعارف کروایا تو میں نے سوچا تھا بھلا یہ ممکن ہے کہ یہ لڑکی۔

اور مجھے یقین تھا کہ تمہارے والدین انکار کر دیں گے۔ سو میں نے بغیر اپنی خواہش کا اظہار کیے جرمنی چلا گیا۔ اور واپس آ کر ایک دن یونہی ممتاز سے شادی کی بات ہو رہی تھی تو میں نے تمہارا ذکر کیا۔ اور ممتاز نے مشورہ دیا کہ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔؟

آج کل رشتوں کا مسئلہ ہے۔ جب آدمی میں اتنی خوبیاں ہوں تو پھر عمر کا اتنا خیال نہیں کیا جاتا اور ممتاز کا خیال ٹھیک ہی تھا۔"

اور وہ اتنی خوبیاں، اپنی دو سالہ ازدواجی زندگی میں ابھی تک دکھائی نہ دی تھیں مثلاً

وہ کیا خوبیاں تھیں۔ وہ سر جھکائے سوچنے لگی۔

''ارے اتنی سامنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اب تک۔'' صفوان نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

''یعنی تم اور ممتاز، ممتاز اور تم۔''

اس کی آنکھوں میں لومڑی کی آنکھوں کی سی چمک تھی۔

''تو آج تم پکڑی گئی ثمین بیگم'' اس نے قہقہہ لگایا۔

کیسا بھیانک قہقہہ تھا۔ جیسے قہقہہ نہ ہو نیپام بم ہو۔ وجود سے آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ اور آنکھیں یک دم انگارہ ہو گئیں۔

''میں بھی حیران تھا بھلا تم ایسی لڑکی اور وہ کسی کی Beloved نہ ہو اور...... آہاہا ثمین علی حیدر۔''

جب وہ اس طرح کے موڈ میں ہوتا تو اسے پرانے نام سے بلاتا تھا اور اس کے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش وہ ہمیشہ ثمین علی حیدر ہی رہتی کبھی ثمین فتح خان نہ بنتی۔

''تو پروفیسر ممتاز صاحب تھے تمہارے سابقہ لور۔''

''نہیں۔'' اس نے سختی سے دانت ایک دوسرے پر جما لیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں بھاگ رہی ہو۔''

اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔

''کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ ماضی کی کہانیاں۔ آخر ہم بھی تو بتاتے ہیں تمہیں سب کچھ۔ آخر ایک ادب کا پروفیسر۔ اور ایک ہمہ صفت لڑکی۔ ہائے۔''

اس نے چٹخارہ لیا۔

''کیا گفتگو ہوتی ہوگی تم دونوں کے درمیان۔''

''صفوان صاحب! پلیز ہر ایک کو اپنے جیسا مت سمجھیے۔''

برداشت کی لگامیں ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔

مگر یہ بے صبری اسے بہت مہنگی پڑی۔

اس کے بازوؤں پر بجھنے والے سگریٹوں نے بار بار اسے یاد دہانی کرائی کہ وہ اپنی

زبان گروی رکھ چکی تھی۔

''تمہارے میکے والوں نے شکر کیا ہے کہ تم سے جان چھوٹی۔'' وہ اسے طعنے دیتا۔

کسی نے تمہاری کبھی خبر نہیں لی۔

اور اب اسے کیا خبر تھی کہ وہ خود ہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہاں آئیں اور...... اپنوں کو دیکھ کر وہ بے صبری ہو جائے۔

''ممتاز کا جی بھر گیا ہوگا ناں تم سے اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا تھا ٹرائی کرنے کا۔''

اپنے اتنے محترم استاد کا اس طرح کا ذکر کوئی خنجر سا سینے میں اتار دیتا۔

گہرائی تک درد ہی درد پھیل جاتا۔

پتا نہیں کیا آسا تھی۔

کون سی امید تھی جس کے سہارے وہ یہ درد برداشت کر رہی تھی۔ کیا وہ کبھی بدل جائے گا۔

اور بابا جانی نے کہا تھا۔

ابتدا میں ہر لڑکی کو مشکل ہوتی ہے پھر ہولے ہولے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

اور کیا سب کچھ ٹھیک ہونے تک وہ بچ رہے گی۔ یا ختم ہو جائے گی۔ پتا نہیں۔ کبھی جب اس کے لہجے میں محبت کا رنگ جھلکتا تو جیسے اندر کہیں جلتے زخموں پر کوئی مرہم رکھ دیتا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ بے دردی سے جیسے زخم پر رکھی پٹیاں کھینچ لیتا اور زخم مزید چھل جاتے؟

افوہ! کب ختم ہوگا یہ عذاب۔

ہر روز وہی ایک سی روٹین۔

وہی ایک سے سوال۔

وہی چھچھوری کمینی باتیں اور کب تک برداشت کرے گی وہ سب۔

اور کیا پتا آنے والی روح اس کو بدل دے۔ صفوان فتح خان کو۔

''بی بی! ہمیں تو بیٹا چاہیے۔''

کیسی جاہلانہ بات تھی بھلا یہ اس کے اختیار میں تھا۔

''ہمارے خاندان میں پچھلی سات پشتوں سے پہلا بیٹا ہی ہوتا آ رہا ہے۔ بعد میں

چاہے لڑکیاں آ جائیں۔''

اس کی ساس نے بڑے تفخر سے بتایا۔

''میرے بھی پہلے تین بیٹے ہوئے پھر بیٹیاں اور میری ساس کے بھی پہلے دو بیٹے ہی تھے۔''

صفوان! ایجوکیٹڈ آدمی ہے۔ وہ ایسی جاہلانہ باتوں پر بھلا کیا یقین رکھتا ہوگا۔

اسے یقین تھا لیکن ڈگریاں بعض اوقات آدمی کو ایجوکیٹ نہیں کرتیں۔ اور صفوان فتح خان کا ڈگریوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کے کسی جاہل مزارعے سے زیادہ جاہل تھا۔ سو اس نے کئی دن تک بیٹی کی شکل نہ دیکھی۔

''ہمارے ہاں تو پہلا بیٹا ہی ہوتا ہے پھر نہ جانے کس کی بیٹی ہے۔'' اس نے برملا کہہ دیا۔

ایک اور خنجر وجود میں گڑ گیا لیکن وہ ہونٹ سیئے بیٹھی رہی کہ اس کے میکے سے سب آنے والے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی اماں کا فون آیا تھا۔ پھر سب آ گئے اور وہ ہنستی رہی۔

بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کی کوئی بیٹی نہ تھی۔

فرحین کے بھی دو بیٹے تھے۔ اور نازنین کی اولاد ہی نہ تھی سو خاندان کی پہلی نواسی۔

''اسے تو میں اپنی بہو بناؤں گا۔''

بڑے بھیا نے اسے گود میں لے کر پیار کیا۔

''جی نہیں میرا حق زیادہ ہے۔''

فرحین نے اسے لے لیا۔'' اور پھر میرے بیٹے اور اس کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ تو یہ نہیں جچے گی۔ آٹھ سال کا فرق بڑھا لگے گا۔'' اس نے چڑایا۔

صفوان نے ہاتھ میں پکڑی پیالی زور سے میز پر پٹخی اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ پیلی ہو گئی۔

''یہ صفوان کو کیا ہوا؟''

سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ اور اس نے اپنے آنسو برفاب کر کے اپنے اندر اتار لیے۔ جانتی تھی کہ فرحین آپی کی بلا ارادہ کہی گئی اس بات کا حساب اسے دینا ہوگا۔

اور اسے لگتا تھا جیسے وہ ساری زندگی اب حساب ہی دیتی رہے گی۔ اور سب کے جانے کے بعد وہ لیٹ گئی تھی اور صفوان کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں موند لی تھیں تا کہ وہ اسے سوتا سمجھ لے۔ کم از کم آج کے دن جب وہ اپنوں کی محبتوں کے سائے میں کچھ دیر تک رہی تھی۔ وہ اسی خوشی کو بے رنگ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے قطرہ قطرہ کر کے پینا چاہتی تھی۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا سب اس کے کمرے میں تھے اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ چھوٹے بھیا بھی جو زیادہ تر سنجیدہ رہتے تھے۔ اور جب جاتے جاتے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور پوچھا تھا۔

''شمو! خوش تو ہو ناں۔ صفوان تمہارے ساتھ صحیح تو ہے ناں۔''

وہ حرارت اور حدت جو ان کے لہجے میں تھی۔

محبت کی وہ گرمی جو ان کی آنکھوں میں لو دے رہی تھی۔ اس نے اندر تک جمی برف کو لمحوں میں پانی کر دیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے پانیوں کو آنکھوں تک نہیں آنے دیا تھا۔ اور مسکرا دی تھی۔

''جی چھوٹے بھیا! خوش ہوں۔''

اور یہ دو لفظ کہنے کے لیے کتنی مشقت کرنا پڑی تھی اسے۔ اور اب آنکھیں موندے نڈھال سی پڑی تھی اور اندر پانیوں نے طغیانی مچا رکھی تھی۔

بابا جانی چپ چپ سے جانے اس کے چہرے میں کیا کھوجتے رہے تھے اور جب بھی اس کی نظریں ان کی کھوجتی نظروں سے ملتیں تو وہ فوراً دوسری طرف دیکھنے لگتی تھی۔

''بس فیصلہ ہو گیا۔ یہ میری بہو بنے گی۔''

چھوٹے بھیا نے جاتے جاتے کہا تھا۔

آنکھیں موندتے ہی وہ ایک دم مسکرا دی اور صفوان نے بازو میں ناخن چبھو کر اسے اس خواب سے بیدار کر دیا۔

''تمہارے والدین کو چاہیے تھا کہ تمہارے لیے کسی ینگ آدمی کو دیکھ لیتے مجھ بڈھے سے کیوں بیاہا تمہیں۔''

''مگر۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

"اور وہ تمہاری بہن کا میاں مرد ہے کوئی۔ دیکھو تو دل چاہتا ہے کہ بانہوں میں لے کر مروڑ دو۔ عورت ہے وہ تو۔"

فرحین کے میاں کلین شیو تھے۔

اس نے بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹے۔

"اور اپنی بہن سے کہنا۔" میں اس کے میاں سے زیادہ جوان ہوں۔"

اس کا دل چاہا کاش کوئی اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دے اور وہ ہمیشہ کے لیے بہری ہو جائے۔ اور آج کے بعد اس کی کوئی بات نہ سن سکے۔

اس نے کروٹ بدل لی۔ اور وہ غصے سے ان سب کی لائی ہوئی چیزیں ادھر ادھر پھینکنے لگا۔

"یہ لائے ہیں تمہارے بھائی۔ اتنے بڑے آفیسر۔"

وہ ایک ایک چیز پر تنقید کرتا رہا۔

کئی خوبصورت کھلونے اس کے قدموں تلے آ کر چرمر ہو گئے۔" اور یہ ایک عمر کا عذاب ہے۔

تمہیں اپنی ذات پر بہت اعتماد تھا۔ اور اپنی سمجھ پر بھروسا اس نے خود سے کہا۔

"اب بھگتو۔"

آنکھیں جلتی رہیں اور وہ بک جھک کر دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔

کیسی مشکل زندگی تھی اور اسے عفان فتح خان نے آ کر اور بھی مشکل بنا دیا تھا۔

عفان فتح خان۔

اس کا بڑا دیور۔

جو اس کے ولیمے کے دوسرے دن ہی باہر چلا گیا تھا۔ اب ڈھائی سال بعد لوٹا تھا۔

بے شمار تحفے نرمین کے لیے اور اس کے لیے لایا تھا۔

اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف۔

کیا یہ اسی گھر کا فرد ہے۔ وہ حیران ہو کر سوچتی۔

"بھابھی! میں نے آپ کو شادی سے پہلے دیکھا تھا۔ دو تین بار گورنمنٹ کالج کے اسٹیج پر الحمرا آرٹس کونسل میں۔ اور ہم دوست شرطیں لگاتے تھے کہ فرسٹ پرائز آپ کا ہی ہو

گا۔ اور جب میں نے آپ کو دیکھا ناں شادی والے دن تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ شین علی حیدر میری بھابھی بنی ہے۔ مجھے بہت فخر محسوس ہو رہا تھا۔"

"اور بھائی۔" وہ صفوان کو بتاتا۔

"بھابھی بڑی زبردست ڈبیٹر ہوا کرتی تھیں۔ آپ کو پتا ہے۔"

وہ جتنا کچھ اس کے بارے میں جانتا تھا۔ صفوان کو بتاتا اور نرمین کو اٹھا کر بازوؤں میں اچھالتا۔

"اور بھابھی! کیا اب بھی شاعری ہوتی ہے۔"

وہ وقت بے وقت اس کے کمرے میں چلا آتا تھا۔

"نہیں۔" وہ مختصر جواب دیتی تھی۔

"آپ کچھ بیمار ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"پھر اتنی چپ چپ اور خاموش کیوں رہتی ہیں۔"

"یوں ہی عمر کا تقاضا ہے۔"

"اتنی بوڑھی تو نہیں ہوئیں۔"

اس کا قہقہہ چھت پھاڑتا تھا۔

"ہنسا کریں بولا کریں بھابھی جان! میں تو سوچ رہا تھا آپ سے خوب خوب مباحثے ہوا کریں گے۔ کچھ شعر و شاعری ہو گی کرکٹ کے میچز آپ کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا کریں گے۔ میرے علاوہ کسی کو کھیلوں سے دلچسپی نہیں۔ لیکن بھئی آپ نے بہت مایوس کیا۔"

اس روز اسٹور کی صفائی ہو رہی تھی۔ جانے کیسے وہ کارٹن کھل گیا تھا جس میں اس کے جیتے ہوئے کپ، ٹرافیاں، شیلڈز اور ایوارڈ تھے اور بابا جانی نے شادی کے کچھ دنوں بعد اسے بھجوا دی تھیں۔"

"کیا ضرورت تھی بابا جانی۔"

"بھئی وہ تمہارا فخر تھے۔ انہیں تمہارے گھر میں ہی سجنا چاہیے تھا۔ چمکتے دمکتے سنہرے روپہلے کپ اور ٹرافیاں زمین پر بکھر گئیں۔ عفان چمکتی آنکھوں کے ساتھ اٹھا اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔

''ارے انہیں بند کر کے کیوں رکھا ہوا ہے۔ انہیں تو نمایاں جگہوں پر سجنا چاہیے۔''

اور پھر اس کے منع کرنے کے باوجود اس نے ان کپوں اور ٹرافیوں کو ڈرائنگ روم کے شوکیسز اور اس کے بیڈروم کے کارنر ٹیبل پر سجا دیا۔

صفوان نے ناگواری کا اظہار کیا لیکن کچھ دن تک زبان سے کچھ نہ کہا مگر پھر ایک دن شامت آ گئی۔ اس روز ہما اور عرفان ملنے آ گئے تھے۔

ہما اس کی تعریف کر رہی تھی اور عرفان ڈرائنگ روم میں سجے اس کے انعامات دیکھ رہا تھا۔ اس کی ستائشی نظروں نے کئی بار اسے سراہا۔

صفوان کی تیز نظریں عرفان کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اور پھر ان کے جانے کے بعد سب انعامات صحن میں تھے۔

''عورت کا فخر یہ لوہے کے ٹھیکرے نہیں ہیں اس کا عورت پن ہے اور تم میں کیا ہے۔ اور تم عورت ہو؟ کوئی عورت پن نہیں ہے تم میں۔ کھوکھلی بے حس جیسے لکڑی کو چھو لو یا تمہیں۔ مرد کو تو عورت چاہیے ہوتی ہے۔ مکمل عورت۔ کسی کھلاڑی، ڈبیٹر کی ضرورت نہیں ہوتی اسے۔''

اس نے صحن سے کپ، ٹرافیاں اکٹھی کیں اور کام والی کو دے دیں۔

اس رات وہ دیر تک فون پر کسی سے باتیں کرتا رہا۔

دیر تک عشق و محبت کا کھیل جاری رہا۔

کیسی ہوتی ہیں یہ عورتیں جو یوں آدھی آدھی رات تک اور پتا نہیں کون۔

کیسی غلیظ اور ننگی باتیں۔

اس نے کانوں پر تکیہ رکھ لیا لیکن چچ چچ کی آوازیں مسلسل اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔

بڑی دیر بعد اس نے گفتگو ختم کی۔ وہ آنکھیں موندے پڑی تھی۔

''شمو! لہجے میں رس گھلا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چہرا جذبات کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

''بڑی بھرپور لڑکی ہے۔ ایک تم ہو کیسی پتھر؟''

پتھر وہ تو آئینہ تھی۔

اور کرچی کرچی ہو گئی تھی۔

اور شاید ان کرچیوں سے جو ثمین بنی تھی، وہ پتھر تھی۔

''کیا تم نے بھی کبھی اس طرح فون پر کسی سے باتیں کی ہیں۔''

''نہیں۔''

''کبھی تو سچ بول دیا کرو ثمین جان۔''

وہ خاموش ہی رہی۔ وہ اسے گھورتا رہا۔

اور اس کے لیے، اس مرد کے لیے اس نے بابا جانی کا دل دکھایا تھا۔

فرحین آپی اور نازنین آپی۔

اور شاید چھوٹے بھیا نے صحیح کہا تھا۔

بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا۔

چھوٹے بھیا کے گھر منی سی گڑیا آئی تھی۔ وہ بڑے دنوں بعد گھر آئی تھی۔

کیسی پاکیزہ سی فضا تھی اس کے میکے گھر کی۔

نازنین آپی اور فرحین آپی بھی تھیں۔

زمین کو تو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ تو بس اماں کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے بہت دیر تک لیٹی رہی تھی۔

کتنا سکون تھا۔

''شمو! تو کتنی کمزور اور پیلی ہو رہی ہے۔'' اماں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

''زمین راتوں کو جگاتی ہے، ناں اس لیے۔''

''اپنا خیال رکھا کر کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کروا۔ اس طرح تو کوئی نہیں ہوتا۔ پہچانی ہی نہیں جاتی ہو۔''

''شمو! تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو۔'' فرحین کو دکھ ہو رہا تھا۔

''اپنا آپ بھلا دیا ہے تم نے۔ آخر ہمارے بھی بچے ہوئے تھے۔''

''آئینے میں شکل دیکھو اپنی۔ رنگت کیسی ہو رہی ہے تمہاری۔'' نازنین آپی نے ڈانٹا۔''

وہ سب کی محبتوں کو گھونٹ گھونٹ پیتی رہی۔ بابا جانی کو دیکھ کر اس کا جی چاہا وہ ان کے گلے سے لگ جائے۔ اور ڈھائی برسوں کے جمع کیے ہوئے آنسو بہا کر ان سے کہے۔

''بابا جانی! میں ہار گئی ہوں۔ اور اب مزید مجھ سے چلا نہیں جاتا۔''

لیکن وہ اپنی قوتیں اکٹھی کر کے ایک بار پھر اذیت کدے میں لوٹ آئی جہاں کسی نجات دہندے نے نہیں آنا تھا۔ ہوں میں بھی اذیت کدے میں۔ مگر نہیں ہوں۔

وہ نرمین کو کاٹ میں لٹا رہی تھی کہ عفان آ گیا۔ خلاف معمول سنجیدہ تھا۔

''کیسی ہیں آپ۔''

''اچھی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''اور ہماری گڑیا؟'' وہ کاٹ پر جھک گیا۔

''تین دن یہ نہیں تھی تو گھر پر دل ہی نہ لگا۔''

''ارے جگانا نہیں ابھی سوئی ہے۔''

''بھابھی!'' وہ کاٹ کے پاس سے ہٹ آیا۔ مجھے لگتا ہے آپ خوش نہیں ہیں۔ ہمارے گھر میں۔''

''تمہارا وہم ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ویسے آپ کا اور صفوان بھائی کا کوئی جوڑ نہ تھا۔''

وہ بھی چھوٹے بھیا کی طرح بے لاگ تبصرہ کرتا تھا۔

''آپ کے والدین نے بڑا ظلم کیا۔''

والدین نے یا خود اس نے۔ یہ ظلم تو خود اس نے کیا تھا۔ اپنے اوپر۔ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اور محض ایک نظر۔

ایک وجیہہ شخص بظاہر کس قدر سوبر اور باوقار اور اندر سے کتنا گھٹیا اور چھوٹا۔

''اس روز ان کا رویہ انتہائی نامناسب تھا آپ کے ساتھ۔ میں نے بعد میں ان سے کہا بھی تھا۔''

''اپنے اپنے نظریے ہوتے ہیں۔ انہیں ایسی لڑکیاں پسند نہیں جو اتنی بااعتماد ہوتی ہیں۔ ہر جگہ آگے۔''

اس نے رسان سے کہا۔

''پھر انہوں نے آپ سے شادی کیوں کی؟'' اس کی آنکھوں میں واضح حیرت تھی۔

''میں تو سمجھ رہا تھا آپ کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے۔''

''خوبیاں یا خامیاں۔'' زیر لب اس نے کہا اور سوچا۔ ایک لمحے کے لیے پیدا ہونے والی خواہش کی اتنی طویل سزا۔

عفان غیر ارادی طور پر صفوان کے سلوک کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔ اور ثمین کو لگتا جیسے بند زنداں میں کہیں روزن کھل گیا ہو۔

اس روز عفان کی کسی بات پر بے اختیار ہنس پڑی۔ اور پھر فوراً ہی خوفزدہ ہو گئی۔

اپنی ہی ہنسی اسے بڑی عجیب لگی۔ کتنے سالوں بعد ہنسی تھی وہ۔

جیسے صدیاں گزر گئی تھیں اسے ہنسے ہوئے۔

''کبھی کبھی ہنس لینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' عفان نے مشورہ دیا۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ ہنسنے سے خون پیدا ہوتا ہے۔''

اور اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کی نظر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے صفوان پر پڑی۔ خون اگلتی آنکھیں، جیسے کوئی درندہ۔

اس نے جھرجھری سی لی۔

''بھائی جان آج آپ جلدی آ گئے۔'' عفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی۔''

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے دانت پیسے۔

''اوکے۔ باقی کی کہانی پھر مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

دراصل عفان اسے ایک دلچسپ قصہ سنا رہا تھا۔

''تو میری عدم موجودگی میں میرے بھائی کو پھنسایا جا رہا ہے ثمین بیگم۔''

انسانیت کی اتنی تذلیل۔

اس نے لب بھینچ لیے کہ کہیں اس کے منہ سے کچھ نکل نہ جائے۔ اور سفر ادھورا رہ جائے۔

''ادھر دیکھو۔''

اس نے بازوؤں سے پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ اس کی انگلیاں بازوؤں میں دھنسی جا رہی تھیں۔

آپ کی اپنی سوچ کا گھٹیا پن ہے یہ۔"

بالآخر بے شمار تیر دل میں اتارنے کے بعد اس نے لب کھولے۔ اور اس کا لب کھولنا قیامت ہو گیا تھا۔

"گھٹیا تو تو ہے، جوان مرد کو دیکھ کر پھسل گئی ہے کیا میں۔" اس کے ہونٹ غلاظت میں لتھڑ گئے تو وہ چپ چاپ نرمین کو اٹھا کر باہر آ گئی۔ باہر برآمدے میں عفان شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"سوری بھابھی!" اس سے نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

اب سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

اور جب سرطان پھیلنے لگے تو سرطان سے متاثرہ حصہ کاٹ دیا جاتا ہے تاکہ باقی جسم کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس نے برسوں پہلے کہیں پڑھا تھا۔

اور صفوان فتح خان کا وجود بھی سرطان ہی تھا۔ جو ہولے ہولے اسے کھائے جا رہا تھا۔

کہیں سے تریاق ڈھونڈ لاؤ۔

مگر کہاں سے۔

وہ وہیں برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئی۔

عفان نے لپک کر نرمین کو اس کے بازوؤں سے لیا۔

"بھابھی! بھابھی!"

لیکن اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔

اور۔

اسے جب ہوش آیا تو وہ ہاسپٹل کے صاف ستھرے بیڈ پر تھی۔ اور عفان اس کے پاس تھا۔

"نرما!" اس کے ہونٹ کانپے۔

"گھر پر ہے ماں جی کے پاس۔ پریشان نہ ہوں۔" اس نے تسلی دی۔

اس کی نظروں نے ادھر ادھر صفوان کو کھوجا لیکن کمرے میں عفان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

اس نئے الزام پر مہر تصدیق۔

آنکھوں میں دھول سی اڑنے لگی۔

"تمہیں مجھے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔"

"کیا ایک جیتی جاگتی زندگی کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ بھائی جان تو اسی وقت گھر سے چلے گئے تھے۔"

عفان اسٹول کھینچ کر بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"راستے مشکل ہو جائیں تو بدل لینے چاہئیں۔"

اس نے زیر لب کہا۔ ثمین نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ تو نہ ہارنے کا عہد کر کے آئی تھی پھر کیسی راہیں بدل لے۔

صفوان کے ہاتھ میں ایک نیا ہتھیار آ گیا تھا۔

"کب سے عفان کو جانتی ہو۔"

ہاسپٹل سے گھر آتے ہی اس نے پہلا سوال یہی کیا اور ہمیشہ کی طرح اس نے لب سی لیے۔

"پہلے سے ملاقاتیں رہی ہوں گی۔"

ہونٹ زہر میں بھیگ گئے تھے۔ اور زبان پر کانٹے اگ آئے تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے زبان سے کچھ نہ کچھ اگلتا رہا۔

"عفان کے دھوکے میں ہی تو میرا رشتہ قبول نہیں کیا گیا تھا۔" وہ بار بار پوچھتا۔

اس کا دل چاہا وہ بتا دے ایک دن کہ بس ایک نرما اور روشن مسکراہٹ کے عوض اس نے اپنا آپ گروی رکھ دیا تھا۔ اور وہ نرمی پتا نہیں کہاں چھپ گئی تھی۔ جس پر وہ ہاری تھی۔

کئی بار چھپ کر تکیے میں سر دیے روتے روتے اس نے دعا کی تھی کہ وہ نرمیاں لوٹ آئیں لیکن وہاں تو۔

"صفوان بھائی سائیکی کیس ہیں۔" عفان کی رائے تھی۔

"شروع سے ہی۔ کبھی آپ انہیں وہاں گاؤں میں عزیز و اقارب کے ساتھ باتیں

کرتے ہیں جیسے کوئی مطلق العنان حکمران ہوں۔ اور باقی سب ان کی رعایا۔ مجھے شروع سے ہی ان کے رویوں سے اختلاف رہا ہے۔ کاش میں جانتا ہوتا کہ آپ جیسی نازک لڑکی اس پتھر کے پلے باندھی جارہی ہے تو میں ضرور احتجاج کرتا۔''

وہ بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ جبکہ وہ اس سے کترانے لگی تھی۔ رشتوں کا تقدس مجروح ہو۔ یہ اسے گوارا نہ تھا۔

مگر صفوان نے تو زبان پر انگارے دھر لیے تھے۔

''یہ تو ایک عفان ہے تم جیسی ہر دلعزیز اور پاپولر لڑکیوں کو نہ جانے کتنے فین ہوں گے۔ مجھے یہ پہلے سوچ لینا چاہیے تھا لیکن خیر اب میں زیادہ دیر تک یہ غلاظت نہیں سمیٹ سکتا۔''

ایک صبح اٹھتے ہی اس نے کہا۔

''تو یہ بات طے ہے ثمین بیگم! کہ اب تمہارا میرا گزارا نہیں ہوسکتا اور ہمیں اب علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ تو بالآخر اس سارے قصے کا یہ ہی انجام ہونا تھا۔

اس نے اپنے ٹھنڈے ہوتے ہاتھ گود میں دھر لیے۔

''یہ رہے طلاق کے کاغذات۔''

اپنی بات مکمل کر کے اسے وجیہہ مرد نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس امید میں کہ وہ روئے گی۔ چیخے چلائے گی لیکن اس کے اندر یہاں وہاں سناٹے ہی سناٹے تھے۔ ایک دم جامد خاموشی۔

''تمہیں امید تو نہیں ہوگی ثمین علی حیدر! کہ کبھی ایسا بھی ہوگا۔ تم تو سمجھتی تھیں کہ ساری زندگی میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہو گی۔ اور میری آڑ میں میرے معصوم بھائی۔''

اور وہ تو بہت دن سے ایسی ہی کسی سزا کی منتظر تھی۔

اس روز سے جب عفان اسے ہاسپٹل لایا تھا۔

کتنی لمبی مسافت طے کی تھی۔ تھکن ہی تھکن جیسے تین سالوں میں اس نے عمروں کی مسافت طے کر لی تھی۔

ہولے ہولے جامد سناٹا ایک گہرے سکون میں بدلتا گیا۔

یوں جیسے منزل پر پہنچ کر کوئی بے دم ہو کر گر جائے لیکن اس تھکن میں بھی ایک سکون ہو۔

''یہ اچھا ہی ہوا۔ آپ ایسی آئینہ صفت لڑکی ایک پتھر کے ساتھ کب تک زندگی بسر کرتی۔''

عفان کا تبصرہ چھوٹے بھیا کی طرح بے لاگ ہوتا۔

پھر وہ اسے گھر پہنچا گیا۔ بابا جانی صحن میں کھڑے تھے۔

''بابا جانی! وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''بابا جانی! میں ہار گئی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی بابا جانی۔''

اور انہوں نے اسے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ تین سال کے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

سب نے کیسے اس کے زخم زخم وجود پر مرہم رکھے تھے۔ پھولوں کی طرح سنبھال لیا تھا۔

''میری نازک بچی۔''

اماں اس کے بازوؤں پر سگریٹوں کے داغ دیکھتیں۔ اور آنسو ان کا چہرا بھگو دیتے۔ وہ بار بار اس کے بازوؤں کو چومتیں۔

''تو نے بتایا کیوں نہیں میری بچی؟ ارے تیرے پاؤں تو مخمل پر بھی چھلے جاتے تھے۔ پھر کیسے یہ کانٹوں بھرا سفر طے کرتی رہی۔''

بابا کو اس کا بچپن یاد آتا۔ اور وہ آنسوؤں میں بھیگی آواز میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہتے۔

؎ کیلا کھانے سے میرے دانت ہلے جاتے ہیں
فرش مخمل پہ میرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

''بابا جانی!'' وہ چیخنے لگتی۔ نارمل ہونے میں اسے بہت دن لگے۔

حق مہر کے عوض نرما اسے مل گئی تھی۔

''ویسے بھی یہ بچی میری نہیں تھی۔''

جاتے جاتے بھی وہ ایک تیر چلا گیا تھا۔

چھوٹے بھیا کا ہاتھ اسے کے گریبان تک چلا گیا بابا جانی نے بمشکل انہیں چھڑایا۔

ہماری سب سے پیاری اور لاڈلی بہن تھی وہ۔''

بابا جانی کے گلے لگے لگے وہ رو پڑے۔

"تقدیر سے کب کوئی لڑ سکا ہے بیٹا۔"

وہ سب کی محبتوں کے سائے تلے زندگی گزارنے لگی تھی۔ اس نے پھر جاب کر لی تھی۔ لیکن پھر بہار اس کے دل کے آنگن میں کبھی نہیں آئی تھی۔

سارا سال ٹھنڈی یخ ہوا میں چلتی رہتی تھیں۔

سب نے ہی کہا گھر بسانے کو۔

نازنین آپا کے دیور نے خود اس سے بات کی۔

نرمین کو باپ کا پیار دینے کا وعدہ کیا۔

نازنین آپا اور احسان بھائی نے سمجھایا۔ لیکن اس کے اندر تو زندگی مر گئی تھی۔

"ثمو! کیا بچی کو پریشان کر رکھا ہے۔ کیوں نہیں اجازت دیتی ہو اسے۔"

نازنین آپا نے اندر آ کر کہا تو چونک کر آنکھیں کھولتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ نازنین کے بازو سے لپٹی روٹھی روٹھی سی وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"ثمو!" نازنین آپا نے اس کی خالی ویران آنکھوں کو دیکھا تو کانپ سی گئیں۔

"نازنین آپی! آپ نے کبھی شیشوں کو ہاتھوں سے گرتے اور آئینوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ نہیں۔ میں نے تین سالوں میں ایک ایک لمحہ یہی تماشا دیکھتے گزارا ہے۔"

"ثمو!" نازنین آپا نے آہستگی سے نرمین کو الگ کیا۔

"ٹھیک ہے نرما! تم تیاری کرو جا کر، چلی جانا اپنے کالج کی لڑکیوں کے ساتھ سیالکوٹ۔"

"مگر ماما!" نرمین ہچکچائی۔

ثمین نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

"تھینک یو ماما۔"

اس نے جھک کر اس کے رخساروں پر بوسہ دیا اور خوشی سے باہر بھاگ گئی۔

"ثمو!" نازنین آپی اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"بھول جاؤ اب سب کچھ۔"

"کیسے کیسے نازو آپی! تین سالوں کی اذیتیں۔ کیسے بھلا دوں۔"

وہ ایک ایک لمحے کا عذاب۔

"کیسے کاٹ لے تھے میں نے اتنے سال اس جہنم میں۔ کب نکلیں گے یہ سارے کانٹے۔ کب نازو آپا کب۔"

وہ ایک دم ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور نازنین ہولے ہولے اسے تھپکنے لگیں۔ اس امید میں کہ شاید ان اذیتوں پر یہ آخری آنسو ہوں۔

شاید آج آخری کانٹا بھی نکل جائے۔

بھرم

ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا
جب اس نے وعدہ کیا ہم نے اعتبار کیا

''اور لوگ مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ اس نے دھواں دار روتے ہوئے کہا ''لیکن اصل بات کسی دوسرے کو بھی معلوم نہیں۔ دراصل قصور وار تو میں ہوں اور مجھ پہ کسی دوسرے نے نہیں خود میں نے ظلم کیا ہے۔ وہ مجھے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا، ہرگز نہیں۔ آخری لمحے تک وہ مجھے روکتا رہا، میری منتیں کرتا رہا۔ وہ تو مجھ سے محبت کرتا تھا، شدید محبت۔'' اس نے ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھیں۔ ''تمہیں تو سب پتا ہے نارانی!''

''ہاں۔''

میں ابھی تک اس کے طلاق والے صدمے سے باہر نہیں آئی تھی۔

''تم نے ابھی کیا کہا تھا۔ کیا عارف نے تمہیں طلاق دے دی ہے؟''

''ہاں، کوئی تین سال پہلے۔'' وہ پھر شوں شوں کرنے لگی۔ ''لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نارانی کہ وہ مجھے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا میں نے خود طلاق لی تھی۔''

''لیکن تم نے تو عارف سے بڑی ضد اور مشکلوں سے شادی کی تھی۔''

''بس یار! مجھے جلد ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں نے عارف سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ میرا اور عارف، کے اسٹیٹس میں بہت فرق تھا رانی، تمہیں تو پتا ہے نا۔''

''ہاں۔ لیکن اس وقت تو تم پر اس کی محبت کا بھوت سوار تھا نا۔ مجھے یاد ہے، تمہاری ماما نے تمہیں اتنا سمجھایا تھا اور پھر عبداللہ نے بھی تمہیں عارف کا گھر، اس کی مالی حالت، اس

کی ذمے داریاں، سب کچھ بتا دیا تھا اور تمہارا خیال تھا کہ محبت کے سامنے یہ باتیں بے معنی ہیں۔''

''چھوڑو یار!'' اس کا لہجہ یک دم بدل گیا۔ اس نے پرس سے لپ اسٹک نکالی اور ننھے سے آئینے میں دیکھ کر لپ اسٹک لگائی اور چہرہ ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

''بھئی، میں نے جب محسوس کیا کہ میں اس کے ساتھ مزید نہیں چل سکتی تو میں نے اس سے کہہ دیا اور ہم نے اپنے راستے الگ کر لیے۔ ظاہر ہے کہ میں کوئی مڈل کلاس کی لڑکی تو نہیں تھی، پتی ورتا قسم کی کہ خود پر جبر کرتی۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ابھی تو وہ دھواں دھار رو رہی تھی اور اب......

''فرخ!'' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے مجھے ٹوک دیا۔

''چھوڑو یار! اپنی سناؤ، کیسی ہو کتنے بچے ہیں...... میاں کیسا ہے؟''

''نہ بچے ہیں نہ میاں؟'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''کیا!'' اس کی بڑی بڑی چاکلیٹی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں نے عارف سے شادی کی تھی تو تمہاری شادی ہونے والی تھی، تمہارے اس انٹلیکچوئل کزن سے۔ کیا نام تھا اس کا عبداللہ...... کیا اس نے کسی اور سے شادی کر لی؟ یہ مرد بہت کمینے ہوتے ہیں۔ فریبی، دھوکے باز...... ہیں نا...... مجھے یاد ہے، تمہارا وہ کزن تم سے محبت بھی کرتا تھا۔''

''ہاں۔ مگر وہ فریبی نہیں تھا۔''

''پھر...... پھر کیا تم نے؟''

''نہیں۔'' میں افسردہ ہو گئی۔ ''ہماری شادی ہو گئی تھی لیکن شادی کے صرف ایک ماہ بعد ایک حادثے نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ کس قدر اندوہناک حادثہ تھا۔'' میں نے جھرجھری سی لی۔ ''وہ اس کا آخری لفظ، وہ اس کا مڑ مڑ کر مجھے دیکھنا۔''

''پلیز...... پلیز۔ عبداللہ اور آگے مت جاؤ۔'' میں چلا رہی تھی۔

''نہیں، بس وہ اس پتھر پر۔ میں وہاں کھڑا ہوتا ہوں۔ تم میری تصویر بنا لو جلدی سے۔''

''اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھایا تھا اور پھر نہ جانے

کیسے، کب اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دریائے کاغان کی ظالم لہریں اسے نگل گئی تھیں۔ کیمرہ میرے ہاتھ سے گر پڑا تھا اور میں چیخ رہی تھی۔''

''رفی!'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ''تم نے پھر شادی نہیں کی؟ اتنی کیوٹ سی ہو...... کیا عبداللہ کے بعد کوئی اچھا نہیں لگا؟''

''پتا نہیں۔ مجھے اس کی یادوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی اور طرف دیکھوں۔''

''اف......او!'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''وہی مڈل کلاس سوچ۔ تم ابھی تک اپنی اس مڈل کلاس سوچ سے باہر نہیں نکلیں۔ یاد ہے نا تمہیں، مجھے تم عارف سے شادی کرنے پر منع کرتے ہوئے کیا کیا لیکچر دیتی تھیں۔ ماں باپ کی عزت کا خیال کرنا، ان کا دل نہ دکھانا وغیرہ وغیرہ۔''

''ہاں۔ یاد ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اب بھی مڈل کلاس کی ہوں۔ بائے داوے، تم تو مڈل کلاس سوچ نہیں رکھتی ہو، تم نے طلاق کے بعد شادی کیوں نہیں کی؟''

مجھے یوں لگا جیسے ذرا سی دیر کو اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے قہقہہ لگایا۔

''میں زندگی کو انجوائے کر رہی ہوں رفی ڈارلنگ! حالانکہ ان تین سالوں میں کئی لوگوں نے پیش کش کی شادی کی لیکن۔ نہیں یار نہیں میں اب خود کو کسی بندھن میں نہیں باندھنا چاہتی۔''

''ایسا تو نہیں کہ تم ابھی تک عارف کی محبت کے دائرے سے باہر ہی نہیں نکلی ہو۔''

''اوہ نو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے نزاکت سے اپنے پرس کی زپ کھولی۔ آئینہ اور لپ اسٹک اندر رکھی۔ ''مجھے بہت جلد احساس ہو گیا تھا کہ میں عارف سے محبت نہیں کرتی۔ وہ میری محبت کے قابل تھا ہی نہیں۔ مگر اپنی بات نباہنے کے لیے اتنے سال گزار دیے میں نے۔''

مجھے اس کی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ حالانکہ ان دنوں تو وہ عارف کی محبت میں سرتاپا ڈوبی ہوئی تھی۔ اور جب اس کے ماما پاپا نے عارف کے ساتھ اس کی شادی کرنے سے

انکار کر دیا تھا تو وہ پرس میں نیند کی پوری پچاس گولیاں رکھا کرتی تھی۔

''میری اگر عارف سے شادی نہ ہوئی تو میں مر جاؤں گی۔'' کتنی ہی بار اس نے مجھے پرس سے گولیاں نکال کر دکھائی تھیں۔ ''تم دیکھ لینا اگر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ عارف اور میں کبھی مل نہیں سکتے تو میں اسی لمحے مر جاؤں گی...... ابھی مجھے امید ہے۔''

عارف بھی اس کی انتہا پسندی سے بہت گھبرایا تھا۔

''سنو فرح!'' کئی بار اس نے میرے سامنے اسے سمجھایا تھا۔ ''میں ایک بار تمہارے والدین کے سامنے دامن ضرور پھیلاؤں گا۔ ہم اپنی سی کوشش ضرور کریں گے لیکن اگر ہم کامیاب نہ ہو سکے تو تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ زندگی خدا کی امانت ہوتی ہے۔''

''دیکھا جائے گا۔'' وہ عارف کی بات کو ہنسی میں اڑا دیتی تھی۔

اتنی شدید محبت طوفانی محبت کا یہ انجام!

میں ابھی تک حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''یار، چائے نہیں پلواؤ گی۔''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تم بیٹھو میں ماسی سے چائے کے لیے کہہ آؤں۔''

فرح سے میری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔

وہ لمبی سی گاڑی خود ڈرائیور کر کے یونیورسٹی آتی تھی۔ بوائے کٹ چاکلیٹی بال، چاکلیٹی آنکھیں، بہت سفید رنگت، دلکش نقوش، خوب صورت قد، اس پر انتہائی عجیب وغریب ڈریسز پہنتی تو خود بخود سب کی توجہ اس کی طرف ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ انتہائی مغرور بھی تھی۔ اس کی دوستی ڈپارٹمنٹ کی ایک دو لڑکیوں سے ہی تھی جو اسی کی طرح بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انتہائی ماڈ اور دولت مند گھرانے کی لڑکیاں جو لگتا تھا، یونیورسٹی پڑھنے نہیں، انجوائے کرنے آتی ہیں۔ ہمیں وہ ہمیشہ تمسخر سے دیکھتی تھیں۔

''بے چاری مڈل کلاس کی پڑھاکو لڑکیاں!'' وہ اکثر ہم پر ریمارکس پاس کرتی تھیں۔

ہم بھی ان تین چار لڑکیوں کو مغرور اور شو پسند وغیرہ کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔ لیکن پھر اچانک ہی وہ میرے قریب آ گئی۔

"یار، تم بہت پیاری ہو اور بڑی ذہین مجھے تم جیسی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

وہ دل کھول کر میری تعریف کیا کرتی تھی اور اکثر مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ کینٹین لے جاتی۔ کبھی کبھار زبردستی مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیتی۔

"کم آن یار، میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔ جب تک بس کے انتظار میں کھڑی رہو گی۔"

کئی بار شام کو اچانک وہ گھر آ جاتی۔

"یار، دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا، اپنی سوہنی سی دوست سے مل آؤں۔"

میں اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوتی تھی اور میری یہ سوچ کہ امیر گھرانوں کی لڑکیاں مغرور اور شو پسند ہوتی ہیں، فرح کو دیکھ کر بدل گئی تھی۔ یہ تو بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ میرے ساتھ اس کی دوستی کی وجہ میری ذہانت اور خوب صورتی نہ تھی بلکہ عارف ملک تھا، عبداللہ کا دوست۔ عبداللہ میرا خالہ زاد تھا اور یونیورسٹی میں مجھ سے ایک سال سینئر تھا۔ کبھی کبھار وہ ہمارے ڈپارٹمنٹ میں آتا تو عارف اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

عارف ایک ہینڈسم لڑکا تھا اور بہت لیے دیے رہتا تھا اور یہ مجھے فرح سے ہی پتا چلا کہ وہ کئی لڑکیوں کا آئیڈیل ہے اور یہ کہ وہ بھی اس کی محبت میں سرتا پا ڈوب چکی ہے۔ وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھ کر اس کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ عبداللہ کے ساتھ گپ شپ لگاتی اور کرید کرید کر عارف کے متعلق پوچھا کرتی تھی۔ پھر انہی دنوں پتا چلا کہ عارف بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا ہے اور یہ کہ دونوں میں زبردست افیئر چل رہا ہے۔ یونیورسٹی میں ایسی باتیں زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہتیں۔ وہ اکثر نہر کے کنارے ٹہلتے یا بیٹھے دکھائی دیتے۔ کبھی کسی کونے میں بیٹھے اردگرد سے بے خبر باتوں میں مگن دکھائی دیتے۔ عبداللہ نے مجھے بتایا کہ عارف بھی اس کے لیے سنجیدہ ہے اور وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ کلاسز کا فرق تھا۔ عارف کا تعلق مڈل کلاس سے تھا جبکہ وہ ہائی اسٹیٹس سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے پاپا بہت بڑے بزنس مین تھے اور بظاہر دونوں کا ملنا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن پھر یہ نہونی ہو ہی گئی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی دونوں نے شادی کر لی تھی۔

حسب توقع فرح کے والدین نے عارف کی والدہ کو انکار کر دیا تھا اور فرح کے اصرار کے باوجود عارف دوبارہ اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔

"دیکھو، میں نے ماما سے صاف کہہ دیا کہ مجھے تم سے ہی شادی کرنا ہے۔ تم ایک بار اپنی ممی کو بھیجو تو سہی، اب انکار نہیں ہو گا۔"

لیکن عارف اس کی بات ماننے پر تیار نہیں تھا۔ "ہرگز نہیں۔ میری ماں، اب اس گھر میں ہرگز نہیں جائے گی۔ میں تمہاری جدائی برداشت کر سکتا ہوں لیکن اپنی ماں کی توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

(بقول فرح کے وہی مڈل کلاس سوچ)

"تو ٹھیک ہے، میں اپنے گھر سے آ جاتی ہوں۔ تم اپنے گھر میں شادی کا انتظام کر لو۔" فرح کو اس کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں تھا۔

لیکن جب عارف نے گھر میں بات کی تو اس کی والدہ نے انکار کر دیا۔ عارف نے بہت کوشش کی لیکن وہ فرح کو اس طرح بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھیں اور نہ ہی اس کے گھر دوبارہ جانا چاہتی تھیں۔

"تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔" انہوں نے بار بار عارف کو سمجھایا۔ "تمہارا باپ ریٹائر ہونے والا ہے۔ تو جوان بہنوں کا بھائی کا ہے۔ انہیں بیاہنا تمہاری ذمے داری ہے۔ فرح جیسی امیر لڑکی سے شادی کر کے تم اس کے اخراجات پورے کرو گے یا بہنوں کی ذمے داری نبھاؤ گے۔"

باپ نے بھی سمجھایا تو عارف پریشان ہو گیا اور اس نے فرح کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو فرح، مجھ پر بہنوں کی ذمے داریاں ہیں اور پھر میں تمہیں وہ اسٹیٹس نہیں دے سکوں گا جس کی تم عادی ہو ابھی مجھے جاب نہیں ملی...... اور جاب مل بھی گئی تو۔"

"پلیز عارف، مجھ سے دامن مت بچاؤ۔ میں ہر طرح کے حالات میں گزارا کر لوں گی۔ بھوکی رہ لوں گی۔"

"لیکن......" عارف نے کچھ کہنا چاہا تو فرح نے پرس سے نیند کی ٹیبلٹس نکال لیں۔

"ٹھیک ہے جو زندگی تمہارے بغیر گزارنا پڑے گی، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، ایک لمحہ بھی نہیں۔"

عارف نے اس کے ہاتھ سے ٹیبلٹس چھین لیں۔ "مجھے بھی تمہارے بغیر زندگی نہیں

چاہیے فرح؟"

اور یوں دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔

شادی کے بعد جب وہ مجھے ملی تو بہت خوش تھی اور وہ دونوں کراچی جا رہے تھے۔ عارف کو کراچی میں ایک جاب مل گئی تھی۔

"فرح نے میرے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے۔" عارف اس کا ممنون نظر آتا تھا۔ فی الحال اس کی امی بھی اس سے خفا تھیں لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک خفا نہیں رہ سکیں گی کیونکہ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ اور چار بہنیں تھیں اس کی، باپ معمولی ملازم۔

"ایک دو ماہ بعد ذرا سیٹ ہو جائیں تو آ کر اماں سے معافی مانگ لیں گے۔"

وہ بھی خوش تھا۔

وہ کراچی چلے گئے اور پھر میری فرح سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی نہ مجھے اس کے متعلق پتا چلا کہ وہ کہاں ہے اور لیکن عارف نے فون پر ہی معذرت کر لی تھی کہ نئی نئی جاب ہے اور پھر حالات بھی ایسے نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ رقم اکٹھی ہو جائے تب ہی لاہور آؤں۔

عبداللہ کے پاس اس کے دفتر کا فون نمبر تھا۔ شادی کے چند دنوں بعد عبداللہ نے مجھے بتایا کہ اس نے عارف کو شادی پر بلایا تھا لیکن وہ نہیں آ سکا۔

"اور فرح وہ کیسی ہے؟"

"پتا نہیں۔ میں نے پوچھا ہی نہیں دراصل عارف گھر والوں کو بہت مس کر رہا تھا۔ وہ ان کی باتیں کرتا رہا اور فرح کے متعلق نہ اس نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔ اب فون کیا تو ضرور پوچھوں گا...... ویسے کمال کی لڑکی ہے۔ محبت میں اتنی شدت اس دور میں تو کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی تھی، سب کچھ چھوڑ کر اب ویگنوں میں دھکے کھاتی ہو گی۔"

لیکن موت نے عبداللہ کو مہلت ہی نہ دی کہ وہ پھر کبھی عارف کو فون کرتا اور فرح کے متعلق پوچھتا اور عبداللہ کے بعد میں خود تو اپنے ہی غموں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ گرد و پیش سے بے گانہ۔ میں نے اسے کھوجنے اور اس کا پتا لگانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں اور خالہ جان اس چھوٹے سے فلیٹ میں اکیلے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر روتے، ایک دوسرے

کے آنسو پونچھتے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ اماں اور بھائیوں نے بہت چاہا کہ میں واپس پلٹ آؤں اور اپنی نئی زندگی کا آغاز کروں۔ خالہ نے بھی سمجھایا کہ اتنی لمبی عمر تنہا کیسے گزارو گی ماں کی بات مان لو۔

لیکن میرے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنی باقی ماندہ زندگی عبداللہ کی یاد میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک دو بار مجھے اس کا خیال ضرور آیا تھا کہ پتا نہیں، وہ لوگ کہاں ہوں گے۔ پتا نہیں، اس کی اپنے والدین سے صلح ہوئی یا نہیں؟ مگر پھر عبداللہ کی یادیں اس خیال پر حاوی آ گئیں۔ اسی لیے تو آج اچانک ہی بارہ سالوں بعد اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کو تو میں اسے پہچان ہی نہ سکی تھی۔ بلیو جینز کے ساتھ ریڈ شرٹ پہنے بہت گہرا میک اپ کیے دور سے مجھے وہ کوئی ینگ لڑکی لگی تھی۔ شوخ اور تیز جیسے اس طبقے کی لڑکیاں ہوتی ہیں، بااعتماد سی۔ میں ایک نظر اسے دیکھ کر سیلز بوائے کی طرف مڑ گئی تھی۔ مجھے کچھ چھوٹی موٹی شاپنگ کرنا تھی اس لیے میں دفتر سے سیدھی اس شاپنگ سینٹر میں چلی آئی تھی۔ یہاں زیادہ تر اونچے طبقے کی خواتین ہی شاپنگ کے لیے آتی تھیں لیکن چونکہ یہ جدید شاپنگ سینٹر میرے دفتر سے نزدیک تھا اس لیے میں کبھی کبھار ادھر چلی آتی تھی۔

"لپ اسٹک کے کچھ اچھے شیڈ نکالو۔" وہ بالکل میرے قریب آ کر بولی تو مجھے اس کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اور میں نے مڑ کر بہت غور سے اسے دیکھا۔ وہ کوئی ینگ لڑکی ہرگز نہیں تھی۔ قریب سے مجھے اس کا چہرہ بھی کچھ جانا پہچانا لگا۔ اس کی چاکلیٹ رنگ آنکھوں میں بھی پہچان کے رنگ ہلکورے کھانے لگے اور پھر وہ یک دم ہی "ہائے رفی!" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میں نے بھی اسے پہچان لیا۔

"فرح تم یہاں! کب آئی ہو، عارف کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ اس وقت مجھے بوبی کے ساتھ ایک فنکشن میں جانا ہے۔ میں آؤں گی کسی دن تم سے ملنے۔ تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو۔ کم آن بوبی!" بات کرتے کرتے اس نے مڑ کر قریب ہی دوسرے کاؤنٹر پر جھکے ایک لڑکے کو پکارا جس نے شوخ رنگوں کی شرٹ پہن رکھی تھی اور غالباً آفٹر شیو لوشن دیکھ رہا تھا۔

"یہ رفی ہے۔ میری یونیورسٹی فیلو۔ ہم کبھی اچھے دوست ہوا کرتے تھے، ہے نا رفی۔"

"ہاں۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ محض عبداللہ کے توسط سے عارف تک پہنچنے کے لیے میرے قریب آئی تھی، ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو لگاؤ پیدا ہوا تھا، وہ کبھی ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ عبداللہ کی یادوں میں کسی دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔

میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"فرح، ابھی چلو نا میرے ساتھ، اتنے عرصے بعد تو ملے ہیں۔ گھر بیٹھ کر باتیں کریں گے ڈھیر ساری۔"

"ہاں چلوں گی لیکن مجھے بہت ضروری جانا ہے۔ یہ بوبی ہے نا، اس کی برتھ ڈے ہے اور میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو۔"

میں نے جلدی سے اپنا ایڈریس لکھ کر اسے دیا۔

"فرح ملنے ضرور آنا۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"ضرور آؤں گی جان!" اس نے جھٹ سے میرے رخسار پر بوسہ دیا۔ میں سرخ پڑ گئی تو اس نے قہقہہ لگایا۔

"تم ذرا بھی نہیں بدلی ہو جانو!"

"اور تم بھی...... حالانکہ میرا خیال تھا کہ عارف تمہیں اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔ یاد ہے نا، ان دنوں تم بڑے اہتمام سے شلوار قمیص پہننے لگ تھیں اور بال بڑھانے بھی شروع کر دیے تھے۔"

"اوہ ہاں......" اس نے قہقہہ لگایا۔ "سب یاد ہے۔"

اور پھر بوبی کا مزید تعارف کروائے بغیر جلد ملنے کا وعدہ کر کے لپ اسٹک کا مطلوبہ شیڈ لے کر وہ شاپنگ سینٹر سے باہر نکل گئی۔

اور آج اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ بلیک جینز پر بلیو شرٹ پہنے اور بے تحاشا گہرا میک اپ کیے، حالانکہ یونیورسٹی کے زمانے میں وہ میک اپ بالکل نہیں رکتی تھی اور عارف کو اس کی یہی ادا پسند آ گئی تھی اور اب وہ بتا رہی تھی کہ اس نے عارف سے طلاق لے لی تھی اور تین سال سے یہاں لاہور میں کسی پرائیویٹ کمپنی میں جاب کر رہی تھی۔ میں جب

چائے کا کہہ کر آئی تو وہ چاروں طرف گھوم پھر کر ڈرائینگ روم کا جائزہ لے رہی تھی۔

"تمہارا فلیٹ تو اچھا خاصا ہے رفی۔ دو بیڈ ہیں نا۔"

"ہاں۔"

میں نے آہستگی سے کہا۔ "عبداللہ نے میری شادی سے پہلے یہ فلیٹ خریدا تھا اور بقول اس کے یہ اس کی طرف سے میرے لیے رونمائی کا تحفہ تھا۔ اندرون شہر والا مکان اس نے کرائے پر اٹھا دیا تھا اور رخصتی کے بعد میں اسی فلیٹ میں آئی تھی۔

"یہ عبداللہ نے اچھا کیا تھا۔ اپنا گھر ہو تو آدمی بڑا معتبر ہو جاتا ہے۔ اب مجھے دیکھو نا، میں ورکنگ ویمن ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ کوئی الگ کمرا نہیں تھا نا تو شیئر کرنا پڑا لیکن وہ جو میری روم میٹ ہے نا، انتہائی چڑچڑی شے ہے۔ ذرا دیر ہو جائے تو گھنٹوں بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میری ہر بات پر اعتراض کرتی ہے۔ میرا موسیقی سننا اسے زہر لگتا ہے۔ سرِشام ہی سو جاتی ہے۔ مجبوری نہ ہوتی تو ایک دن بھی نہ رہتی اس کے ساتھ۔"

"مگر فرح! یہاں تمہارا گھر ہے، تمہارے ماما پاپا ہیں اور عبداللہ نے بتایا تھا کہ تمہاری صلح ہو گئی تھی اور یہ کہ تمہارے ماما پاپا نے تم سے ملنا شروع کر دیا تھا۔"

"ہاں یار مگر میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ پاپا کا انتقال ہو چکا۔ اور عارف سے طلاق لے کر میں گھر ہی آئی تھی مگر وہ جو میرا بھائی ہے نہ، اس کی وائف کو میرا ماما کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی شاید میں اپنا حصہ لینے آ گئی ہوں، حالانکہ مجھے تو صرف رہنے کو ایک گھر چاہیے تھا۔ مگر وہ فضول بولتی تھیں اور بھائی تو بات ہی نہیں کرتا تھا۔ بس میں ہوسٹل چلی آئی۔ ماما نے بہت روکا مگر یار، تمہیں میری طبیعت کا تو پتا ہے نا۔ دراصل رفی جب ربط نہ رہے تو محبتیں خود بخود دلوں سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ پاپا ہمارے کراچی جانے کے تین ماہ بعد ہی آئے تھے۔ تمہیں پتا ہے نا، وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے اور اسی محبت سے مجبور ہو کر وہ میری بات بھی مان گئے تھے لیکن عارف نے دوبارہ اپنی امی کو نہیں بھیجا اور ہمیں کورٹ میرج کرنا پڑی۔ پھر بھی پاپا نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ وہ میرے اور عارف کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ بہت کوشش کی تھی انہوں نے لیکن عارف نہیں مانا تھا۔ وہی مڈل کلاس سوچ اور جھوٹی خود داری...... اور پھر وہ پسند نہیں کرتا تھا کہ میں ماما پاپا سے ملوں، سو میں کبھی یہاں آئی ہی نہیں۔ تو بھائی اور بھابی مجھے بھلا چکے تھے۔ میرے وجود کے عادی نہیں رہے تھے نا، اس لیے میرا وجود

انہیں بھاری لگنے لگا تھا۔ خیر یار، چھوڑو کوئی اور بات کرو۔ اپنے متعلق بتاؤ۔''

اور میں اسے عبداللہ کے متعلق بتانے لگی۔ کتنے خوش تھے ہم دونوں۔

''بی ایزی رفی!''

وہ میرے آنسو پونچھ کر مجھے عبداللہ کو بھلانے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔

ہفتے میں ایک بار وہ ضرور آتی۔ ہم یونیورسٹی کی باتیں یاد کرتے۔ اسے تقریباً اپنے ڈپارٹمنٹ کا ہر لڑکا اور لڑکی یاد تھی۔ وہ ان کی کوئی نہ کوئی بات یاد کر کے خوب ہنستی اور مجھے بھی ہنساتی۔ پتا نہیں، عارف سے اس نے طلاق کیوں لی تھی۔ میں اکثر سوچتی لیکن اس پہلے روز کے بعد اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی میں نے پوچھا کہ اتنے طوفانی قسم کے عشق کے بعد جس کے لیے اس نے گھر بھر کی مخالفت مول لی تھی۔ جس کے بغیر وہ جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس سے اتنے سالوں کی رفاقت کے بعد اس نے طلاق کیوں لے لی؟

بظاہر وہ بڑی مطمئن لگتی تھی لیکن کبھی کبھی پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا جیسے اس نے اپنے چہرے پر کوئی نقاب چڑھا رکھا ہو۔ کبھی کبھی یہ نقاب سرک جاتا لیکن وہ فوراً ہی اسے پھر اوڑھ لیتی تھی۔ ایک دن وہ آئی تو کچھ پریشان لگ رہی تھی۔

''کیا بات ہے فرح!''

''کچھ نہیں یار، میری روم میٹ نے مجھے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ میں اپنا بوریا بستر سمیٹ لوں۔''

''کیوں؟''

''بقول اس کے کہ اب وہ مجھے مزید برداشت نہیں کرسکتی۔ اور یہ بھی اس کی مہربانی تھی کہ اس نے اتنا عرصہ مجھے اپنے ساتھ رہنے دیا۔''

''پھر!''

''پھر کیا 'اپوا ہوسٹل' میں بھی گئی تھی لیکن وہاں بھی کوئی روم خالی نہیں ہے۔'' اس نے اداسی سے کہا پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''رفی! اگر تم پسند کرو تو مجھے پے انگ گیسٹ بنا لو۔''

''ہاں، ٹھیک ہے تم آجانا۔''

میں انکار نہ کرسکی۔ یوں بھی میں نے سوچا، خالہ جی کے بعد کبھی کبھی بڑی تنہائی

محسوس ہوتی تھی۔ فرح ہوگی تو تنہائی کا یہ احساس بھی کم ہو جائے گا۔ اور پھر ماسی بانو بھی چند دن کے لیے گاؤں جاسکے گی۔ جب سے خالہ جان فوت ہوئی تھیں، میری تنہائی کی وجہ سے وہ گاؤں نہیں جاسکی تھی۔

''تھینک یو رفی!'' اس نے میرے رخساروں پر پیار کیا اور چائے پی کر رخصت ہو گئی۔ اور یوں فرح میرے ساتھ رہنے لگی۔

صبح صبح ناشتے کے بعد ہم دونوں تقریباً اکٹھے ہی گھر سے نکلتے تھے۔ ہمارے روٹ الگ الگ تھے۔ میری ویگن اکثر پہلے آتی تھی، میں اسے خدا حافظ کہہ کر چلی جاتی تھی۔ بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے کبھی کبھی وہ مجھے بڑی قابل رحم لگتی تھی۔ یہ وہی فرح تھی جس کے پاس اپنی گاڑی ہوا کرتی تھی۔

اور جب وہ لش لش کرتی گاڑی سے اترتی تھی تو لمحہ بھر کو تو نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر جاتی تھیں۔ یونیورسٹی کے کئی لڑکے اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے لیکن وہ نخوت وغرور سے بات کرتی تھی۔ اور آج وہی فرح، گھنٹوں بس اسٹاپ پر کھڑی ویگن اور بس کا انتظار کرتی تھی۔ ہم گھر سے اکٹھے نکلتے تھے لیکن اس کی واپسی چھ سات بجے ہوتی تھی جبکہ میں تین چار بجے تک گھر آجاتی تھی۔ دن کا کھانا وہ آفس میں ہی کھا لیتی تھی۔ اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی جاتی تھی۔ ماسی بانو کو وہ ذرا پسند نہیں آئی تھی۔

''کیسا بے ہودہ لباس پہنتی ہے مردوں جیسا۔''

''ماسی، وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے وہاں اس طرح کا لباس معیوب نہیں سمجھا جاتا۔''

''اتنے امیر ماں باپ کی بیٹی ہے تو در در دھکے کیوں کھا رہی ہے۔''

''بس مقدر کی بات ہے۔'' میں اسے ٹال دیتی۔

''رات گئے تک پتا نہیں کیا کیا کریمیں چہرے پر ملتی ہے۔ اور صبح اٹھ کر جانے کیا جنتر منتر پڑھتی ہے۔ کبھی آنکھیں بند کرتی ہے کبھی لیٹ جاتی ہے، کبھی سر پیچھے کر لیتی ہے۔''

ماسی کو تو اس سے خواہ مخواہ ہی چڑ ہوگئی تھی۔

''ماسی، تجھے نہیں پتا، وہ ورزش کرتی ہے۔ جسم کو فٹ رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے نا۔''

''توبی بی، اس طرح کریمیں لگانے سے الٹے سیدھے ہونے سے عمر گھٹ جاتی ہے تو کوئی بھی بوڑھا نہ ہوتا۔''

''ہاں لیکن فرق تو پڑتا ہے۔ دیکھنے میں وہ کتنی جوان لگتی ہے جبکہ میری ہم عمر ہے۔''

''رہنے دو بیٹا۔ خاک جوان لگتی ہے۔ تمہاری جلد اس سے زیادہ شفاف ہے۔ پر تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہو تو نا۔''

''چھوڑو ماسی، تمہیں کوئی تنگ تو نہیں کرتی نا۔''

''نہیں خیر، مجھے کیا تنگ ہونا ہے۔ تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔ اچھا ہے، میں بھی بیٹی اور نواسے نواسیوں سے مل آؤں گی۔''

''ہاں ماسی ضرور جاؤ۔''

میں چونکہ عرصے سے اکیلی رہ رہی تھی اس لیے شروع شروع میں، میں بھی اپ سیٹ ہوئی لیکن پھر ہولے ہولے اس کے وجود کی عادی ہوگئی اور وہ بھی مجھ سے یوں بے تکلف ہوگئی جیسے ہم مدتوں سے یوں ہی اکٹھے رہتے چلے آرہے ہوں۔ اب تو وہ آفس سے سیدھی میرے کمرے میں آتی اور آتے ہی میرے بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹ جاتی اور دن بھر کی روداد مجھے سناتی۔

''یار، تجھے پتا ہے، وہاں آفس میں سب مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ جو بٹ صاحب ہیں نا وہ تو میرے گرد پروانوں کی طرح چکر لگاتے ہیں۔ مگر میں ذرا لفٹ نہیں کراتی۔ چھ بچوں کے باپ ہیں۔''

کچھ دیر چپ رہ کر وہ پھر کہتی۔

وہ مرتضیٰ ہے نا تو یہ اس طرح گھورتا ہے جیسے کچا ہی کھا جائے۔ بہانے بہانے میری میز کے گرد چکر لگاتا ہے۔ کل میری ٹیبل کے پاس آیا اور چپکے سے I love You کا کارڈ رکھ گیا لیکن یار، تجھے تو پتا ہے نا، میں ایک بار دھوکا کھا چکی ہوں۔ اب مجھے کسی مڈل کلاس کے بندے سے شادی نہیں کرنی۔ یہ گھٹیا ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ عارف کی طرح۔''

''تو تم اب شادی کرو گی اس عمر میں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''کیا ہوا ہے یار، میری عمر کو۔ کیا میں تمہیں Young نہیں لگتی ہوں۔''

''لگتی ہو پر......''

''پھر کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ساری زندگی عارف کی یاد میں گزار دوں گی؟''

ہاں شاید میں ایسا ہی سمجھتی تھی۔ یوں بھی وہ انتالیس چالیس سال کی تھی اور مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ بھی ہے، حالانکہ وہ اپنا کافی خیال رکھتی تھی۔ میٹھا بہت کم کھاتی، چاول برائے نام چکھتی۔

''یار، موٹاپا مت مار دیتا ہے آدمی کی۔''

صبح و شام ویٹ کرتی کہ کہیں اس کا وزن نہ بڑھ جائے۔ چھٹی والے دن تو وہ یہی کرتی تھی اور بے حد مصروف رہتی تھی۔ فیشل، مساج، ماسک، تھریڈنگ۔ نہ جانے کیا کیا الم غلم۔

''یار، اتنا کیوں تھکتی ہو۔''

''ارے، تمہیں نہیں پتا میری جان، جب وہاں آفس میں سب مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہیں نا تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ یقین کرو، وہاں سب کا خیال ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ پچیس سال کی ہوں۔''

اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے دھیان سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ عمر کی چغلی کھاتا تھا۔ بہر حال اگر وہ اسی فریب میں خوش تھی تو مجھے کیا، میں کیوں اس کا دل توڑتی۔

''کیوں لگتی ہوں نا ایسی ہی؟'' مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے نظریں جھکا لیں۔

وہ اکثر خوش رہتی تھی یا خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتی تھی۔ اکثر شام کو واپسی پر بوبی اسے ڈراپ کر کے جاتا تھا اور وہ ہمیشہ مجھے بتاتی۔

''آج بوبی ڈراپ کر کے گیا ہے یار اس نے آفر کی انکار نہیں کیا۔ کون خوار ہوا پھرے بسوں میں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔''

وہ مجھ سے تائید چاہتی تھی۔ اور میں نے اس کی کسی بات پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس کی اپنی زندگی تھی۔ جیسے گزارتی لیکن اس کی بوبی کے ساتھ یہ حد درجہ بے تکلفی مجھے حیران ضرور کرتی تھی۔ وہ نوجوان لڑکا تھا شاید کسی کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ یا پھر یا پھر اس کی کمپنی میں ہی کسی پوسٹ پر کام کرتا تھا۔ میں نے کبھی کرید نہیں کی تھی۔ یہ بوبی وہی لڑکا تھا جو پہلے روز اس کے ساتھ مجھے ملا تھا۔ وہ اکثر بوبی کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ ایک روز وہ آئی تھی تو وہ

بہت خوش تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے رفی، مجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔"

"تم اگر ایسا سمجھتی ہو تو ٹھیک ہے کر لو۔ مگر کس سے شادی کرو گی؟ بوبی سے۔"

"بوبی سے!" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر ہنستے ہنستے بے دم ہو گئی اور اس کے اس طرح ہنسنے پر میں شرمندہ ہو گئی کہ میں نے شاید کوئی بہت ہی غلط بات کہہ دی ہے۔

"بوبی سے۔ تمہارا دماغ ٹھیک ہے رفی!"

اس نے آنکھوں کے کونوں میں جمع ہو جانے والے آنسوؤں کے قطرے ہاتھ سے پونچھے۔

"میں بوبی سے شادی کروں گی، اس ہاتھ بھر کے لڑکے سے۔ وہ تو بس میرا دوست ہے۔ گھر میں اکیلا ہوتا ہے نا اس لیے اس نے مجھ سے دوستی کر لی ہے اور ہم ایک دوسرے کو کمپنی دیتے ہیں۔ وہ میری فرم کے جنرل منیجر ہیں نا بوبی ان کا بیٹا ہے۔"

"اچھا سوری یار!" میں شرمندہ ہو گئی۔ "وہ دراصل تم بوبی کا اتنا ذکر کرتی ہو نا تو میں نے سوچا۔"

"میرا خیال ہے، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے پر خیال انداز میں کہا۔

"کون؟"

"بوبی کے ڈیڈی!" اس نے دھماکا کیا۔

"اور بوبی کی ماما؟" میں نے پوچھا۔

"وہ نہیں ہیں، کافی عرصے سے علیحدگی ہے۔"

"کیا طلاق ہو چکی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں لیکن وہ بوبی کے ڈیڈی کے ساتھ نہیں رہتیں۔ تقریباً دس سال سے۔ بوبی نے بتایا تھا مجھے کہ جب وہ آٹھ سال کا تھا، اس کی ماما روٹھ کر چلی گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آئیں۔ وہ چھٹیوں میں جاتا ہے، اپنی ماما کے پاس۔"

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی اور مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ سیاہ لیس کے خوب صورت ڈریس میں وہ اس وقت کافی دلکش لگ رہی تھی۔ اس کی

خوب صورت چاکلیٹی آنکھیں، گوری رنگت، دلکش ہونٹ، اسٹیپس میں کٹے ہوئے چاکلیٹ رنگ بال...... اگر بوبی کے ڈیڈی اس کے خیال میں اس سے شادی کرنا چاہتے تھے تو یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے رفی!" اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "اگر وہ مجھے پروپوز کر دیں تو مجھے ان سے شادی کرنا چاہیے کہ نہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں فرح، میں تو انہیں جانتی بھی نہیں۔ معلوم نہیں وہ کیسے آدمی ہیں۔ اور پھر بوبی کی ممی سے ان کی علیحدگی کا کیا سبب تھا؟"

"ہاں، ٹھیک ہے تم بھلا کیا جانو؟" وہ پھر میرے بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹ گئی۔ "پتا ہے رفی! ہی از ویری اسمارٹ۔" اس کی عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی کبھی بھویں چیک کرتی اور۔

"یہ بال فالتو لگ رہا ہے۔ ہے نا رفی۔"

کبھی گردن کا جائزہ لیتی۔

کبھی پلکوں کو دیکھتی اور پھر بیڈ پر کر لیٹ جاتی اور آفس کی کوئی نہ کوئی بتا بتانے لگتی اور آج کل تو اس کے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔

بوبی کے ڈیڈی...... اور صرف بوبی کے ڈیڈی۔

"آج ہم وقفے میں لنچ کرنے گئے تھے۔"

"سچی بوبی کے ڈیڈی مجھے بہت سراہتے ہیں۔"

"بہت گریٹ آدمی ہیں یار۔ اور بوبی بہت سویٹ ہے۔"

ان کی باتیں کرتے ہوئے اس کی چاکلیٹ رنگت اور آنکھوں میں روشنیاں سی کوندنے لگتیں اور چہرے پر اتنے رنگ اتر آتے کہ اتنے رنگ تو میں نے ان دنوں بھی اس کے چہرے پر اترتے نہیں دیکھے تھے، جب عارف ہمارے ڈپارٹمنٹ میں اس سے ملنے آیا کرتا تھا اور وہ کتنے ہی پیریڈ مس کر کے اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔

"فرح!" ایک دن جب وہ نہایت زور وشور سے بوبی کے ڈیڈی کی باتیں کر رہی تھی میں نے کہا۔

"ہاں، کیا ہے جان!"

''کیا بوبی کے ڈیڈی نے تمہیں پروپوز نہیں کیا، ابھی تک؟''

''اوہ...... ہاں، نہیں۔'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''لیکن وہ بہت جلد مجھے پروپوز کرنے والے ہیں۔ ابھی آج ہی وہ مجھ سے ممی ڈیڈی کے متعلق پوچھ رہے تھے میں نے صاف بتایا کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ سوائے ایک دوست کے۔ یقیناً وہ تمہارے پاس آئیں گے رفی، وہ تمہارا پوچھ رہے تھے۔''

''اچھا!''

میں لاشعوری طور پر ان کی منتظر رہی بلکہ میں نے ماسی بانو کو بھی بتا دیا تھا کہ اب شاید فرح چلی جائے۔

''میں کہتی ہوں بیٹا! تم بھی شادی کر لو۔'' ماسی فوراً نصیحتوں کا پٹارا کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

اور میں نے ہمیشہ کی طرح اسے ٹال دیا۔

دو ایک بار فرح نے مجھے بتایا کہ آج شاید بوبی اور اس کے ڈیڈی آئیں گے۔ میں نے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا مگر وہ نہ آئے اور دوسرے دن پتا چلا کہ انہیں کوئی ضرور کام پڑ گیا ہے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اسے بے وقوف بنا رہے ہیں اور انجوائے کر رہے ہیں لیکن وہ اتنی پر امید تھی کہ میں اس سے اپنے خدشات کا اظہار نہ کر سکی۔ ان دنوں مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ ینگ اور خوب صورت نظر آنے کی کوشش میں وہ ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ ٹین ایجر لڑکیوں والے ڈریسز خرید کر لاتی، اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ کاسمیٹکس پر خرچ کر رہی تھی۔

''اگر بوبی کے ڈیڈی تمہارے ساتھ مخلص ہیں تو پھر یہ ساری تھکن بے معنی ہے، پھر وہ خود کون سا ینگ ہیں، ایک جوان بچے کے باپ ہیں۔''

''نہیں یار، تجھے نہیں پتا، یہ مرد خود کیسے بھی ہوں لیکن عورت کو ہمیشہ خوب صورت اور سلم دیکھنا چاہتے ہیں۔''

اس نے ایک سلمنگ سینٹر بھی جوائن کر لیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کی ان ساری کوششوں کے باوجود بوبی کے ڈیڈی نے اسے ابھی تک پروپوز نہیں کیا تھا، جبکہ وہ اب بھی کبھی کبھار ان کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر چلی جاتی۔ بوبی کے ساتھ گپ شپ لگاتی اور مجھ سے مشورہ لیتی کہ اگر بوبی کے ڈیڈی نے اسے پروپوز کیا تو اسے کیا

کرنا چاہیے اور پھر خود ہی جواب بھی دے دیتی۔

''میرا خیال ہے رفی! مجھے شادی کر ہی لینی چاہیے۔ عارف کو تو پتا چلے کہ۔'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھتی۔ ''تم پر بھی تو بوجھ ہے نا۔ خواہ مخواہ تمہارے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

''فضول نہیں بکو۔'' میں اسے ڈانٹ دیتی۔ ''تمہارے آنے سے تو مجھے دوسراہٹ ملی ہے ورنہ کبھی کبھی تنہائی سے بہت خوف آتا تھا۔''

''اچھا میں آتی رہوں گی نا، تم سے ملنے بلکہ روز چکر لگاؤں گی۔ پتا ہے بوبی کے ڈیڈی بہت براڈ مائنڈڈ ہیں۔''

وہ بہت پر یقین تھی، جبکہ مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا۔ میرے نزدیک بوبی کے ڈیڈی کوئی قابل اعتبار شخص نہ تھے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا اور انہوں نے اسے پروپوز کر دیا۔

لمحہ بھر کو تو مجھے یقین نہ آیا۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو فرح!''

''ہوں ہوں، بالکل سچ۔''

''اور تم نے کیا کہا؟''

''میں نے......'' اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگے۔ ''سچ تو یہ ہے جانو، کہ عورت کو ہمیشہ ایک گھر، ایک سائبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد کے بغیر عورت بڑی بے وقعت ہے۔ بڑی بے وقار۔ اور طلاق یافتہ عورت تو...... عارف سے طلاق لے کر مجھے پتا چلا کہ طلاق یافتہ عورت تو معاشرے میں بالکل بے وقعت ہو جاتی ہے۔ بیوہ عورت کو پھر کچھ تھوڑا بہت احترام مل جاتا ہے۔ لیکن طلاق یافتہ کو نہیں۔ کتنی عجیب بات ہے رفی، چاہے عورت کا قصور ہو چاہے نہ ہو۔''

''تو تم نے ان کا پروپوزل Accept کر لیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں یار، میں نے کہا، ایک دو روز میں سوچ کر بتاؤں گی۔ بھئی، کچھ تو بھرم رکھنا تھا نا۔''

''بھرم کیسا'' میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ جو آئے دن تم ان کے ساتھ لنچ

اور ڈنر پر جاتی ہو، اس کے بعد بھی بھرم رہ جاتا ہے کیا۔ لیکن میں نے اس کی تائید کی۔

"ہاں بھئی، کچھ تو بھرم ہونا چاہیے۔"

"اور کیا...... یوں بھی بوبی کے ڈیڈی کہہ رہے تھے، تم اتنے سوچو، تب تک بوبی بھی آ جائے گا اور ہم سادگی سے نکاح کر لیں گے۔"

"بوبی کہاں ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"بوبی اپنی مما سے ملنے کراچی گیا ہے۔"

"بوبی کو اپنے باپ کی دوسری شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"اوہ نہیں یار، بوبی بہت سویٹ ہے اور اپنے پپا کا بہت اچھا دوست ہے۔ اور وہ تو کب سے اپنے ڈیڈی کو دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دے رہا ہے۔"

"اچھا۔ پھر تو پیشگی مبارک ہو۔"

"Thank You. Thank You" وہ اٹھ کر آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔

"سنو فرح! مجھے کچھ دنوں کے لیے بھائی کے گھر جانا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی کامیابی کی خوشی میں ایک فنکشن کر رہے ہیں۔ بھابھی بہت ضد کر رہی ہیں۔ میں ایک ہفتے کے لیے جاؤں گی۔ تم بھی چلو نا ساتھ۔"

"نہیں یار، میں نہیں جا سکتی۔ آفس سے شاید چھٹی نہ مل سکے۔"

میرے بڑے بھائی کھاریاں میں تھے اور حال ہی میں ان کے بیٹے نے ایف ایس سی میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ میں عبداللہ کے بعد کبھی گھر سے نکلی ہی نہ تھی اور جب سے بھائی کی پوسٹنگ کھاریاں ہوئی تھی بھابھی کتنی بار بلا چکی تھیں اور سنی تو مجھے بہت پیارا تھا اس نے دھمکی دی تھی کہ پھپھو اگر آپ نہ آئیں تو میں زندگی بھر آپ سے نہیں بولوں گا۔ ایک تو سنی کو انکار کر ہی نہیں سکتی تھی دوسرے فرح کی آمد کی وجہ سے میرے اندر چھائی اداسی کسی حد تک کم ہو گئی تھی اور میں اپنے علاوہ دوسروں کی طرف بھی دھیان دینے لگی تھی۔

"یار۔ ہفتہ بھر نہ سہی، فنکشن والے روز تو آ جانا۔ کھاریاں کون سا ہزاروں میل دور ہے۔ بھابھی کہہ رہی تھیں، فرح کو ضرور لانا۔ سچ تمہارے یہاں آ جانے سے اماں، بھائی اور بھابھی سب کو بڑا اطمینان سا ہو گیا ہے۔"

"پرامس رنی! فنکشن والے دن آ جاؤں گی۔"

"اور سنو کہیں ایسا نہ ہو تمہارے وہ بوبی صاحب پیچھے سے آ جائیں اور تم نکاح کر کے ان کے ڈیڈی کے ساتھ سدھارو۔ بھئی میرا انتظار کرنا۔ ہم تمہیں یوں ہی تھوڑا رخصت کریں گے۔ کچھ تھوڑا بہت تو کریں گے نا۔ چھوٹی موٹی پارٹی یا پھر ہلکا پھلکا سا لنچ ڈنر۔ آخر کو میکے والوں کا بھی تو کچھ بھرم ہوتا ہے۔"

"رنی...... رنی!" وہ ایک دم سے مجھ سے لپٹ گئی۔ "تم بہت اچھی ہو، بہت اچھی!" آنسوؤں سے اس کا گلا رندھ گیا۔

"پاگل!" میں نے اسے خود سے الگ کیا۔ "تم میری دوست ہو...... اور یہ میرا فرض بنتا ہے۔ بھیا بھابھی کو بھی بلا لیں گے۔ اماں اور منے بھیا تو یہاں ہی ہیں۔ بھئی چار لوگوں کی موجودگی میں رخصت کریں گے۔"

پتا نہیں کیوں، میں اس روز شوخ ہو رہی تھی۔ رات گئے تک وہ مجھے بوبی کے ڈیڈی کی خوبیاں گنواتی رہی۔ اگلے دو روز میں بہت مصروف رہی۔ آفس سے آ کر شاپنگ کے لیے چلی جاتی۔ سب کے لیے گفٹ وغیرہ خریدنے تھے۔ ان دو روز میں بوبی واپس نہیں آیا تھا۔ میں فرح کو کھاریاں آنے کی تاکید کر کے ایک ہفتے کے لیے چلی گئی۔ اگرچہ فرح نے وعدہ کیا تھا لیکن وہ کھاریاں نہ آئی۔ نہ جانے کیا بات تھی، شاید وہ ایک دن بھی بوبی کے ڈیڈی سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے سوچا۔ اور ایک ہفتہ سب کے ساتھ خوب انجوائے کر کے واپس آئی تو فرح خلاف توقع گھر میں ہی تھی۔

"ارے، تم آج آفس نہیں گئیں۔ خیریت، طبیعت تو اچھی ہے نا۔ کھاریاں بھی تم نہیں آئیں؟" میں نے بیگ رکھتے رکھتے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔

"ہاں طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"کیا ہوا ہے، ٹمپریچر......؟"

"ہوں۔" اس نے مختصراً کہا۔

میں ماسی کو چائے کا کہہ کر واپس آئی تو وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

"فرح کیا طبیعت خراب ہے؟ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں تم۔"

"نہیں۔ معمولی ٹمپریچر ہے، یونہی تھکن سی ہے۔"

ماسی بانو چائے لے کر آئی تو فرح بھی اٹھ بیٹھی اور پھر چائے پیتے ہوئے اس نے

پوچھا۔

''ہاں جی تمہارے وہ بوبی میاں آئے کہ نہیں۔''

''آ گیا ہے۔''

''ویری گڈ۔ پھر کب ارادہ ہے قاضی کو بلانے کو؟''

وہ خاموش ہی رہی تو میں نے خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت اپ سیٹ لگ رہی ہے۔

''فرح کیا ہوا ہے؟'' میں اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''وہ بوبی اپنی مما کو نے آیا ہے منا کر۔'' وہ یک دم میرے گلے لگ کر رونے لگی۔

''بی۔ ایزی پلیز، فرح! حوصلہ کرو ڈیئر دنیا کوئی بوبی کے ڈیڈی پر تو ختم نہیں ہوگئی نا۔''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے تسلی دوں۔ اس نے سر اٹھا کر شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تم...... تم نہیں سمجھو گی، میرے کرب کو، میری اذیت کو۔ رفی، تمہیں نہیں معلوم، تم نہیں جانتیں، عارف نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کبھی بھی اچھی بیوی نہیں بن سکتیں۔ اگر کبھی کسی نے تمہیں اپنا بھی لیا تو بہت جلد تم سے پیچھا چھڑا لے گا۔ مجھے کوئی بوبی کے ڈیڈی سے محبت نہیں ہوگئی ہے اور نہ میں ان کے عشق میں مری جا رہی ہوں۔ میں...... میں تو عارف کو بتانا چاہتی تھی کہ میں اچھی بیوی بن سکتی تھی، بن سکتی ہوں۔ وہ خود ہی اچھا شوہر نہیں بن سکا۔ اس نے میری قدر نہیں کی۔ میری محبت کی قدر نہیں کی۔ میں نے کتنی قربانیاں دی تھیں اس کے لیے۔ ماں باپ کو چھوڑا۔ وہ ساری آسائشیں جن کی عادی تھی، سب چھوڑ دیں۔ اس کے چھوٹے سے گھر میں صرف اس کی محبت کے سہارے بہت خوش اور بہت مطمئن تھی۔ اگر مجھ میں کچھ خامیاں بھی تھیں تو اسے چاہیے تھا کہ وہ محبت سے، پیار سے مجھے سمجھاتا، بتاتا مگر رفی، اس نے تو زبان پر طنز کے انگارے رکھ لیے تھے۔ جنہیں ہر وقت اگلتا رہتا تھا۔ صرف چھ ماہ...... ہاں چھ ماہ میری زندگی کے وہ یادگار دن ہیں، جب ہم دونوں اکیلے تھے۔ میں جیسا بھی پکاتی، کچا پکا ہم خوش ہو کر کھاتے۔ وہ میری حوصلہ افزائی کرتا۔ پھر ڈیڈی کراچی آئے، انہوں نے ہمیں نسبتاً اچھا فلیٹ لے کر دیا۔ عارف کو اچھی جاب دلوائی اور وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اس

کے لیے کراچی میں کوئی بزنس سیٹ کر دیں گے۔''

وہ مسلسل بول رہی تھی اور میں خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''اور پھر ڈیڈی کے جانے کے بعد وہ لاہور آیا تو اپنی ماں اور بہنوں کو ساتھ لے آیا۔ یقین کرو رفی، عارف سے زیادہ میں خوش تھی کہ بالآخر سب کی ناراضی ختم ہوگئی ہے اور اب ہم زندگی کو زیادہ انجوائے کریں گے۔ ڈیڈی نے وعدہ کیا تھا کہ اب کے وہ کراچی آئے تو ممی اور بھائی کو بھی لے کر آئیں گے۔ لیکن رفی، ممی اور ڈیڈی آئے تو عارف نے ان سے بہت بدتمیزی کی اور ایک طرح سے انہیں گھر سے نکال دیا اور مجھے ان سے کبھی نہ ملنے کے لیے کہہ دیا۔ ڈیڈی اس کے رویے پر بہت حیران تھے۔ میں نے جو سوچا تھا کہ ماں اور بہنوں کے آنے سے عارف اور میں زیادہ انجوائے کریں گے، وہ تو محض خواب تھا۔ دن بھر عارف کی ماں اور بہنیں انگارے اگلتیں اور رات کو وہی انگارے عارف کی زبان پر آ جاتے۔ برتن دھوتے دھوتے میرے ہاتھ، کھردرے ہو گئے تھے۔ میں صبح سے شام تک گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ صلہ کچھ نہیں تھا۔ شروع شروع میں عارف چند محبت کے بول بولتا اور میری ساری تھکن ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر وہ محبت بھرے لفظ کہنا بھول ہی گیا تھا۔ دن بھر اس کی ماں کچھ کہتی تھی، اس کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ اس طرح سے بھاگ آنے والی لڑکیوں کا حشر مجھ سے بھی برا ہوتا ہے۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے اپنا آپ گھسا ڈالا رفی، اپنے آپ کو دھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچوڑا۔ لیکن رفی، پھر بھی...... پھر بھی ایک دن عارف نے مجھے طلاق دے دی۔ میں نے کتنی منتیں کیں۔ اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا کہ وہ مجھے طلاق نہ دے بھلے دوسری شادی کر لے لیکن رفی، اس نے پھر بھی مجھے طلاق دے دی۔''

''مگر...... مگر تم تو کہہ رہی تھی کہ عارف نے تم سے خود طلاق لی ہے؟''

''جھوٹ بولا تھا، میں نے غلط کہا تھا میں نے۔''

''میں نے صرف اور صرف محبت کا بھرم رکھا تھا رفی، میں نہیں چاہتی تھی کہ تم بھی میری بھابیوں اور میرے بھائیوں کی طرح یہ کہو کہ عارف نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی تھی۔ اور یہ میں ہی تھی، زبردستی بندھن باندھنے والی۔ بھلا زبردستی بھی کوئی بندھن بندھا ہے رفی!''

''میرا قصور صرف یہ تھا نا کہ میں نے پہل کی تھی، اور میری محبت عارف کی محبت

کے مقابلے میں زیادہ جرأت مند تھی، زیادہ حوصلہ تھا مجھ میں۔ بس...... عارف نے بھی مجھ سے محبت کی تھی...... کی تھی نا رفی! تم کو تو پتا ہے نا، یہ سچ ہے بالکل سچ۔ کیا تھا...... کیا تھا رفی اگر وہ مجھے طلاق نہ دیتا۔ اس محبت کے عوض جو اس نے مجھ سے کی تھی۔ میری محبت کا کچھ تو بھرم رہ جاتا...... کچھ تو۔"

میں نے اسے بے اختیار گلے لگالیا اور......

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور میرا دل چاہا کہ میں بھی رونے لگوں، اس کی طرح اونچا، چیخ چیخ کر محبت کے یوں بے بھرم ہونے پر۔

....

لکی گرل

چھت پر کھڑے کھڑے اچانک اس کی نظر نیچے صحن میں کھڑی اماں پر پڑی جو خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سٹپٹا کر اس نے سامنے والی چھت پر کھڑے اچھو کو دیکھا جو اس سے قطعی بے نیاز آسمان پر اڑتے کبوتروں کی طرف متوجہ تھا۔

"نیچے اترنا مراد! یا اب اوپر آ کر جوتے لگاؤں۔" اماں نیچے سے دہاڑیں تو وہ غصہ بھری نظر اچھو پر ڈالتی کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر آئی۔

"کمبخت کے اتنے موٹے موٹے دیدے ہیں اور میں اسے دکھائی ہی نہیں دیتی۔ اندھا ہے لبو۔" اس نے جھنجلا کر سوچا۔

تین دن سے وہ مسلسل چھت پر آ رہی تھی لیکن وہ اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ بس اپنے کبوتروں کے ساتھ ہی مصروف رہتا۔

"اب اتر بھی چک۔" اماں سیڑھیوں کے عین سامنے آستین چڑھاتے کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھیں۔ مارپیٹ کے خوف سے وہ آخری سیڑھی پر ہی رک گئی۔ مگر اماں نے بازو سے پکڑ کر اسے نیچے گھسیٹ لیا۔

"میں بھی کہوں، یہ روز روز چھت پر کیوں بھاگی جاتی ہے۔ اب پتا چلا کہ دیدے مٹکانے جاتی ہے۔"

"اماں، دل گھبراتا ہے۔ اتی تو گرمی ہوتی ہے" وہ منہ ہی منہ میں منمنائی۔

"تیرا دل تو بہت نازک ہے نا نواب زادی کبریٰ کا دل کیوں نہیں گھبراتا۔ میرا دل بھی کبھی نہ گھبرایا اور تو۔" انہوں نے ایک دوہتڑ اس کی پیٹھ پر لگایا۔ "تیرا دل بہت گھبراتا

ہے۔"

"اماں تو تو بس یونہی ہر بات پر شک کرتی ہے۔" اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"چل چپ زیادہ بک بک نہ کر۔" انہوں نے پھر اس کے بالوں کو پکڑ کر جھونٹا دیا۔

"تیری تو آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔ تجھے وہ آٹھ ہاتھ کا موا مسٹنڈا نظر نہیں آتا کمبخت کبوتر باز۔"

"وہ مجھے تھوڑا ہی دیکھتا ہے۔ وہ تو بس اپنے کبوتر اڑاتا رہتا ہے۔" اس نے جل کر کہا۔ "ابا کی قسم لے لو جو ایک بار بھی اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا ہو۔"

اماں نے اسے گھورا لیکن ابا کے نام پر ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور اس نے سر کو تھوڑا سا پیچھے کر کے اپنے بال چھڑا لیے۔

"ارے نہیں دیکھتا، پر کھڑا تو رہتا ہے نا چھت پر۔ لوگ کیا کہیں گے کہ شریف الدین کی بیٹی اور......" انہوں نے ایک ایک ٹھنڈی آہ بھری اور آنکھوں سے نمی جھانکنے لگی۔ اور وہ اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"اللہ کرے موتیا اتر آئے کمبخت آنکھوں میں۔ اتنے موٹے موٹے دیدے ہیں اور۔" اس نے غصے سے سوچا اور آنسو پونچھتے ہوئے اماں کے پاس سے ہٹ آئی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ صحیح وقت پر ابا کی یاد نے آ کر اسے اماں کی مزید مار سے بچا لیا تھا۔ ورنہ اماں ایک دو تھپڑوں پر تو اکتفا کرتی نہیں تھیں۔ دھنک کر رکھ دیتی تھیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اگر کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو ڈاکٹر پیسے بھی لے گا اور مصیبت الگ ہو گی۔

اس نے پیٹھ سہلاتے ہوئے اماں کو دیکھا جو دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ اب یہ پروگرام یقیناً گھنٹا بھر تو چلے گا ہی۔ اماں پلو سے آنکھیں پونچھتی جائیں گی اور ابا کی خوبیاں بیان کرتی جائیں گی۔ ان کی شرافت اور عاجزی وانکساری کے قصے۔

اماں بھی بڑی زبردست مقرر ہیں۔

ایک بار اس نے کبریٰ سے کہا تھا۔

"اگر لوگ اماں کا یہ رقت انگیز بیان سن لیتے تو مولانا راشد کو "مصورِ غم" کہنے کے بجائے اماں کو یہ لقب دیتے۔"

وہ اماں کا بیان سننے سے پہلے ہی وہاں سے کھسک آئی۔ ایک تو دل پہلے ہی اس کی بے توجہی پر کلس رہا تھا اس پر کون گھنٹا بھر گردن جھکا کر اماں کا رقت انگیز بیان سنتا۔ گردن ہی اکڑ جاتی تھی۔ اس پر اماں کی خواہش یہ بھی ہوتی کہ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر آنسو بہائے جب کہ اسے تو ابا کی شکل تک یاد نہ تھی زیادہ سے زیادہ چار سال کی تو ہو گی وہ جب ابا دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ کبریٰ چھ سال کی اور منو دو سال کا اور سکو یہی کوئی آٹھ ماہ کا تھا۔ ابا کو بھی تو بس جانے کی جلدی تھی۔ کیا ہرج تھا اگر دو تین سال اور ٹک جاتے۔ کم از کم اماں کا ساتھ دینے کے لیے اس کے پاس ابا کی کوئی یاد تو ہوتی۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ باتھ روم کی طرف مڑ گئی۔ اور باتھ روم کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں اس نے اپنا جائزہ لیا۔

"اللہ۔" میں کتنی خوبصورت ہوں۔

یہ بڑی بڑی آنکھیں۔

ستواں ناک۔

خم کھائے ہونٹ۔

اور رخساروں میں پڑنے والے گڑھے۔

اور یہ اتنا پیارا گلابی رنگ۔

اور میں کسی کو دکھتی ہی نہیں۔

ایک وہ چپٹی ناک والی ٹیمی ہے۔ جسے دیکھو اسی پر مر رہا ہے۔ ہوں جانے کیا ہے اس میں۔" اس نے ہولے سے سر جھٹکا۔

"اے کھدو! اب نکل بھی چک۔ مجھے نہانا ہے۔ جانے کیا دوستی ہے تیری باتھ روم سے گھنٹوں گھسی رہتی ہے۔" کبریٰ نے بھی اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔

"ہزار بار تجھ سے کہا، مجھے کھدو نہ کہا کرو۔" اس نے غصے سے دروازہ کھول دیا۔

"تو پھر کیا کہوں مہارانی، شہزادی یا ملکہ۔"

"تم میرے نام سے نہیں بلا سکتیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"نام ہی سے تو بلاتی ہوں۔"

"میرا نام خدیجہ ہے۔"

"لو اب کون اتنی دیر لگائے بلانے میں خو...... دی...... جا۔"

"تو پھر کوئی اچھا سا، پیارا سا نام لے کر بلا لیا کرو نا۔"

"اچھا سا پیارا سا۔" کبریٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں جیسے۔ سوئیٹی۔"

"سوئیٹی! ہا...... ہا...... ہا......" وہ ہنسنے لگی۔ "آئندہ سیٹی کہہ کر ہی بلایا کروں گی۔"

"سیٹی نہیں، سوئیٹی۔"

"بھئی ہمیں تو سیٹی ہی اچھا لگتا ہے۔" کبری کپڑے اٹھائے جھپاک سے اندر گھس گئی اور اسے باہر دھکیل دیا۔ "اب جاؤ بھی، مجھے نہانے دو۔"

"اماں کی قائم مقام۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑ بڑا کر باہر نکل آئی اور کن اکھیوں سے صحن کی طرف دیکھا۔ اماں کا پروگرام جاری تھا۔ ہلکی ہلکی سسکیاں اور وقفے وقفے سے سوں سوں کی آواز آ رہی تھی۔ منو اور ککو اماں کے گرد سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزر کر کمرے میں آ گئی اور اپنے بستر پر لیٹ کر ٹیمی کے متعلق سوچنے لگی۔

جب سے ٹیمی سے اس کی دوستی ہوئی تھی اس کا مزاج ہی بدل گیا تھا۔ ٹیمی بہت ماڈرن لڑکی تھی اور کوئی چھ ماہ قبل ہی اس کے اسکول میں داخل ہوئی تھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ پہلے ہی دن اس کی ٹیمی سے دوستی ہو گئی تھی۔ اگرچہ عمر میں اس سے کافی بڑی لگتی تھی اور پہلے دن جب وہ اسکول آئی تو سب نے سمجھا کہ شاید وہ کوئی نئی ٹیچر ہے لیکن جب وہ کلاس روم میں کاپیاں اٹھائے اس کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی تو زینی نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ نے دسویں میں داخلہ لیا ہے۔"

"ہاں۔" اس نے مڑ کر زینب کو دیکھا تھا اور پھر خدیجہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

اور پھر چند ہی دنوں میں وہ دونوں گھل مل گئی تھیں۔ اسے ٹیمی بہت اچھی لگی تھی حالانکہ بظاہر دیکھنے میں وہ بہت مغرور لگتی تھی مگر اس میں ذرا بھی غرور نہ تھا۔ اس کے والد محکمہ جنگلات میں تھے اور ان کا ٹرانسفر یہاں ہوا تھا۔ وہ کچھ زیادہ دولت مند تو نہیں تھی۔ اسی کی طرح بس میں آتی تھی لیکن اس کا رکھ رکھاؤ اور بات چیت کا انداز ان سب سے مختلف تھا۔ اور پھر اسے جن باتوں کا علم تھا وہ زینب، مدیحہ، نازیہ سب کے لیے نئی تھیں۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی تھیں۔ سینکڑوں فلموں کی تو اسے کہانیاں ازبر تھیں اور اکثر فارغ وقت میں وہ

ان کی فرمائش پر کسی نہ کسی فلم کی اسٹوری سناتی۔ خدیجہ کو فلموں کی کہانیاں سننا بہت پسند تھا۔ اگرچہ پوری کلاس کے ساتھ ہی وہ اچھی طرح پیش آتی تھی لیکن خدیجہ کے ساتھ تو اس کی گہری دوستی تھی اور کبھی کبھی تفریح کے وقت وہ اور ٹیمی سب سے چھپ کر سائنس بلاک کے پچھلے حصے کی طرف چلے جاتے اور پھر ٹیمی اسے سکندر بھائی، مراد بھائی اور نادر بھائی کے متعلق بتایا کرتی۔

"پتا ہے خدیجہ! سکندر بھائی تو مجھ پر مرتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ٹیمی اگر تو مجھے نہ ملی نا تو میں مرجاؤں گی۔"

"تو پھر تمہاری شادی کس طرح ہو گی ٹیمی اگر تمہارے ابا نے۔"

"اوہ پپا میری بات نہیں ٹالتے۔ وہ تو میں خود ہی ذرا۔"

"تمہیں سکندر بھائی پسند نہیں ہیں۔ اتنے اچھے تو ہیں۔ وہ تم سے اتنا پیار کرتے ہیں اور تم خواہ مخواہ ہی۔"

"وہ تو صحیح ہے سوئیٹی! مگر مجھے بس مراد بھائی کا خیال آ جاتا ہے۔ جب سے یہاں آئی ہوں روز ایک خط آ جاتا ہے ہر روز رات کو فون کرتے ہیں۔"

"یہ مراد بھائی کون ہیں؟"

"یہ بھی میرے خالہ زاد بھائی ہیں۔"

"دونوں بھائی ہیں کیا؟"

"نہیں بھئی سکندر بھائی تو چھوٹی خالہ کے بیٹے ہیں نا، جو یہاں رہتی ہیں اور وہ مراد بھائی لاہور والی خالہ کے بیٹے ہیں۔ پتا ہے مراد بھائی کہتے ہیں کہ ٹیمی دل چاہتا ہے تو میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں تجھے تکتا رہوں اور وقت ٹھہر جائے۔"

"اچھا!" وہ حیرت سے اسے دیکھتی۔

"بھلا ٹیمی میں ایسی کیا بات تھی کہ آدمی اسے دیکھتا ہی رہے۔

چپٹی سی ناک۔ زیرے جیسی آنکھیں، ہونٹ بھی قدرے پھیلے ہوئے تھے۔ شاید مراد بھائی سوچتے ہوں کہ یہ ناک اگر ذرا سی اٹھی ہوئی ہوتی اور یہ آنکھیں ذرا سی بڑی ہوتیں۔ یا پھر یہ کہ۔"

اور ٹیمی سرخ سرخ چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ بتائے جاتی۔

''اور میں ایک بار مراد بھائی کے ساتھ ایوب پارک گئی تھی۔ وہاں ہر درخت پر مراد بھائی کے اپنے نام کے ساتھ میرا نام لکھا تھا۔ کبھی تم وہاں جاؤ نا تو دیکھنا ابھی تک لکھا ہوگا۔''

''میں کہاں جاؤں گی۔'' وہ افسردہ ہوگئی تھی۔'' اماں محلے میں تو کہیں جانے نہیں دیتیں اتنی دور راولپنڈی کہاں بھیجیں گی۔''

''اچھا! تم لوگ اتنے بیک ورڈ ہو۔ میں تو ایک بار مراد بھائی کے ساتھ چھٹیوں میں سوات گئی تھی۔ پورے سات دن ہم رہے تھے وہاں۔ سچی اتنا مزہ آیا تھا میں کیا بتاؤں۔''

''تم اکیلی گئی تھی وہاں؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''نہیں مراد کی بہنیں بھی تھیں۔ پر ہم دونوں اکثر اکیلے گھومنے نکل جاتے تھے مراد کہتا تھا۔

''ٹیمی! تم میرے ساتھ ہو تو لگتا ہے جیسے دنیا میں کوئی غم نہیں ہے۔''

ٹیمی کی باتیں سن سن کر مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھٹنے لگتی تھیں۔

☆☆☆

''اماں!'' ایک بار اس نے اماں سے پوچھا تھا۔ جب ابا زندہ تھے تو کیا تمہیں کبھی وہ سینما لے گئے تھے۔ اماں تم نے کبھی فلم دیکھی ہے۔ یہ سینما ہال اندر سے کیسا ہوتا ہے۔''

''چل ہٹ۔'' اماں نے اسے جھڑک دیا تھا'' شریف الدین صرف نام کے ہی شریف نہ تھے سچ مچ شریف تھے پانچ وقت کے نمازی۔''

اور اس سے پہلے کہ اماں کا بیان جاری ہوتا وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی اور جب یونہی ایک دن اس نے ٹیمی کو بتایا کہ اس نے زندگی میں کبھی فلم نہیں دیکھی تو مارے حیرت کے ٹیمی نے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

''سچی خدیجہ! یقین نہیں آتا۔''

''سچی۔''

''تو چل آج میرے ساتھ ہمارے گھر۔ وی سی آر پر فلم دیکھیں گے۔ امیتابھ کی فلم اچھی ہے۔ کل ہی مجھے سکندر نے لا کر دی ہے۔''

''نہیں آج نہیں، اماں سے پوچھ کر کل تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

اور پھر اگلے دن وہ اس کے ساتھ گھر چلی گئی تھی۔ ٹیمی کا گھر تو کوئی بہت اچھا نہ

تھا۔ لیکن سامان بے حساب تھا۔ ڈرائینگ روم میں قیمتی صوفے کلر ٹی وی، فریج اور اس روز اس نے فلم دیکھی تو اسے بہت لطف آیا۔

پہلے پہل تو وہ بہت شرمائی، جب کوئی گانا شروع ہوتا تو وہ آنکھیں بند کر لیتی یا ادھر ادھر دیکھنے لگتی ایک بار ٹیمی نے اس کی چوری پکڑ لی تو خوب ہنسی۔

''یہاں میرے اور تمہارے علاوہ کون ہے بھئی، بلا جھجک دیکھو۔''

ٹیمی کی ممی گھر پر نہیں تھیں اور پپا دفتر میں تھے۔ گھر میں صرف ایک نوکرانی اور ایک اوپر کے کام والا لڑکا تھا۔

ہولے ہولے اس کی جھجک ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار ٹیمی کے ساتھ پڑھنے کا بہانہ کر کے فلم دیکھنے آئی تھی۔ کبھی ٹیمی کی ممی بھی ان کے ساتھ ہی فلم دیکھتیں اور کبھی وہ دونوں اکیلی ہوتیں۔ فلم دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ کئی بار تو تصور ہی تصور میں وہ خود کو ہیروئن سمجھنے لگتی جیسے سب کچھ اس پر بیت رہا ہو۔ اور وہ ارد گرد سے بے خبر ہوتی۔ تب ٹیمی اسے بلاتی تو وہ چونک پڑتی......

''کہاں کھو گئی ہو بھئی۔''

''کہیں نہیں۔'' وہ نادم ہو جاتی کہ کہیں ٹیمی کو اس کے خیالات کا علم نہ ہو جائے۔

ایک روز جب وہ فلم دیکھ رہی تھی تو اچانک ہی سکندر آ گیا تھا اور پھر اسے دیکھ کر فوراً ہی باہر نکل گیا تھا باہر سے ہی ٹیمی کو آواز دی تھی۔

''ٹیمی! آنٹی کہاں ہیں؟''

''ممی اپنے کمرے میں ہی ہوں گی سکندر بھائی۔'' ٹیمی اٹھ کر باہر چلی گئی تو اس نے بڑی حیرت سے سوچا تھا۔

''تو یہ ہیں سکندر بھائی! ٹیمی کے باہر جانے کے بعد اس نے بڑی حیرت سے سوچا۔'' اللہ، یہ تو امیتابھ اور عامر خان سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ اور ٹیمی تو۔''

''سچی ٹیمی! سکندر بھائی تو بہت اچھے ہیں، تم یونہی انہیں لفٹ نہیں کراتی ہو۔'' جب ٹیمی واپس آئی تو اس نے کہا۔

''یہ تو دل کی بات ہوتی ہے نا اور پھر مراد کو تم نے نہیں دیکھا۔ سکندر بھائی تو اس کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔''

اور اسے ٹیمی پر بہت رشک آیا تھا۔

سکندر اور مراد ہی نہیں اس کے پپا کے ایک دوست کے بیٹے نادر بھائی بھی دل و جان سے اس پر فریفتہ تھے۔ وہ ٹیمی کے گھر سے آ کر گھنٹوں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی اور اس سے اپنا موازنہ کرتی رہتی وہ تو ٹیمی سے ہزار گناہ زیادہ خوبصورت تھی پھر۔

اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی آس پاس کہیں بھی کوئی ایسا بندہ نظر نہ آیا جو سکندر بھائی کی طرح خوبصورت ہو اور اس پر اس طرح دل و جان سے فریفتہ ہو جائے جس طرح سکندر بھائی ٹیمی پر تھے۔

ننھیال میں اس کی صرف ایک خالہ اور ایک ماموں تھے۔ خالہ کے چار بیٹے تھے بڑا بیٹا جگنو اس کا ہم عمر تھا۔ یا پھر شاید اس سے تھوڑا چھوٹا ہو لیکن پڑھتا دسویں میں ہی تھا اور ماموں کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا حیدر، بہت سنجیدہ اور متین سا پڑھائی کے ساتھ ساتھ کہیں سروس بھی کر رہا تھا۔

اور ددھیال میں صرف ایک پھپھو تھیں۔ انتہائی بدمزاج اور لڑاکا سی۔ ابا کے مرنے کے بعد بہت کم آتی تھیں ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی انہی کی طرح بدمزاج اور لڑاکا۔

"جگنو کیسا رہے گا اگر۔" اس نے اپنی چار پائی پر بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں ٹھوڑی رکھے ہوئے سوچا۔

"ہے تو خوبصورت گورا سا، اسمارٹ سا مگر ہے بونگا سا۔ سارا وقت کتابوں ہی میں گھسا رہتا ہے۔ جبھی تو اتنی موٹی عینک چڑھا رکھی ہے۔

اور حیدر بھائی۔

اتنے سنجیدہ سے ہیں کہ کبھی مہینوں بعد جب آتے ہیں تو وہ ایک بار سلام کر کے دوبارہ پھر کبھی ان کے سامنے آتی ہی نہیں۔

اور شکور بھائی۔

پھپھو صاحبہ کے صاحبزادے تو اسے شروع سے ہی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ ہٹلر ٹائپ، مونچھیں پھر عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے کا اسٹائل اور سونے پر سہاگہ ان کا ہکلا پن...... اگر خدانخواستہ انہیں مجھ سے محبت ہو بھی گئی تو کیا کہیں گے۔"

"خا...... خا...... خدیجہ...... م...... میں تم سے محا...... محا...... بت کرتا ہوں۔"

تو پھر بچا کون تھا۔

جگنو۔ حیدر بھائی اور شکور بھائی کو ریجکٹ کرنے کے بعد تو پیچھے خالہ کے تینوں سپوت ہی رہ گئے تھے، سر سر کر کے ناک صاف کرنے والے چھوٹے والے کو تو ابھی نیکر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں ادھر ادھر گھٹنوں کے بل لڑھکتا پھرتا تھا۔"

اس پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

اور وقتی طور پر وہ تینوں کا خیال جھٹک کر پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ مگر ٹیمی کی باتیں سن سن کر اس کا دماغ خراب ہو چلا تھا۔

اللہ مجھے بھی کوئی اس طرح چاہیے۔

ایسی ہی باتیں کرے۔

یوں ہی محبت بھرے خط لکھے۔

اس روز ٹیمی نے اسے مراد بھائی کا خط پڑھوایا تو اس کے اندر آگ سی لگ گئی تھی۔

ٹیمی سے اسے بڑی جلن محسوس ہوئی۔

کاش ٹیمی کی جگہ وہ ہوتی۔

مراد اسے خط لکھتا۔

اس روز اسکول سے آ کر اس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اماں، آج خالہ کے ہاں چلو۔"

"لو اتی گرمی میں میرا دماغ خراب ہے کہ چھ میل چل کر جاؤں۔"

"شام کو چلیں گے نا۔ سچی بہت دل کر رہا ہے ان سے ملنے کو۔"

"واہ، یہ بیٹھے بٹھائے خالہ کی محبت کیسے جاگ پڑی تیرے دل میں۔ پچھلے سال وہ بیمار ہوئی تو کیسی منتیں کی تھیں اس نے کہ دو چار روز کے لیے کھدو کو ادھر ہی رہنے دے۔ بے چارے بچوں کو کوئی چائے پانی دینے والا بھی نہیں تھا۔ پھر تو اکڑ گئی تھی کہ میں نہیں رکوں گی۔"

اوہ، اماں! آپ بھی کتنی پرانی بات لے بیٹھی ہیں۔ پڑھائی کا ہرج ہوتا تھا نا۔ قسم سے اب اگر خالہ بیمار ہوں تو تین دن چھوڑ کر دس دن رہ لوں گی۔"

"اے پرے ہٹ۔ خدا نہ کرے کہ وہ بیمار ہو۔" اماں نے اسے پیچھے دھکیل دیا لیکن وہ اماں کی منتیں کرتی رہی اور اماں کو منا کر ہی چھوڑا۔

شام کو وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔عید والا گلابی کاٹن کا سوٹ پہنا تھا اور گلابی رنگ کا ربن بھی بالوں میں باندھا تھا۔ آنکھوں میں کاجل لگا کر وہ کتنی ہی دیر تک آئینے میں خود کو دیکھتی رہی تھی۔

''اماں!'' کبریٰ نے فوراً ہی اس کی شکایت لگائی۔ ''کھدو نے عید والا جوڑا پہن لیا ہے۔''

''ہاں، اس کے پیٹ میں تو مروڑ اٹھتے رہتے ہیں۔ جب تک کپڑوں کو مسل کر نہ رکھ دے۔'' انہوں نے اسے گھورا۔ پھر چلاتی ہوئی بولیں۔ ''تیری خالہ کا بیاہ ہے جو نیا جوڑا منڈھ، لیا اور سن میں نے کہہ دیا تھا بڑی عید پر بھی یہ جوڑا پہننا ہے۔کوئی نیا جوڑا اور نہیں بنانا میں نے۔صرف دو دکانوں کا کرایہ اور اتنا بڑا ''کنبہ'' صرف میرا ہی کلیجا ہے جو سب کا خرچ پورا کرتی ہوں۔''

''اماں میں کپڑے خراب نہیں کروں گی۔ آتے ہی اتار دوں گی۔'' وہ منمنائی اور پھر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ہنسی۔ ''اور یہ جو تو خالہ کا بیاہ کر رہی ہے نا اگر خالو کو پتا چلا نا تو۔''

''چل ہٹ تو تو زبان پکڑتی ہے۔'' انہوں نے اپنا شٹل کاک برقع سر پر رکھا تو وہ جلدی سے چادر اوڑھ کر ان کے پیچھے لپکی اور خالہ کے گھر پہنچ گئی۔

''خالہ! جگنو کہاں ہے؟'' تھوڑی دیر خالہ کے پاس بیٹھ کر اس نے پوچھا۔

''ارے بیٹا، ہوگا کہاں، اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا ہوگا۔'' خالہ نے ناگواری سے جواب دیا۔

اور پھر وہ جگنو کے کمرے میں چلی آئی۔

''اسلام علیکم!'' دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اس نے کہا۔اور ذرا سا مسکرا کر جگنو کی طرف دیکھا جو چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا؟

''اے اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ بڑی ادا سے چلتی اس کے قریب چلی آئی۔

''اگر پہچانا نہ ہو تو ہم اپنا تعارف کروا دیں۔''

جگنو جھینپ گیا۔

''ہم خدیجہ ہیں۔ آپ کی بڑی خالہ کی بیٹی اور ہم میٹرک میں پڑھتے ہیں۔''

اس نے دل ہی دل میں کسی فلم کے ڈائیلاگ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''کمال کرتی ہو خدیجہ! بھلا یہ سب بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے نہیں پتا کیا۔''

''اتنی حیرت سے جو دیکھ رہے تھے۔''

''حیرت سے نہیں۔ میں دھیان سے پڑھ رہا تھا تم نے اچانک سلام کیا تو چونک پڑا۔''

''کیا پڑھ رہے تھے بھلا۔''

''فزکس۔'' اس نے پھر کتاب کھول لی اور کتاب پر نظریں دوڑاتے دوڑاتے پوچھا۔''خالہ بھی آئی ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''پڑھتے تو تم روز ہی ہو جگنو! آج مت پڑھو۔ اتنی دور سے تو تمہیں ملنے آئے ہیں ہم۔''

''تم اماں سے باتیں کرو نا جا کر۔ میرا صبح ٹیسٹ ہے اور ہمارے فزکس کے سر بڑے خونخوار ہیں، مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جگنو نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

لمحہ بھر وہ یونہی اسے دیکھتی رہی۔ جگنو سکندر بھائی سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ لیکن نرا ڈل تھا...... اسے اس بات کی کوئی پروا ہی نہیں تھی کہ ایک اتنی خوبصورت لڑکی اس کے قریب بیٹھی ہے۔ وہ تو بس اپنی کتاب میں گم تھا۔ جبکہ فلموں میں تو ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

''اللہ اسے کیسے اپنی طرف متوجہ کروں۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔ ''جگنو تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟''

''ڈاکٹر۔'' جگنو کی نگاہیں بدستور کتاب پر دوڑ رہی تھیں۔

''میں بھی ڈاکٹر بنوں گی۔ دونوں ڈاکٹر ہوں گے تو کتنا......''

''تم بھلا کیسے ڈاکٹر بنو گی۔ تم تو آرٹس پڑھتی ہو۔'' جگنو نے کتاب سے نظریں اٹھائیں۔

''کیا آرٹس پڑھ کر آدمی ڈاکٹر نہیں بن سکتا جگنو۔''

''تم بھی بس۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''بھلا آرٹس پڑھ کر بھی ڈاکٹر کس طرح بنو گی پاگل۔''

''بھئی، وہ والی ڈاکٹر۔'' اسے بروقت سوجھ گئی ''جیسے علامہ اقبال ڈاکٹر تھے۔''

"اچھا اچھا۔" جگنو کا سر پھر کتاب پر جھک گیا۔

"جگنو تم نے کبھی امیتابھ کی فلم دیکھی ہے۔ وہ ریکھا کتنی خوبصورت ہے اور وہ۔"

"پلیز خدیجہ! مجھے پڑھنے دو۔ میرا صبح ٹیسٹ ہے۔" اس نے جھنجلا کر کہا تو وہ مایوس سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"احمق! بے وقوف عقل ہی نہیں ہے، اس نے جھنجلا کر سوچا۔

"بس سارا وقت کتابوں ہی میں گھسا رہتا ہے۔ پڑھ پڑھ کر پاگل ہو جائے اللہ کرے۔"

وہ باہر آ کر خالہ اور اماں کے پاس آ بیٹھی اور پھر جتنی دیر وہ وہاں رہی۔ انتہائی بوریت محسوس کرتی رہی۔ خواہ مخواہ میں اتنا تردد کیا نیا سوٹ پہنا اور حاصل کچھ نہیں ہوا۔

پر۔

اس روز وہ بہت افسرہ ہو رہی اور اس نے سوچا کہ اس کی ایسی قسمت کہاں ٹیمی جیسی۔

"جگنو نہ سہی، حیدر بھائی بھی تو ہیں نا۔"

رات اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا۔

"کیا ہرج ہے اگر قسمت آزما لی جائے۔ پھر حیدر بھائی تو جگنو کی طرح بے وقوف بھی نہیں ہیں۔"

"اماں!" صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی اس نے اماں کو پکارا۔

"کیا ہے؟" اماں ابھی نیند میں ہی تھیں۔

"اماں! خالہ نے ماموں کا کچھ بتایا تھا، کیسے ہیں وہ۔"

"اے صبح صبح ماموں کا خیال کیسے آ گیا؟" اماں اٹھ بیٹھیں۔ "راشدہ کہہ تو رہی تھی، ہفتہ بھر پہلے گئی تھی ادھر سب ٹھیک ہیں۔"

"اماں، میں نے خواب میں ماموں کو بہت بیمار دیکھا ہے۔"

"ہائے خدا خیر کرے۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ خدا زندگی دے اسے۔ صبح صبح یہ تو نے کیسی خبر سنائی۔"

☆☆☆

"یہ تو خواب ہے اماں اور خوابوں کی تعبیر تو ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔"

"پر میرے دل کو تو پریشانی لگ گئی ہے نا۔ اب جب تک اسے دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"تو پھر آج شام کو منو کو لے کر چلی جانا دیکھ آنا۔"

"ہاں، چلی جاؤں گی۔"

"ہرے۔" اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا۔

اس کی چال کامیاب ہو گئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اگر اس نے یونہی ماموں کے گھر چلنے کی فرمائش کی تو اماں کبھی بھی نہ مانیں گی۔ ابھی کل ہی تو وہ خالہ کے گھر گئی تھی۔

اسکول میں سارا دن اس کے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔ کئی بار اس کا دل چاہا وہ ٹیمی کو بتائے کہ اس کے ایک کزن ہیں حیدر بھائی۔ بالکل سکندر بھائی جیسے اور یہ کہ وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئے ہیں لیکن پھر اس نے قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ خدا خدا کر کے چھٹی ہوئی مگر اماں تو کھانا کھا کر لمبی تان کر سو گئی تھیں۔ دو تین بار اس نے نے چپکے چپکے جھانک کر اماں کے کمرے میں دیکھا۔ اماں سو رہی تھیں اور جب وہ مایوس ہو چلی تو اس نے سنا اماں کہہ رہی تھیں۔

"کبریٰ بیٹی! ذرا جلدی سے چائے بنا دو۔ میں تمہارے ماموں کے ہاں ہو آؤں۔"

ساری دوپہر تو اس نے جاگتے گزار دی تھی اور اب سونے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ اماں کی آواز سن کر اچھل بیٹھی اور فوراً ہی منو اور ککو کو کاپی لینے کے بہانے باہر بھیج دیا۔ کتابوں والی دکان خاصی دور تھی۔ اس پر اس نے دونوں کو کچھ پیسے بھی دے دیے تھے۔ اور اسے یقین تھا کہ اب وہ خاصی دیر سے آئیں گے۔

کبریٰ کے بجائے اس نے فٹافٹ خود ہی چائے بنا کر دے دی۔

اماں نے اچانک چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ اس سے ایسی فرماں برداری کی امید کم ہی تھی۔

"وہ کبریٰ سو رہی تھی۔" اس نے جلدی سے وضاحت کی کہ کہیں اماں مشکوک نہ ہو جائیں۔

''اسے جگا دو اسے کیا مغرب تک سوتی ہی رہے گی۔''

''اچھا اماں۔''

''اور ہاں منو کو کہو ذرا میرے ساتھ چلے تمہارے ماموں کی خیریت پوچھ آؤں۔''

اور جب اماں نے کوئی ساتویں بار منو کو آواز دی تو وہ معصوم سی شکل بنائے آ گئی۔

''اماں، وہ دونوں تو نہیں ہیں۔''

''کہاں چلے گئے؟''

''میری کاپی لینے گئے تھے ابھی تک مڑے ہی نہیں۔''

''کھیلنے لگ گئے ہوں گے۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ سودا لے کر سیدھے گھر پلٹا کرو۔ پر باپ کا سایہ جو نہ ہوا سر پر۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی برقع سنبھال کر کھڑی ہو گئیں۔

''اکیلی جائیں گی آپ کبریٰ کو ساتھ لے جائیں۔''

''کبریٰ بی بی تو ابھی پڑی اینڈھ رہی ہیں۔ پہلے منہ ہاتھ دھوئیں گی کپڑے استری ہوں گے پھر بدلے جائیں گے۔ میں اکیلی ہی بھلی۔''

''پر اماں واپسی پر دیر ہو جائے گی۔ میں چلتی ہوں۔''

''تو۔''

''بس ایک منٹ میں آئی۔'' وہ ان کی بات سنے بغیر بھاگ گئی۔

اس کے کپڑے استری شدہ لٹک رہے تھے۔ وہ سچ مچ دو منٹ میں کپڑے بدل چادر اوڑھ کے آ گئی۔

اماں کچھ کہتے کہتے رک گئی اور کبریٰ کو بلا کر ہدایتیں دینے لگیں۔

''دروازہ بند کر لو۔ بھائی آئیں تو پھر باہر نہ جانے دینا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ماموں کو سچ مچ بخار ہو رہا تھا۔

اماں تو اس کے خواب کی قائل ہو گئیں۔

''ارے واہ، ہماری بیٹی کا خواب تو سچ نکلا۔'' ماموں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ڈاکٹر کو بھی دکھایا۔''

''کچھ نہیں عاشو، تو یونہی پریشان ہو رہی ہے۔ فلو تھا بگر گیا ہے۔'' ماموں نے تسلی دی۔

''اسے صبح کھدو نے کہا کہ خواب میں اس نے تمہیں بیمار دیکھا ہے۔ تب سے میرے دل کو لگی تھی۔''

''تم ہماری بیٹی کا اتنا خوبصورت نام نہ بگاڑا کرو۔ کتنی بار کہا ہے۔''

بھئی کیا کروں منہ پر چڑھ گیا ہے۔''

اماں ان کے پاس بیٹھ کر محبت سے ان کا سر دبانے لگی تو وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔

تھوڑی دیر ماموں زاد بہنوں کے پاس بیٹھ کر گپ لگائی۔ صغریٰ اس کی ہم عمر تھی۔

''صغریٰ! یہ حیدر بھائی کہاں ہیں؟''

''بھائی جان آرام کر رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو دفتر سے آئے ہیں۔''

''چلو ان کو سلام کر آتے ہیں۔ کیا کہیں گے کہ گھر آ کر سلام کیے بغیر چلی گئی ہوں۔''

صغریٰ نے قدرت حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر بولی۔ ''پہلے تو تمہیں بڑا ڈر لگتا تھا ان سے۔''

''ڈر تو اب بھی لگتا ہے۔ پر میں نے سوچا'' اسے کوئی بات ہی نہیں سوجھ رہی تھی تو وہ شکر ہوا کہ اسی وقت حیدر بھائی آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکل آئے۔

''سلام حیدر بھائی۔'' اس نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ہوں بڑے ابا بنتے ہیں۔'' دل ہی دل میں جل کر اس نے سوچا۔

''کیسی ہو بھئی، پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''ٹھیک ٹھاک..... پھپھو بھی آئی ہیں۔''

''جی۔''

''کہاں ہیں؟''

''وہ اندر ابا کے کمرے میں ہیں۔'' صغریٰ نے بتایا۔

''کبریٰ اور بچے سب ٹھیک ہیں نا۔''

''جی۔'' خدیجہ نے جواب دیتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔ اس نے نظریں اٹھائیں،

بڑی بڑی قاتل آنکھیں۔ پر حیدر بھائی کی نگاہیں اس پر تھی ہی نہیں۔

"حیدر بھائی آپ آیا کریں ناجی ہم سب بہت یاد کرتے ہیں آپ کو۔"

"کیا کروں گڑیا! بہت مصروفیت ہوگئی ہے۔ حالانکہ دل بڑا کرتا ہے۔ کہ کبھی پھپھو کے پاس آ کر بیٹھیں اور ان کے دکھ سکھ شیئر کریں بے چاری اکیلی ہی سارے بوجھ اٹھا رہی ہیں۔"

وہ جانے کے لیے پلٹے۔

"بیٹھیے حیدر بھائی، کہاں چل دیے آپ؟"

"پھپھو کے پاس جا رہا تھا۔"

"ہماری بھی آپ کے ساتھ کوئی رشتے داری ہے۔"

انہوں نے جاتے جاتے رک کر قدرے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر ہنس کر ہولے سے اس کے رخساروں پر چپت لگائی۔

"بڑی باتیں کرنی آ گئی ہیں بھئی۔"

اور پھر وہ یونہی ہنستے ہوئے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر صغریٰ وغیرہ کے پاس بیٹھ کر وہ بھی اندر ماموں کے پاس بیٹھ گئی۔ حیدر بھائی، اماں کے پاس بیٹھے تھے۔ اور جتنی دیر وہ وہاں بیٹھی رہی۔ حیدر بھائی نے ایک بار بھی نظریں اٹھا کر اسے نہ دیکھا تھا۔ جانے وہ اور اماں کس مسئلے میں الجھے ہوئے تھے۔ اپنی دانست میں تو اس نے نظروں کے کتنے ہی تیر آزما ڈالے تھے۔ لیکن کوئی بھی کارگر نہیں ہوا تھا۔ فلموں میں تو کیسے فٹافٹ ایک نظر میں ہی محبت ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں تو دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔ حیدر بھائی بھی بالکل ٹھس تھے۔ نرے بدھو سارا وقت یا تو مہنگائی کا رونا روتے رہے یا صفیہ آپا کی شادی کا قصہ تھا۔ دفتر سے ایڈوانس لوں گا۔ یہ کروں گا، وہ کروں گا۔

غصے میں آتی دفعہ اس نے انہیں سلام بھی نہ کیا۔

"اے کتنی بداخلاق ہے تو۔" گھر پہنچتے ہی اماں کو خیال آیا۔ "تو نے حیدر کو سلام تک نہ کیا۔"

"خود تو جیسے بڑے بااخلاق ہیں نا۔" اس نے جل کر کہا اور سوچنے لگی۔

"دو گھنٹوں میں ایک بار بھی تو نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں، بس دادا ابا بننے کا شوق ہے۔"

"توبہ ہے لڑکی، تیرا بھی کچھ پتا بھی نہیں چلتا۔" اماں بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گھس گئیں اور صحن میں پڑی چارپائی پر دراز ہوگئی۔

حیدر اور جگنو کے بعد لے دے کر اب شکور بھائی ہی رہ گئے تھے مگر شکور بھائی کو تو اس نے پہلے ہی ریجکٹ کر دیا تھا۔ ایک تو اسے ایسی ہلکی محبت کی تمنا نہ تھی۔ دوسری پھپھو اور اماں میں تو ذرا بھی نہ بنتی تھی۔ اور کہیں سالوں بعد ہی ملاقات ہو پاتی تھی سو شکور بھائی والا مسئلہ ٹیڑھا ہی تھا۔

پھر...... پھر کیا کرے وہ۔

کتنا دل چاہتا ہے اس کا کہ ٹیمی کی طرح وہ بھی کسی دن ٹیمی کو فخر سے بتا سکے کہ آج اسے۔

مایوسی ایک دم اس پر عود کر آئی تھی۔

"کیوں نہ سکندر بھائی۔"

"مگر نہیں۔" دوسرے ہی لمحے اس نے خود ہی آنکھیں مسترد کر دیا۔ "جو شخص ٹیمی کے لیے دل میں محبت بھرے جذبات رکھتا ہو، اس کے لیے ایسا سوچنا ٹیمی کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔"

"لیکن ٹیمی تو اس سے محبت نہیں کرتی نا۔" دل نے سرگوشی کی۔ "جو بھی ہو، آخر کو وہ شریف الدین کی بیٹی ہے اور اپنی خواہش کے لیے وہ اپنی اکلوتی سہیلی کی محبت پر ڈاکہ ہرگز نہیں ڈال سکتی۔"

"پھر...... کیا کیا جائے۔"

"اٹھو نواب زادی!" کبریٰ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ "مجھ سے روٹی نہیں پکے گی۔ صبح اسکول چلی جاتی ہو اور شام کو گھومنے۔"

"روز تھوڑی ہی جاتی ہوں۔"

"آج روٹی تم پکاؤ گی۔"

"مجھے ابھی اسکول کا اتنا کام کرنا ہے۔"

"یہ اسکول کا ہوم ورک ہی ہو رہا ہے۔"

"وہ تو ذرا تھکن اتار رہی تھی۔ اب جا رہی ہوں کام کرنے، وہ مس خالدہ اتنا کام

دیتی ہیں کہ لکھتے لکھتے ہاتھ بھی تھک جاتے ہیں۔ تمہیں پتا نہیں کیا۔''

''تو نہ لکھا کرو نا اتنا، دیکھتی کب ہیں وہ۔'' کبریٰ نے کہا۔

''تمہارے زمانے میں نہ دیکھتی ہوگی اب تو دیکھتی ہیں۔'' اور وہ مزے سے صحن میں بستہ کھول کر بیٹھ گئی اور کبریٰ کو ہی روٹیاں پکانی پڑیں اور وہ کتابیں کھولے سپنوں میں کھو گئی۔

کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگرچہ اس دوران اس نے بے شمار رسالے پڑھ ڈالے تھے۔ خدا بھلا کرے زینب کا جو اسے پڑھنے کو رسالے دے دیتی تھی۔ زینب کی باجی کو جنون تھا اور وہ تقریباً بازار میں آنے والے خواتین کے سارے پرچے ہی خریدتی تھیں۔ ایک سے ایک بمباسٹک افسانہ اسے افسانوں کا نشہ فلموں سے زیادہ ہوگیا تھا۔ فلمیں تو کہیں مہینے میں ایک بار جب وہ ٹیمی کے ہاں جاتی تو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن رسالے تو روز ہی مل جاتے تھے۔ سو وہ بڑے دھیان سے ایک ایک لفظ پڑھتی۔

ہیرو کیسے زبردست ہوتے تھے۔

لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھنے والے۔

غصیلے۔

شرارتی۔

نازک مزاج، انا پرست۔

شوخ، سنجیدہ کوالٹی موجود تھی لیکن صرف کہانیوں میں۔

حقیقی زندگی میں تو حیدر بھائی تھے۔ دادا ابا کی طرح بزرگ اور جگنو تھا کتابی کیڑا۔

اور شکور بھائی ہکلے اور ملاقات کا امکان بھی نہیں۔

اس روز اس نے بڑا دھانسو قسم کا افسانہ پڑھا تھا۔ ہیرو کی ملاقات اچانک سڑک پر ہیروئن سے ہوتی ہے، وہ اسے لفٹ دیتا ہے اور پھر...... یہ افسانہ پڑھنے کے بعد کئی دن تک اسکول سے آتے اور جاتے ہوئے اس نے اپنے اردگرد چلتی گاڑیوں کو بڑے دھیان سے دیکھا۔ کیا پتا کسی گاڑی میں وہ شاندار شخصیت بیٹھی ہو اور پھر اسے دھوپ میں چلتے دیکھ کر کوئی گاڑی اس کے پاس آ کر رکے اور گاڑی والا اس سے پوچھے۔

''آیئے مس کہاں جانا ہے آپ کو۔''

مگر کوئی گاڑی اس کے پاس نہ رکی۔

ایک تو اس چھوٹے سے شہر میں گاڑیاں بھی بس آٹے میں نمک کے برابر تھیں کئی روز تک اسے اماں پر غصہ آتا رہا۔ آخر اس چھوٹے سے شہر میں رہنے کی کیا تک تھی۔ لوگ لاہور، راولپنڈی اور بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔ وہ بھی کسی بڑے شہر میں رہتی تو کہیں نہ کہیں کوئی چانس تو مل جاتا۔ اس نے اماں سے گلہ کیا تو انہوں نے سر پیٹ لیا۔

''جو بات بھی کرے گی زمانے سے نرالی۔ لو یہاں پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ جہاں اپنا گھر بار ہے اسے چھوڑ کر کہیں اور جا بستے۔''

افسانے میں کوئی شاندار ہیرو برستی بارش میں ہیروئن کو بھیگتے دیکھ کر لفٹ کی پیشکش کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑے خشوع وخضوع کے بارش کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

اس روز ساون کی پہلی بارش ہوئی تھی اور خوب زور سے جل تھل ہوگیا تھا۔ اماں نے اسے اسکول جانے سے منع کیا۔

''آج تو میرا ایک بڑا ضروری ٹیسٹ ہے اگر آج اسکول نہ گئی نا تو مس زبیری نام ہی کاٹ دیں گی۔''

''کیوں کیا مس زبیری کو دکھتا نہیں کہ بارش ہو رہی ہے۔''

''ساری ہی لڑکیاں تو آجاتی ہیں بارش میں۔ بس میں ہی نہیں جاتی، جب بارش ہوتی ہے۔''

''ساری لڑکیوں کے دماغ خراب ہیں؟''

''بس پر جاؤں گی، اسٹاپ تک ہی تو جانا ہے۔''

''بظاہر وہ سنجیدہ تھی لیکن اندر ہی اندر لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اب اماں کو کیا پتا یہ بارش میرے کتنے دنوں کی دعاؤں کا ثمر ہے اور اب میں گھر بیٹھ جاؤں۔ باؤلے کتے نے کاٹا ہے نا مجھے اور بارش میں بھیگتی ہوئی وہ اسکول آ گئی۔

ہولے ہولے اس امید پر چلتی ہوئی کہ شاید کوئی...... مگر کسی گاڑی والے نے اس پر ترس نہ کھایا۔

ایک سرمئی نسان اس کے پاس رکی تو اس کا دل اچھل پڑا۔

افسانے میں بھی تو گاڑی سلور کلر کی ہی تھی نا۔

"بی بی!" گاڑی والے نے شیشہ ہٹا کر اسے پکارا۔ ادھیڑ عمر ہے مگر خیر چل جائے گا۔

اس نے ماتھے سے بارش کے قطرے صاف کیے اور ادھر ادھر دیکھا۔

گاڑی میں سے ایک خاتون جھانک رہی تھیں۔

"بی بی!" خاتون نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر پوچھا۔ "یہ ہاسپٹل روڈ کدھر ہے۔"

"دائیں طرف مڑ جائیں۔" اس نے جھلا کر بتایا اور تیز تیز قدموں سے اسکول کی طرف چل پڑی۔

کوئی ڈیسنٹ ہیرو تو نہ ملا البتہ بارش میں بلاوجہ بھیگنے سے بخار ہو گیا۔

ایک تو بخار اس پر اماں کی صلواتیں سن سن کر ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ لعنت بھیجے ان سب پر اور آرام سے اپنی پڑھائی میں جت جائے مگر مصیبت تو ساری اس ٹیمی کی بچی نے ڈال رکھی تھی۔ اس کی باتیں سن سن کر اور نادر بھائی کے رومانی خط پڑھ پڑھ کر اس کے دل میں اتھل پتھل ہوتی رہتی تھی۔

"ہائے ہمیں بھی کوئی اس طرح چاہے۔

یوں ہی اتنی شدت سے۔

اور ہماری بھی کوئی یوں ہی تعریف کرے۔

ہمارے بالوں کی۔

ہماری آنکھوں کی۔

ہمارے ہونٹوں کی۔

اور وہ نادر بھائی تو شاید اندھے ہیں۔ ٹیمی کے ایک مٹھی بالوں کی اس طرح تعریف کرتے ہیں جیسے دنیا میں اتنے حسین بال کہیں کسی اور لڑکی کے نہیں ہیں۔

اور اگر جو کبھی وہ میرے بال دیکھ لیں تو......

"پر نہیں۔" وہ خود ہی تردید کر دیتی۔

ٹیمی کہتی ہے کہ عشق اندھا ہوتا ہے۔ محبت کچھ نہیں دیکھتی۔ نہ صورت نہ شکل بس محبت ہو جاتی ہے۔ خود بہ خود۔

پر اس سے تو کسی کو خود بہ خود محبت نہ ہوئی تھی اور اس سلسلے میں سینکڑوں افسانوں سے حاصل کیا ہوا تجربہ بھی اس کے ذرا کام نہ آیا تھا۔

حیدر بھائی کو فلو ہوا تو وہ بھاگم بھاگ ماموں کے ہاں پہنچ گئی اور پھر اماں کی منتیں کر کے وہ وہیں رک گئی۔ دو دن کیسے ان کی خدمت کی قہوہ بنا کر دیا۔ ذرا سا پکارنے پر بھاگی چلی جاتی۔ کبھی رومال دھو کر دے رہی ہے، کبھی ان کے کمرے کی صفائی کر رہی ہے اور کبھی ان سے پوچھ رہی ہے کہ آپ کا سر دبا دوں۔

اور اس کی یہ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ حیدر بھائی نے کوئی محبت بھر جملہ اس کے کانوں میں ٹپکانے کے بجائے صرف اتنا ہی کہا۔

"بہنیں ایسی ہوتی ہیں، دیکھا صغریٰ۔

کیسا پتھر دل ہے ان کا ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اس نے سوچا۔

"افسانوں میں ہیرو کتنی جلدی ہیروئن کی تیمارداری سے پگھل جاتے ہیں اور پھر۔"

اور یہاں وہ حیدر بھائی کے دل کو کیا پگھلاتی۔ الٹا فلو کے جراثیم لگوا کر چلی آئی اور پھر کئی دن تک سوں سوں اور کھوں کھوں کرتی رہی۔

جگنو کو ہاکی کھیلتے ہوئے ہاتھ پر چوٹ آ گئی تو اماں سے سو بہانے بنا کر چلی گئی۔

"اماں، حساب بالکل نہیں آتا مجھے مس فیل کر دیں گی۔ ایک دو روز وہاں رہ کر جگنوں سے پڑھوں گی۔

پر جگنو بھی حیدر بھائی کی طرح پتھر ہی تھا نرا، ذرا جو اس کی خدمت گواریوں سے متاثر ہوا ہو۔

"توبہ ہے خدیجہ! تم کتنا بولتی ہو۔" ایک روز اس نے کہا۔ "اور تمہارا پڑھائی کا حرج نہیں ہوتا کیا جو کل سے تم یہاں ہی ہو۔"

"جہنم میں جاؤ۔" وہ دل ہی دل میں اسے کوستی ہوئی گھر آ گئی کہ اپنی قسمت ہی خراب ہے۔

افسانوں میں لڑکیوں کے اتنے کزن ہوتے ہیں۔ یہاں لے دے کر کنبے میں دو ہی ہیں اور وہ بھی ایک دم کنڈم اور تیسرا تو خیر نہ ہونے کے برابر۔ ہے اور اس ٹیمی کی بچی کے بھی تو ڈھیروں کزن ہیں۔ کوئی فرسٹ کزن ہے کوئی سیکنڈ ہے۔ کوئی پپا کے دوستوں کے بیٹے

ہیں اور کوئی مما کے۔

اور لگتا ہے ابا نے کبھی کوئی دوست بنائے ہی نہ تھے شاید دوست بنانا بھی شرافت کے لیے غیر ضروری تھا۔ کتنے ہی دن وہ غصے کے سے کھولتی رہی۔ کبریٰ نے اسے چھیڑا بھی۔

''اے کیا ہے، اتنی چپ چپ کیوں ہو۔ کیا مس خالدہ نے پٹائی کی ہے۔''

''جی نہیں۔''

''تو پھر منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔''

''نہیں کیا۔''

''واہ، ہمیں کیوں، نہیں تم ہماری بہن نہیں ہو، اتنی پیاری پیاری سی سیٹی۔''

اور اس کے سیٹی کہنے پر وہ چڑ گئی ورنہ اس نے اس کے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہو کر اسے راز دار بنانے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ وہ غصے سے اٹھ کر باہر آئی تو پھپھو کو آتے دیکھ کر کھل اٹھی ان کے پیچھے ان کے صاحبزادے بھی تھے۔ اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھے جا رہے تھے۔

''کک...... کک...... کیسی ہو...... کھد...... دو......''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے بتیسی نکال دی اور سوچنے لگی۔

''کیا حرج ہے۔ شکور بھائی شکل کے تو برے نہیں ہیں۔ بس ذرا ہکلاتے ہیں تو ہیں نا۔''

اور لپک کر پھپھو کے گلے لگ گئی۔

''اللہ پھپھو! آپ کتنے دنوں بعد آئی ہیں۔ پی بہت دل چاہ رہا تھا ملنے کو۔''

''اے دل تو میرا بھی ''ہولتا'' رہتا ہے پر کیا کروں، تیری اماں کے ڈر سے نہیں آتی۔''

''ہاں، میں تو تمہیں پتھر مارتی ہوں۔'' اماں جانے کب آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''پتھر نہیں مارتی ہو تو کم بھی نہیں کرتی ہو۔ یہ تو میرا ہی دل میرے بھائی کی اولاد دیکھنے کو تڑپتا ہے تو پھر اگلی پچھلی ساری بھول کر چلی آتی ہوں۔''

''خیر اب آئی ہو تو آؤ۔'' اماں نے مصالحت کی کوشش کی اور کبریٰ کو آواز دی۔

''اے کبریٰ! پھپھو آئی ہیں تیری۔''

''آیئے نا شکور بھائی! آپ کیوں کھڑے ہو گئے۔ بیٹھئے نا۔''

''ہاں۔'' انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''پتا نہیں آنکھیں تھیں کہ ایکسرے مشینیں کہ اندر تک چبھتی چلی جا رہی تھیں۔ اس نے عجیب سی بے کلی محسوس کی۔

''تت...... تم...... بھی...... کبھی...... آیا کک...... کک...... کرو نا...... ا...... دھر...... ہمارے گھر۔''

''ہمارا تو دل چاہتا ہے پر اماں نہیں آنے دیتیں۔'' اس نے خاص ادا سے سر جھکا اور اپنی دانست میں بالکل ہما مالنی کے انداز میں۔

''کک...... کیوں؟''

''پ...... پتا نہیں۔'' اس کی شرارتی رگ پھڑکی مگر شکور بھائی برا منا گئے۔

''تت...... تم...... مجھ...... سے مذاق کر رہی ہو۔''

''نہیں تو۔'' وہ گھبرا گئی۔ وہ تو انہی پر اکتفا کرنے کو تیار تھی۔ حالانکہ وہ اس کے معیار کے ہرگز نہ تھے اور نہ اس قابل تھے کہ ان سے محبت کرتی۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔

پر وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئے تھے۔

''پپ...... پتا نہیں...... کک...... کیا سمجھتی ہو خود کو۔''

اندر نہ جانے کس پرانی بات پر اماں اور پھپھو کے درمیان محاذ کھل گیا تھا پرانے گلے شکوے کرتے کرتے بات حسب معمول بڑھ گئی تھی اور ہمیشہ کی طرح جب پھپھو واپس جا رہی تھیں تو آنسو بہاتے ہوئے اور کبھی نہ آنے کا عہد کرتے ہوئے۔ ادھر اماں انہیں روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے تیر بھی چلاتی جا رہی تھیں۔

''واہ اللہ میاں! پھپھو کے بعد اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''یہ ہماری قسمت میں ہی ''اول جلول'' قسم کے کزن لکھ دیے تھے تم نے۔''

اور اوپر دیکھتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر اپنے چھت سے ملحق ماسی ستاراں کی چھت پر جا پڑی تھی جہاں وہ کھڑا تھا لمبی لمبی مونچھیں اور موٹی موٹی آنکھوں میں دنبالے دار سرمہ لگائے۔ یہ غالباً ماسی ستاراں کا لاڈلا سپوت اچھو تھا۔ جو چھت پر اپنے کبوتروں سے اٹکھلیاں کر رہا تھا۔ چھت پر ہی اس کا ٹک بنا رکھا تھا۔ وہ کبھی کبوتروں کو واپس بلاتا تو پھر اڑا دیتا وہ

تھوڑی دیر دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔

کزن نہ سہی پڑوسیوں سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے اور پھر اچھو اتنا برا بھی نہیں۔

ان پڑھ ہے تو کیا ہوا شکل تو اچھی ہے۔ یہ اونچا لمبا قد ہے۔ موٹی موٹی آنکھیں ہیں اور بس ذرا آنکھوں میں سرمہ زیادہ ڈال لیتا ہے تو خیر ہے۔

اس روز اس نے چنو کو بھیج کر زینب سے کئی رسالے منگوائے اور اپنے تجربات میں اضافہ کرنے کے لیے رات گئے تک پڑھتی رہی لیکن اپنے تجربات میں اضافہ کیا ہوتا الٹا اماں کی پھٹکار پڑ گئی تھی اور اچھو نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہ تھا۔

''بہت شریف بنتا ہے کمینہ۔'' اس نے دانت کچکچا کر دل ہی دل میں کہا اور پاس پڑا ہوا رسالہ اٹھا لیا۔

''خمو پلیز۔ ایک بار میری بات تو سن لو میری زندگی دیکھو میں صرف تمہیں دیکھنے کے لیے اتنی دوسر سے آتا ہوں اور تم......''

''بکواس کرتی ہیں سب۔'' اس نے رسالہ اٹھا کر غصے سے پھینکا جسے اندر آتی کبریٰ نے اچک لیا۔

''کون بکواس کرتا ہے۔'' کبریٰ نے رسالہ ایک طرف رکھ کر اپنے گیلے بال جھٹکے۔

''یہ...... یہ افسانے لکھنے والیاں اور کون۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ایسا کیا کہہ دیا انہوں نے۔''

''اتنے جھوٹ بولتی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''مثلاً۔'' کبریٰ نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''یہ اتنے خوب صورت اتنے بڑے بڑے گھر اور یہ ایسی رنگا رنگ زندگی۔ اتنی ہنگامہ خیز پرلطف۔''

''تو ہوتے ہوں گے نا اتنے بڑے بڑے گھر اور زندگی بھی ہوتی ہوگی۔ پرلطف۔'' کبریٰ نے اطمینان سے کہا۔

''ہوں خاک ہوتی ہوگی۔''

''بھائی، ہماری اگر ایسی پرلطف زندگی نہیں ہے اور بڑا گھر نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی کی بھی نہیں ہے۔''

''چلو گھر ہوتے ہوں گے ایسے۔'' اس نے سمجھوتا کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ...... یہ......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا؟'' کبریٰ نے اس کو حوصلہ دیا۔ ''کہو نا کیا۔''

''تم نے کبھی کوئی افسانہ پڑھا کبریٰ۔''

''نہیں تو۔''

''پھر تمہیں کیسے سمجھاؤں۔'' وہ مایوس سی ہو گئی۔

''نہیں تم سمجھاؤ تو میں کوشش کروں گی سمجھنے کی۔'' کبریٰ آج موڈ میں تھی۔

ایک تو کبریٰ ہمیشہ کی اجڈ تھی، پتا نہیں دس جماعتیں اس نے کیسے پاس کر لی تھیں۔ راز تو وہ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ فوراً ہی اماں سے جا کر کہہ دیتی کہ خدیجہ ایسے خراب رسالے پڑھتی ہے جس میں محبت کی باتیں ہوتی ہیں اور اماں اس کے رسالے پڑھنا بند کروا دیتیں۔ زندگی میں تو کوئی ہیرو ملنے سے رہا۔ ایسے ڈل کزنوں سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ رسالہ پڑھ پڑھ کر ہی ذرا دل کو خوش کر لیا کروں گی۔

''میرا مطلب ہے جھوٹ بہت ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں، عام زندگی میں تو یہ سب نہیں ہوتا۔''

''یہ سب کیا؟''

''توبہ ہے کبریٰ! تو تو ہاتھ دھو کر ہی پیچھے پڑ گئی، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''یہی جو لکھا ہوتا ہے۔''

''یہی سب کیا، بتاؤ نا؟'' کبریٰ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے شرارت سے ہنس رہی تھی۔

''یہی محبت۔'' اس نے زچ ہو کر کہا۔ ''ادھر ہیرو کی نظر ہیروئن پر پڑی، ادھر ہیروئن کے دل میں اتھل پتھل شروع ہو گئی۔ ادھر انہوں نے نظروں کے تیر چلائے ادھر ہیرو صاحب پٹ سے گر پڑے۔''

''اچھا!'' کبریٰ نے اچھا کو لمبا کر کے ادا کیا۔ ''یہ لکھا ہوتا ہے افسانوں میں۔''

''ہاں۔''

اسے کبریٰ کی کم علمی پر افسوس ہوا اور وہ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر اسے

بتانے لگی کہ کس طرح کبھی ہیرو برستی بارش میں راہ چلتی لڑکی کو لفٹ دیتا ہے اور پھر دونوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ اور کس طرح کبھی کوئی لڑکی سڑک پر بے ہوش ملتی ہے اور کوئی ہمدرد......

''اچھا اچھا، تو اس روز تم برستی بارش میں اس لیے اسکول گئی تھیں کہ شاید۔'' کبریٰ نے اپنی گول گول آنکھیں چمکاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔'' مگر خیر کسی دن سڑک پر بے ہوش ہو کر گر جانا کیا خبر کوئی اللہ کا بندہ اٹھا کر ہاسپٹل پہنچا دے اور پھر۔''

''بکواس نہیں کرو۔'' وہ جھینپ گئی۔''اس روز میرا ٹیسٹ تھا اور پھر کوئی ایسی خطرناک بارش بھی نہیں ہو رہی تھی کہ میں خواہ مخواہ چھٹی کرتی۔''

''اچھا اور کیا لکھا ہوتا ہے۔''

''اور۔'' وہ اپنی شرمندگی بھول کر پھر بتانے لگی۔''اور افسانوں میں جو کزن ہوتے ہیں نا شرارتی سے۔ شوخ سے۔ غصیلے سے اور سچی کبریٰ ایسے ایسے جملے بولتے ہیں کہ......''

''اور تمہیں افسوس ہوتا ہے کہ تمہارے کزن ایسے کیوں نہیں ہیں۔'' کبریٰ اب سنجیدہ ہو گئی تھی۔

وہ خاموش رہی۔

''دیکھو میری جھلی بہن!'' کہانیوں کو کہانی ہی سمجھ کر پڑھا کرو۔ انہیں خود پر طاری مت کیا کرو۔ کہانی کا مطلب ہوتا ہے جھوٹ اور یہ سب جو لکھا ہوتا ہے جھوٹ ہوتا ہے۔''

''اگر یہ جھوٹ ہے تو وہ ٹیمی۔'' بات کرتے کرتے اس نے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ شکر ہے کبریٰ نے سنا نہیں۔ اس کا دھیان باہر منو اور ککو کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی طرف لگا تھا۔

''جہنم میں جائیں گی سب۔'' اس نے غصے میں بددعا دی اور اٹھ کر ادھر ادھر بکھرے ہوئے رسالے اکٹھے کرنے لگی۔

''منو......منو۔''

''جی آپا!'' منو اس کی پکار پر دوڑا چلا آیا۔ وہ اتنا فرماں بردار تو ہرگز نہیں تھا یقیناً ککو کی مار سے ڈر کر بھاگا ہو گا۔

''یہ رسالے دے کر آؤ جا کر اور خبردار آئندہ رسالے لے کر آیا میرے لیے تو۔''

منو نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

''یہ میں اپنی مرضی سے کب لاتا ہوں۔ آپ خود ہی تو منگواتی ہیں۔''

''اور اب خود ہی تو منع کر رہی ہوں۔'' اس نے خواہ مخواہ میں اس کے کان مروڑ دیے۔

لیکن رسالے نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ افسانوں سے زیادہ تو ٹیمی کی باتیں اور انڈین فلمیں جنہیں دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔

''کیا فائدہ ایسی بے کار زندگی کا۔''

اس کا دل دکھتا۔

جس میں کوئی چارم ہی نہ ہو۔

کوئی محبت کرے۔

محبت بھرے خط لکھے۔

بلا سے جھوٹ ہی سہی۔

تو زندگی خوب صورت نہ ہو جائے۔ رنگ ہی رنگ بکھر جائیں۔

اللہ، اماں کا کوئی رشتے دار ابا کا کوئی عزیز ہی ٹپک پڑے۔ کہیں سے۔

اس شہر میں اسے کوئی کام ہو۔

ڈھونڈتا کھوجتا چلا آئے اور پھر اس کا دل اس کے لانبے بالوں میں ایسا الجھے کہ وہ پھر جا ہی نہ سکے اور اگر جائے بھی تو دوبارہ پلٹ کر آنے کے وعدے پر اسے انتظار کرنے کا کہہ کر۔

اسے فنکشنوں میں جانے سے الجھن ہوتی تھی۔

''خواہ مخواہ میں دن ضائع کرنا؟۔

پر اب وہ اس خیال سے چلی جاتی کہ کیا پتا کسی کا دل ہی اٹک جائے اس پر کھانا کھاتے ہوئے بھی اس کی پرشوق نظریں ادھر ادھر بھٹکتی رہتیں۔ پر جانے کیا بات تھی کسی نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ شاید سب اسے بچی سمجھتے ہیں۔ حیدر بھائی کی طرح...... یا پھر...... یا پھر ہم غریب ہیں اس لیے۔

وہ افسردہ سی رہنے لگی تھی۔

''اے تجھے کیا ہوا کھدو؟'' ایک روز اماں نے اس کی چوری پکڑ لی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔

''کچھ تو ہوا ہے۔ یہ تیری بولتی بند کیوں ہے۔ کہاں تو ہر وقت لہر لہر کرتی رہتی تھی۔ اور کہاں سارا دن چپ بیٹھی رہتی ہے۔''

''وہ دراصل اماں مجھے حساب کی سمجھ نہیں آتی ڈر لگتا ہے، فیل ہی نہ ہو جاؤں۔''

''ہو جا فیل۔'' اماں نے بڑی فراخ دلی سے اسے فیل ہونے کی اجازت دے دی۔ ''تو نے کون سی نوکری کرنی ہے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ میں سوچتے رہتی ہے۔''

''نہیں اماں۔'' اس نے بوکھلا کر اماں کی طرف دیکھا۔ ''خدا نہ کرے جو میں فیل ہوں۔ میں نے تو بہت سا پڑھنا ہے۔ کبریٰ کی طرح دس جماعتیں پڑھ کر گھر نہیں بیٹھ جانا۔ اماں مجھے ٹیوشن لگوا دو۔''

ایک متوقع کامیابی کے خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ کیا خبر اس کا ٹیوٹر کوئی ینگ سا ڈیسنٹ بندہ ہو۔ وجیہہ سا زبردست پرسنیلٹی والا اور پڑھاتے پڑھاتے کسی دن وہ چپکے سے اس سے کہے۔

''خدیجہ! تم کتنی اچھی ہو، کتنی خوب صورت۔''

بہت سے خواب جھلمل جھلمل کرتے اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔

''کبریٰ سے پڑھ لیا کر۔'' اماں نے بے نیازی سے کہا۔

''کبریٰ سے!'' اسے ہنسی آ گئی۔ ''خود تو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی ہے اور وہ بھی حساب میں فیل تھی۔''

''تو پھر گھر بیٹھ۔ کاہے کو پیسہ ضائع کرتی ہے۔ میں تو مشکل سے خرچ پورا کرتی ہوں، تیری ٹیوشن کہاں سے لگواؤں، یہ ٹیوشن تو موا امیروں کا چونچلا ہے، ہم نے بھی پڑھا پر کوئی ٹیوشن نہ لگوائی۔''

''اماں آپ نے کتنا پڑھا تھا۔'' ککو نے پوچھا۔

''پانچ جماعتیں تو پڑھی ہی تھیں۔''

''سچ اماں۔''

''تو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' وہ اس کی طرف پلٹیں تو وہ ہنستا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

''ہاں تو پھر صبح سے گھر بیٹھ، خواہ مخواہ کتابوں کا پیسوں کا خرچ بچے گا۔''

''نہیں، نہیں اماں! وہ بوکھلا گئی۔ ''میں سچ مچ میں کوئی فیل تھوڑی ہی جاؤں گی۔ میں تو محنت کروں گی۔''

اسے خطرہ ہوا کہ کہیں اماں سچ مچ اسے گھر ہی نہ بیٹھا لیں۔ اور مستقبل میں وہ جو ایک موہوم سا امکان تھا کہ کہیں کوئی بندہ یونیورسٹی میں مل جائے ابھی سے ٹھس ہو جائے۔ آخر افسانوں میں اسی فیصد محبتیں تو یونیورسٹی میں پروان چڑھتی ہیں۔ اور وہ اس خوب صورت چانس کا امکان ہرگز نہیں کھونا چاہتی تھی چنانچہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ اماں کو یقین دلانے لگی کہ وہ ہرگز ہرگز فیل نہیں ہو گی۔

چنانچہ اس خوف سے کہیں سچ مچ فیل ہی نہ ہو جائے اور اماں اسے گھر بیٹھا لیں اس نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ ٹیمی کے گھر جانا بھی کم کر دیا تھا لیکن ٹیمی اسے بتاتی رہتی۔

''سچی خدیجہ! سکندر بھائی تو دیوانے ہو رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ بے نیازی سے کہتی۔

مگر اندر ہی اندر اس کا دل جل جل کر کباب ہو جاتا تھا۔

''تم ہی بتاؤ نا، کیا کروں میں۔ سکندر بھائی یا نادر میں سے مجھے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ نادر بھائی کے حق میں ووٹ دیتی ہوں تو سکندر جانے کیا کر ڈالیں۔ اور سکندر بھائی کا انتخاب کرتی ہوں تو نادر کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''میں کیا کہوں؟'' وہ کندھے اچکاتی۔

''کوئی مشورہ تو دو نا۔''

''کیا مشورہ دوں، مجھے تو دونوں ہی سے ہمدردی ہے۔''

''ہمدردی تو مجھے بھی ہے پر۔''

''پر کیا؟'' اس نے غصے سے اس کی بات کاٹی اور بولی۔

''کیا تمہارے خاندان میں کوئی اور لڑکی نہ تھی کہ وہ دونوں ہی تمہیں دل دے بیٹھے۔''

''نہیں خیر لڑکیاں تو بہت ہیں پر۔'' وہ ایک دم مغرور نظر آنے لگی۔ ''اپنی اپنی قسمت کی بات ہے اور تم۔'' وہ اس کو مشکوک نظروں سے دیکھتی۔ ''تم بڑی گھنی ہو۔ میں تمہیں ،

ایک ایک بات بتاتی ہوں۔ حتیٰ کہ نادر کے سارے خط بھی پڑھواتی ہوں اور تم نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"کیا بتاؤں؟" وہ نادم ہو جاتی۔

"سچی بات بتاؤ نا خدیجہ! وہ کون ہے جو تمہارے ان ریشمی بالوں میں۔"

"کوئی نہیں۔" اس کی آنکھوں میں اپنی اس ناقدری پر پانی اتر آتا۔

"جھوٹ۔"

"قسم لے لو۔"

"اور وہ تمہارے کزن حیدر بھائی، جگنو اور شکور کیا کوئی بھی تمہیں پسند نہیں کرتا۔"

اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس جاتا۔

"پھر وہ کسی اور کو پسند کرتے ہوں گے۔"

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، وہ یقین سے کہتی۔

"تجھے پتا نہیں خدیجہ! یہ لڑکے بڑے مکار ہوتے ہیں۔ باہر دوستیاں کر رکھی ہوں گی۔ سچی بڑے بدقسمت ہیں۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتی نا تو کبھی اتنی خوب صورت لڑکی کو چھوڑ کر باہر جھک نہ مارتی۔"

اور اس کا دل پر گھونسا سا لگا۔

اور اس بات کے بعد جتنی بار بھی وہ خالہ اور ماموں کے ہاں گئی بڑی تنقیدی نظروں سے جگنو اور حیدر بھائی کا جائزہ لیتی رہی جگنو کی ساری کتابیں الٹ پلٹ ڈالیں کہ کیا پتا کوئی خط کوئی ڈائری وغیرہ مل جائے لیکن بے سود۔

"دراصل ان دونوں میں محبت کے جراثیم ہی نہیں ہیں۔" اس نے خود ہی فیصلہ دے دیا اور پڑھائی میں جت گئی۔

امتحان ہوا، پیپرز اچھے ہو گئے تھے اور فیل ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ بہت مطمئن تھی لیکن ٹیمی سے ملنے کو دل ہمکتا رہتا تھا۔

جانے کیا ہوا تھا۔

وہ سوچتی۔

"پتا نہیں ٹیمی نے کس کے حق میں فیصلہ دیا تھا نادر بھائی یا سکندر بھائی۔"

اسے کھد بد لگی ہوئی تھی۔ تب ایک روز اماں کی بہت منتیں کر کے وہ ککو کو ساتھ لے کر ٹیمی سے ملنے گئی تو پتا چلا وہ لوگ تو چلے گئے۔ ان کی تبدیل ہو گئی تھی۔

"ہائے کتنی بے وفا تھی مل کر بھی نہیں گئی۔ اس نے دکھ سے سوچا لیکن پھر خود ہی اسے خیال آیا، کیسے ملتی اسے تو گھر ہی معلوم نہیں تھا۔ ایک بار بھی تو وہ اسے گھر لے کر نہ آئی تھی۔ وہ افسردہ سی .... وہاں سے واپس آئی۔ کئی دن تک ٹیمی کا خیال اسے ستاتا رہا۔ پھر ہولے ہولے وہ گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ ہو گئی۔ اگرچہ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھی لیکن اماں اسے کالج میں داخل کرانے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھیں۔ گھر کے اخراجات مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ اس کے کالج کی فیس، کتابیں، کنوینس کا خرچ کہاں سے آتا۔ رو دھو کر وہ چپ ہو رہی تھی۔ لیکن اس روز جب حیدر بھائی نے اسے اتنی شاندار کامیابی پر مبارک باد دی تو جھر جھر آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ جانے کتنی بہت سی باتوں کا غم تھا اسے کہ آنسو بہے ہی چلے جا رہے تھے۔

کالج میں داخل نہ ہونے کا غم۔

کئی امکانی گولڈن چانس مس ہونے کا غم۔

اور پڑھ لکھ کر نوکری کرنے کی خواہش نہ پورا ہونے کا غم۔

یہ آخری چانس بھی ملے بغیر مس ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی میں نہ سہی تو دفتروں میں کہیں نہ کہیں تو کوئی چانس مل جاتا۔ کیا پتا کوئی بہت اچھا باس مل جاتا۔

زبردست سی شخصیت۔

سنجیدہ سا اداس سا۔

محبت کی چوٹ کھائے ہوئے۔

یا پھر اپنوں کا ڈسا ہوا۔

اکیلا اور تنہا۔

اور کسی دن وہ پوچھتی۔

"سر! آپ اتنے اداس کیوں رہتے ہیں۔"

اور وہ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیتا۔ اداسی اس کی پُر

سحر آنکھوں میں ٹھہری جاتی اور...... اتنی بہت سی باتوں کا غم اسے رلائے جا رہا تھا۔ حیدر بھائی نے اسے دلاسا دیا۔

''تمہیں بہت شوق ہے پڑھنے کا تو تم پرائیویٹ امتحان دے لو۔ میں کسی دن بازار جاؤں گا تو تمہارے لیے پرانی کتابیں لیتا آؤں گا۔''

''جی!'' اس نے فوراً آنکھیں پونچھ کر ان کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ مگر ان کی آنکھوں میں محبت کی کوئی قندیلیں روشن نہ تھیں بلکہ وہ تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔

''بہت کمزور ہو رہے ہو بیٹا؟'' اماں نے ان کی بلائیں لیں۔ ''اور گھر پر بھی نہیں ملے دو دفعہ گئی لیکن۔''

''اصل میں پھپھو میں نے اوور ٹائم شروع کر دیا ہے۔'' وہ ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئے۔ ''آپ کو تو پتا ہی ہے، صفیہ کے سسرال والے کچھ لالچی سے لوگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی مرضی کے مطابق ہی سب کچھ ہو۔''

''جیتے رہو بچے تم جیسی اولاد خدا سب کو دے۔'' اماں نے انہیں دعا دی۔ اور اسے چائے بنانے کا حکم دیا۔

حسب وعدہ حیدر بھائی نے ایک روز ماموں کے ہاتھ اس کے لیے کتابیں بھیج دیں۔ اس نے کتابوں کا ایک ایک ورق کھول کر دیکھا کہ شاید کتابوں میں کہیں کوئی پیغام کوئی رقعہ ہو۔ تسلی کے دو لفظ۔ ایک محبت بھرا جملہ لیکن کہیں بھی کچھ نہ تھا۔ مایوسی سے اس نے کتابیں ایک طرف رکھ دیں۔

کبریٰ کے لیے ایک رشتہ آیا تھا۔ رشتے دار تو نہ تھے۔ البتہ برادری کے تھے۔ لڑکا اچھا تھا۔ بینک میں کلرک تھا۔ پھر ان لوگوں نے کسی قسم کا کوئی مطالبہ بھی نہ کیا تھا۔ اماں نے ماموں سے ذکر کیا۔ ماموں ایک لمحے کو خاموش ہو گئے۔

''میں نے سوچا تھا کہ کبریٰ کو اپنے حیدر کے لیے مانگ لوں گا۔ لیکن حیدر پر ابھی بہت بوجھ ہے۔ کہتا ہے سب بہنوں کی شادیاں کر کے ہی اپنے لیے کچھ سوچوں گا۔ خیر خدیجہ بھی اپنی بیٹی ہے۔ دونوں میرے لیے ایک سی ہیں، تم اللہ کا نام لے کر کبریٰ کے لیے ہاں کر دو اچھے لوگ روز روز نہیں ملتے۔ لیکن خدیجہ میری بچی ہے۔ یہ یاد رکھنا۔

اور اماں کا تو دل ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔

کبریٰ کو رخصت کر کے وہ بہت شانت ہو گئی تھیں۔

کبریٰ اپنے گھر میں خوش تھی۔ جب بھی وہ گھر آتی خدیجہ اس کے چہرے پر پھول کھلے دیکھتی۔

''تم خوش ہو نا کبریٰ۔''

''ہاں۔''

''نعیم بھائی کیسے ہیں؟''

''بہت اچھے۔'' کبریٰ کے رخساروں پر شفق پھوٹ پڑتی۔ ''نہ صرف مجھے چاہتے ہیں بلکہ بہت چاہتے ہیں مجھے۔ اور وہ میرا بہت خیال بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ افسانوں میں کچھ اتنا غلط نہیں لکھا ہوتا۔''

''اچھا'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی۔ ''آج رک جاؤ نا۔''

''نہیں بھئی، وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں تمہارے بغیر۔''

''اچھا تو شادی کے بعد بھی محبت ہوتی ہے۔ اور ایسے ڈائیلاگ بولے جاتے ہیں۔ وہ سوچتی۔

اور حیدر بھائی کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔

اماں سے کئی بار وہ سن چکی تھی کہ اسے ماموں کی بہو بننا ہے۔ کبریٰ کی شادی میں حیدر بھائی نے بالکل بیٹوں کی طرح سب کچھ سنبھالا تھا۔ آتے جاتے کئی بار آمنا سامنا ہوتا۔ بات ہوتی مگر حیدر بھائی نے کبھی اس پر کوئی اچھوتی نظر نہیں ڈالی تھی حالانکہ کبریٰ کے ولیمے والے دن تو اماں نے بطور خاص ان کی نظر اتاری تھی۔

''شاید حیدر بھائی ضرورت سے زیادہ شریف ہیں اور شادی سے پہلے اس پر ایسی نظر ڈالنا یا کچھ کہنا غلط سمجھتے ہیں۔ چلو شادی کے بعد سہی۔'' اس نے قناعت پسندی سے سوچا اور شانت ہو گئی۔

اگرچہ اس کے لیے اسے لمبا انتظار کرنا تھا لیکن اس نے کہیں پڑھا تھا کہ انتظار میں بھی بڑی لذت ہوتی ہے۔

اور ابھی وہ اس کی سچائی کا پرکھ ہی رہی تھی کہ اماں بیمار ہو گئیں۔ بظاہر تو انہیں کوئی خاص بیماری نہ تھی۔ معمولی سا دمہ تھا لیکن جانے ابا نے انہیں خواب میں آ کر کیا کہا تھا کہ وہ

پریشان رہنے لگی تھیں۔ ابا کی اماں سے خوابوں کی یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور ایک روز جب ماموں آئے ہوئے تھے انہوں نے بڑی حسرت سے کہا۔

"لگتا ہے اب زیادہ دن نہیں جیوں گی۔ بس ایک حسرت رہ جائے گی کہ خدیجہ بھی اپنے گھر کی ہو جاتی۔ بھائی، میرے بعد اپنی بات کا پاس رکھنا اور خدیجہ کو بہو بنا کر لے جانا۔"

ماموں نے انہیں تو تسلی دی کہ وہ ابھی بہت دن جئیں گی لیکن خود جانے ان کے دل میں کوئی وہم سا بس گیا تھا کہ دو چار روز بعد انہوں نے آ کر کہا کہ کل شام کو چند لوگوں کے ساتھ آؤں گا اور خدیجہ کو رخصت کرا کے لے جاؤں گا۔ اسے اپنے اس اچانک نکاح کی خبر کبریٰ سے ملی تھی جو اماں کے ہنگامی بلاوے پر بھاگم بھاگ چلی آئی تھی۔

حیدر بھائی اس اچانک پڑ جانے والی افتاد سے کچھ بوکھلائے ہوئے تھے۔ وہ ذہنی طور پر شاید اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ نہ تو انہوں نے اس کے حسن کی تعریف کی اور نہ ہی کوئی رومانی مکالمہ بولا وہ بہت سنجیدہ اور الجھے الجھے سے تھے۔

"میں ابھی اس کے لیے تیار نہ تھا۔" انہوں نے کہا "اور ابھی میرے کندھوں پر بہت بوجھ ہے۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ میں نے ابا سے کہا تھا لیکن انہوں نے کہا تھا کہ تم سمجھداری کا ثبوت دو گی۔"

اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔

کبریٰ نے اسے بتایا تھا کہ نعیم نے اس کے مہدی لگے ہاتھوں کی کتنی تعریف کی تھی۔ کتنے قصیدے پڑھے تھے۔ اور اس نے مہدی بھی نہیں لگائی تھی۔

شاید اس کی قسمت ہی ایسی ہے۔

وہ بہت خاموش ہو گئی تھی جیسے اس کے اندر کچھ مر گیا ہو جیسے کسی کی آخری امید بھی دم توڑ دے۔ حیدر بہت مصروف رہتے تھے۔ رات کو تھکے ہارے آتے۔

"ناشتا لاؤ، کپڑے استری کر دیے جوتے پالش ہو گئے۔"

ان باتوں کے علاوہ اگر ان کے درمیان کوئی گفتگو بھی ہوتی تو وہ صغریٰ بے بی اور گڑیا کی شادیوں کے بارے میں ہوتی۔ ماموں کی بیماری کا ذکر ہوتا یا پھر اماں کی بیماری زیر بحث آتی۔ کبھی کبھار تو منو اور ککو کے مستقبل پر بھی بات ہو جاتی۔ اور بس حیدر نے کبھی اس

کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے تھے۔ یونہی زندگی کے سات برس بیت گئے۔

حیدر اپنا بوجھ ہلکا کرتے رہے۔ اور وہ اندر ہی اندر کلستی رہی۔ بچے تھے نہیں کہ دل بہل جاتا۔ کچھ حیدر خود بھی بچوں کے حق میں نہ تھے اور کچھ شاید خدا کو بھی منظور نہ تھا۔

"ٹیمی! اللہ کرے تم کبھی خوش نہ رہو۔" کبھی کبھی اس کے دل سے آہ نکلتی۔

بظاہر زندگی میں کوئی کمی نہ تھی۔

حیدر نے کبھی اس سے اونچی آواز میں بات تک نہ کی تھی۔ ماموں ممانی اسے چاہتے تھے۔ نندیں بہنوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ پھر بھی کوئی کمی تھی جو اسے اداس رکھتی تھی۔ یہ ٹیمی نے اس کے دل میں کیسی آگ لگا دی تھی۔ کیسی طلب تھی جو پوری نہ ہوتی تھی۔

کیسی خواہش تھی۔ جو اسے بے چین رکھتی تھی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ اماں پھپھو کی بات مان لیتیں کبھی کبھی وہ بے دلی سے سوچتی۔

پھپھو نے اس کی شادی کا سن کر کتنا واویلا مچایا تھا۔

"میرے اکلوتے بھائی کی بیٹی ہے۔ پہلا حق میرا تھا۔ اور شکور بھائی تو سارا ٹائم منہ لٹکائے بیٹھے رہے تھے۔

"تو تو بڑی خوش نصیب ہے۔ خدیجہ! حیدر جیسا شوہر اور ایسا محبت بھرا سسرال ملا ہے۔" ایک بار اماں نے اس کے چپ رہنے پر ٹوکا تھا۔ "پھر بھی جانے کیوں چپ چپ رہتی ہے۔"

"یونہی بس تمہارا خیال رہتا ہے۔"

"ارے، میرا نہ سوچا کر، ٹھیک ہوں میں۔" وہ ہنس دی تھیں۔

وہ خوش نصیب تو تھی پر یہ کیسی خوش نصیبی تھی کہ تشنگی ختم نہ ہوتی تھی۔

صغریٰ اور بے بی کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ گڑیا کا رشتہ لاہور سے آیا تھا۔ حیدر کو لڑکا پسند آیا تھا وہ ماموں ممانی وغیرہ کے ساتھ گھر وغیرہ دیکھنے لاہور گئی تھی۔ اور وہاں ہی اچانک

انار کلی میں شاپنگ کرتے ہوئے اسے ٹیمی مل گئی تھی۔ اگرچہ اتنے سالوں بعد اس نے ٹیمی کو دیکھا تھا پھر بھی پہچان گئی تھی۔ اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بہت بے رونق اور بجھی بجھی لگ رہی تھیں۔ اگرچہ اس نے خوب گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔

''ٹیمی!'' اس نے بے اختیار اسے پکارا۔

ٹیمی نے اجنبی نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے پہچاننے میں کچھ وقت تو ہوئی تھی لیکن اس نے پہچان لیا۔

''ارے یہ تم ہو خدیجہ!'' وہ بہت خوش ہوگئی۔ اور رشک بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''سچی کتنی خوب صورت ہوگئی ہو کتنی حسین۔''

''تم اچانک چلی آئی تھیں میں تمہیں ملنے گئی تھی۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''ہاں یار، پاپا کی اچانک تبدیلی ہوگئی تھی۔ اور مجھے تمہارے گھر کا بھی نہیں پتا تھا۔''

''ٹیمی!'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ایک خلش جو مدت سے اس کے دل میں تھی۔ ٹیمی کو دیکھ کر پھر جاگ اٹھی تھی۔

''ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں ضرور۔''

''تم نے نادر اور اسکندر بھائی میں سے کس کا انتخاب کیا تھا؟''

''میں نے۔'' اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا۔

''میری شادی سکندر سے ہوگئی تھی۔''

''اچھا۔'' اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ جیسے اس کے دل سے کوئی پھانس نکل گئی ہو۔ سکندر سے اگر اس کی شادی نہ ہوتی تو شاید وہ مر ہی جاتا۔

''اور نادر بھائی۔'' اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ ''وہ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔''

''شادی کر لی انہوں نے؟''

''ہاں دو بچے بھی ہیں ان کے۔''

''لیکن وہ تو کہتے تھے کہ اگر تم نہ مل سکیں تو پھر وہ کسی سے بھی شادی نہیں کریں گے۔''

''یہ سب باتیں ہوتی ہیں خدیجہ اور تم بہت بھولی ہو اب بھی۔ اور تمہاری شادی ہو گئی۔''

''ہاں۔''

''کس سے؟''

''حیدر سے۔''

''اوہ، بہت لکی ہو تم خدیجہ۔''

''اب تمہیں کیا پتا کہ میں کتنی لکی ہوں۔'' افسردگی اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی۔

''اچھا تم یہاں لاہور کتنے دن رہو گی۔''

''شاید ایک دو دن رک جاؤں۔''

''تو پھر میرے گھر ضرور آنا۔''

''اچھا۔''

اس نے گھر کا پتا اچھی طرح سمجھ لیا۔

وہ خود اس کے گھر جانا چاہتی تھی دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے گھر میں کس طرح رہتی ہے اور سکندر بھائی کیا اب بھی اس کو اسی طرح چاہتے ہیں۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اگلے ہی دن ماموں کے ساتھ وہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ بڑی سی کوٹھی کا گیٹ چوپٹ کھلا تھا۔ وہ بلا جھجک اندر چلی گئی۔ بڑے سے لان کو عبور کر کے وہ کوریڈور میں ذرا دیر کے لیے رکی۔

یہ گھر بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے افسانوں میں پڑھا تھا۔ اس نے ایک عجیب حسرت کے ساتھ چاروں طرف دیکھا۔ ماموں گیٹ کے پاس ہی کھڑے تھے۔ اس نے ہی انہیں وہاں رکنے کو کہا تھا کہ ٹیمی کو بتا کر ماموں بھی ساتھ آئے ہیں۔ وہ انہیں اندر بلا لے گی۔ ایک بھرپور نظر چاروں طرف ڈال کر اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کہیں کوئی نوکر کا ملازم نظر آجائے کہ اچانک اندر سے کسی مرد کی غصیلی آواز آئی۔

''میں ساری زندگی ڈراما نہیں کر سکتا ٹیمی۔''

''سکندر! پلیز میں وہی ٹیمی ہوں۔''

''جانتا ہوں۔'' وہی غصیلا لہجہ۔

''تم نے مجھ سے محبت کی تھی۔''

''غلط جھوٹ۔'' وہ دہاڑا ''میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔ کیا تھا تم میں جو تم سے محبت کرتا۔ تمہیں تو محض میں نے ذریعہ بنایا تھا تمہاری سہیلی تک پہنچنے کے لیے لیکن میری بد قسمتی۔''

''میری سہیلی۔'' ٹیمی کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔

''ہاں تمہاری وہ سہیلی جو تمہارے گھر کبھی کبھی فلم دیکھنے آتی تھی۔ یہ سچ بھی آج سن لو کہ محبت کرنے کے قابل تو وہ تھی۔ تم اور تمہاری ممی نے تو مجھ پھانسا تھا۔''

''نہیں۔'' باہر کھڑے کھڑے اس نے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

''ارے، یہ کیسی افسانوی بات ہوگئی ہے۔''

اس نے حیرت سے سوچا اور ایک طمانیت کا سا احساس اس کے پورے وجود میں اتر گیا۔

''اب تو تمہاری بیوی ہوں میں سکندر۔''

''بیوی نہیں، گلے میں پھنسی ہوئی چھچھوندر جسے نہ نگل سکتا ہوں نہ اگل سکتا ہوں لیکن میں بھی۔''

''تم کیا کرو گے۔''

''میں دوسری شادی کروں گا۔ تمہارے پاپا میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر سمجھتے ہیں کہ میں تمہیں طلاق نہیں دے سکتا تو کیا ہوا۔ شادی تو کر سکتا ہوں نا۔''

''خدا کے لیے سکندر، پلیز مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔''

ٹیمی کے رونے کی آواز آئی اور پھر شاید سکندر نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا کہ ٹیمی چیخنے لگی۔ خدیجہ نے لحہ بھر رک کر کچھ سوچا اور پھر واپس پلٹ آئی۔

لاہور سے واپس آئی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی ہو۔ اسے بھی کسی نے چاہا تھا۔ کسی نے پسند کیا تھا۔ وہ اتنی بے وقعت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ایک خلش سی تھی۔ انجانی سی سمجھ میں نہ آنے والی۔

کاش حیدر نے کبھی اس سے کچھ کہا ہوتا۔

کوئی خوبصورت بات۔

چاہے ایک بار ہی سہی۔

اس روز وہ حیدر کے کپڑے استری کرتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ شیو کرتے ہوئے حیدر نے دو تین بار گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر برش رکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

''خدیجہ!'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''آج بہت خوش لگ رہی ہو کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''نہیں تو۔''

''اتنے سالوں میں میں نے پہلی بار تمہیں گنگناتے سنا ہے اور پہلی بار ہی تمہارے چہرے پر اتنی رونق دیکھتی ہے۔''

''وہ گڑیا کی شادی ہے نا اور اس کے سسرال والے سب بہت اچھے ہیں۔ اس لیے میں خوش ہوں۔'' اس نے حیدر کی طرف دیکھے بنا کہا۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ ایک شخص کے ایک جملے نے اسے خود اپنی نظروں میں معتبر کر دیا تھا۔

''میں بھی خوش ہوں خدیجہ!'' حیدر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ ان بیتے سالوں میں تمہیں میں وہ سب کچھ نہیں دے سکا جو تمہارا حق تھا۔ مگر جاناں! میرے کندھوں پر بہت بوجھ تھا میں اتنا تھک جاتا تھا کہ تمہیں وقت نہ دے سکا۔ مجھے احساس تھا کہ تمہاری حق تلفی ہو رہی ہے۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ ایک ہی بار ساری تلافی کر دوں گا۔ تمہیں اتنا چاہوں گا اتنی محبت کروں گا کہ تم بیزار ہو جاؤ گی۔''

''بھلا محبت بھی بیزار کرتی ہے۔ اس کا دل چاہا وہ کہے۔ لیکن وہ چپ رہی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا ساتھ دیا کبھی کوئی شکایت کوئی شکوہ نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے ڈر تھا کہ تم اتنی کم عمر ہو کہ ضرور شور مچاؤ گی۔ لیکن تم خود جتنی پیاری ہو اس سے کہیں زیادہ پیارا تمہارا دل ہے۔ اب گڑیا کی شادی کے بعد میں اوور ٹائم چھوڑ دوں گا۔ پھر میرا سارا وقت تمہارے لیے ہوگا۔ تم مجھ سے خفا ہو گی، دل ہی دل میں ناراض رہتی ہو گی۔''

''نہیں تو۔'' وہ نئی نویلی دلہنوں کی طرح شرما رہی تھی اور اس کے رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔

''تم بہت اچھی ہو خدیجہ! بہت پیاری اور میں بہت خوش نصیب کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی۔''

حیدر جانے کیا کیا کہہ رہا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے عمر بھر کی تشنگی ختم ہو گئی ہو۔ اور وہ سچ مچ بہت لکی ہو۔ ٹیمی سے ہزار گناہ زیادہ لکی۔
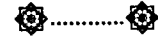
انتظار کی تھکن

اور کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کوئی کسی کا انتظار کر رہا دنوں، ہفتوں، سالوں اور مہینوں سے۔

اور وہ نہ آئے۔

وہ جس کا انتظار کیا جا رہا ہو۔

اور اسے پتا بھی ہو کہ کہیں دور کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے، اور پھر بھی وہ نہ آئے۔

اور کیا ایسا ہو سکتا ہے۔

رباب کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کوئی ساتویں بار سوچا۔ اور پھر خود ہی میرے دل نے اس کی تردید کر دی نہیں۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔

ربی کا انتظار ضرور ختم ہوگا اور وہ ضرور آئے گا۔ آخر کو وہ، اسے انتظار کرنے کو کہہ گیا ہے۔ اور رباب کو اس پر بڑا یقین ہے۔

لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ شاید اس لیے کہ اس نے آنے میں دیر کر دی ہے۔

اگر اسے لوٹ کرنا آنا ہی تھا تو پھر اس نے اتنی دیر کیوں کی۔

''ربی۔''

میں نے کپڑوں کی الماری صاف کرتی ربی کو آہستہ سے بلایا۔

''ہوں۔'' اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

"ربی! وہ تمہیں خط تو لکھتا ہوگا۔ کیا کہتا ہے، وہ اتنی دیر کیوں کی اس نے۔"

"نہیں خط تو اس نے کبھی نہیں لکھا۔"

"پھر بھی...... پھر بھی تم اس کا انتظار کر رہی ہو پگلی لڑکی۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں اس نے کہا تھا کہ اسے وقت لگے گا میں گھبراؤں نہیں۔ بس خاموشی سے اس کا انتظار کروں۔ دراصل۔"

وہ الماری کی پٹ یونہی کھلی چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھی۔ "اس کا خاندان بہت بڑا ہے۔ اور وہ پورے خاندان سے ٹکر نہیں لے سکتا اور پھر سب سے زیادہ اسے اپنی ماں کا خیال تھا۔ وہ ماں کی مرضی کے بغیر مجھے نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اس کی ماں...... اس کے باپ کے مرنے کے بعد بہت تھکی ہے۔ بہت محبتوں سے پالا ہے اسے۔ وہ ماں کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ بس میرا انتظار کرنا ہوگا۔ سو میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ ہنسی اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں تارے سے دمکنے لگے۔

"اچھا اب تم اٹھو منہ ہاتھ دھو لو، میں ناشتا لگاتی ہوں۔"

"تم نے آج چھٹی کی ہے۔" میں نے سلیپر پاؤں میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو آج میری ایوننگ ہے۔"

"اور مارتھا"

"وہ چلی گئی ہے۔"

اور جب میں منہ ہاتھ دھو کر آئی تو وہ چھوٹی سی لکڑی کی میز پر ناشتا لگا چکی تھی۔

"آج تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

"کچھ نہیں، آج ریسٹ کروں گی اور شام کو تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤں گی۔ کچھ شاپنگ کروں گی اور کل صبح واپسی۔"

"کل تم واپس چلی جاؤ گی۔"

اس کا سانولا چہرہ بجھ سا گیا۔

"تمہارے آنے سے کتنی رونق ہوگئی تھی۔ فاطمہ تم یقین کرو گی، ان چند دنوں میں

ہی تم کتنی اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔ عجیب سی اپنائیت محسوس ہونے لگی تھی۔ تم سے، جیسے میں تمہیں برسوں سے جانتی ہوں۔"

"ہاں ربی! میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔ حالانکہ آج سے صرف چار دن پہلے تک مجھے علم ہی نہیں تھا کہ اس ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کے لیے میں اپنے دل میں اتنی اپنائیت محسوس کروں گی۔"

"ہاں ایسا پتا نہیں کیوں ہوتا ہے شاید روح کا روح سے کوئی پرانا تعلق ہوتا ہے۔ جو دو اجنبی شخص ایک دم سے بالکل اچانک ایک دوسرے کی کشش کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جب پہلی بار زین مجھے ملا تھا تو مجھے گمان تک نہ تھا کہ کبھی یہ شخص میری زندگی میں اتنا اہم ہو جائے گا کہ اس کے لیے میں اپنے سارے رشتے ناتے توڑ دوں گی۔"

"زین تمہیں پہلی بار کب ملا تھا ربی۔"

میں نے ابلا ہوا انڈا چھیلتے ہوئے پوچھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے اس سے زین کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ زین کی باتیں کرتی رہے۔ اور میں سنتی رہوں۔ خود بخود بنا دیکھے، بنا جانے اس لڑکے کے لیے میرے دل میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ کل رات بھی جب وہ زین کی باتیں کر رہی تھی تو خود بخود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور شرارتیں سننا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ زین جو میرا کوئی نہیں تھا۔ اور یہ لڑکی جسے چار روز قبل میں جانتی تک نہ تھی یہ دونوں میرے کس قدر قریب آ گئے تھے۔ مارتھا سو گئی تھی عینی ساتھ والے کوارٹر میں چلی گئی تھی اور ہم دونوں باتیں کر رہے تھے بلکہ وہ بولتی رہی اور میں سنتی رہی تھی۔

"زین پہلی بار مجھے یہاں ہی ملا تھا۔ یہیں اس ہاسپٹل میں۔"

اس نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکائی۔

"اس وقت مجھے جاب کرتے ہوئے ابھی صرف تین مہینے ہوئے تھے اور میں پتا نہیں کیوں ذرا ذرا سی بات پر بہت گھبرا جاتی تھی۔ حالانکہ ٹریننگ کے دوران بھی ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا، پھر بھی میرا مزاج پتا نہیں کیوں ایسا تھا۔ میں کبھی کسی مریض سے اس کے لواحقین سے بے تکلفی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ مرد ڈاکٹر سے بات کرتے ہوئے بھی میری، زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ ان دنوں تین چار ڈاکٹر نئے آئے تھے۔ وہ غالباً سب

ہاؤس جاب کر رہے تھے۔ وہ تینوں چاروں بہت شوخ مزاج کے تھے۔ مریضوں سے ہنسی مذاق، آتی جاتی نرسوں سے چھیڑ چھاڑ لیکن یہ بات بہر حال تھی کہ ان کا مذاق تہذیب کے دائرے سے کبھی باہر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دو بار انہوں نے مجھے بھی مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ لیکن میں سنی ان سنی کر کے گزر جاتی تھی۔ جلد ہی وہ چاروں دوست یہاں ہاسپٹل میں کافی مقبول ہو گئے۔ اسٹاف سے لے کر صفائی کرنے والوں سے بھی ان کی بے تکلفی ہوگئی تھی بلکہ اگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ جس نرس کی...... بھی ڈیوٹی ہوتی وہ اس سے خوب گپ شپ لگاتے۔ غرض وہ سب سے ہی بے تکلف تھے۔ میں کسی سے فالتو بات نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کسی کے پاس بیٹھ کر گپ لگاتی تھی۔ مگر اس روز جب میں ڈیوٹی آف کر کے باہر نکلی تو بالکل اچانک اس نے سامنے سے آ کر مجھے پکارا سسٹر پلیز، ایک منٹ۔''

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈاکٹر زین تھا۔ انہی چاروں میں سے ایک۔

''جی۔'' میں ہمیشہ کی طرح گھبرا گئی۔

''آپ پلیز، آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پییں گی۔ وہاں سامنے والے ریسٹورنٹ میں۔''

''جی۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے سوری۔''

میں نے ایک قدم آگے بڑھا دیا۔

''نہیں پلیز رک جائیں۔ میں نے آپ کو غلط نہیں سمجھا۔ خدا کی قسم میں آپ کو بالکل بھی غلط نہیں سمجھتا۔ اگر میرے خدا کی قسم پر آپ کو یقین نہیں ہے تو آپ کے یسوع مسیح کی قسم میں تو آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔''

وہ اس طرح تیز تیز بول رہا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

''اچھا۔ میں نے مان لیا کہ آپ مجھے غلط نہیں سمجھتے اب مجھے جانے دیں۔''

''نہیں بھلا آپ کو کیسے جانے دوں، ایسے ہی چائے پلائے بغیر۔ دراصل یہ ایک اور مسئلہ ہے۔ ایک اور ہی گمبھیر مسئلہ۔ پلیز مس۔''

''کیتھی۔''

''ہاں مس کیتھی! دراصل یہ عزت اور وقار کا سوال ہے۔ پلیز میری مدد کیجیے۔''

''لیکن میں آپ کی مدد کس طرح کر سکتی ہوں۔''

''میرے ساتھ ایک کپ چائے پی کر۔''

میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''وہ تینوں۔ وہ تینوں اور خاص کر وہ عابدین تو میرا مذاق اڑائے گا۔ کہ دیکھو سسٹر کیتھی نے اس کے ساتھ ایک کپ چائے تک نہیں پی۔ اف کس قدر ریکارڈ لگائیں گے وہ میرا۔ لیکن آپ کو اس سے کیا۔ بے چارا ڈاکٹر زین بلا سے سب کے مذاق کا نشانہ بنتا رہے۔ سوری میں یونہی آیا تھا میں نے سوچا تھا کہ آپ میرا مان رکھ لیں گی۔ لیکن '

ڈاکٹر! آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

''سیدھی سی بات ہے سسٹر کہ ان تینوں نے مجھ سے شرط لگائی ہے کہ سسٹر کیتھی تمہارے ساتھ چائے نہیں پییں گی۔ اب یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں کوئی غنڈہ نہیں شریف آدمی ہوں۔''

''انہوں نے صحیح ہی کہا تھا ڈاکٹر۔''

میں جانے کے لیے مڑی لیکن اس نے مجھے پھر روک لیا اور۔''

''اور پھر تم نے اس کے ساتھ چائے پی لی۔''

''وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ میں انکار نہ کر سکی۔'' اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

''تم اور چائے لو گی۔''

''نہیں۔''

میں نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ناشتے کے برتن اٹھا رہی تھی۔ وہ دبلی پتلی سی تھی۔ رنگت سانولی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی باریک سی، اماں ایسی آنکھوں کو زیرے والی آنکھیں کہا کرتی تھیں۔ اس کے پورے چہرے پر ایک ناک ایسی تھی، جسے خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ چھوٹی سی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک، اور بال ہاں اس کے بال بھی خوبصورت تھے۔ لمبے سیاہ سیدھے چمکتے بال۔ بس اس کے علاوہ اس کے ظاہر میں کوئی حسن نہ تھا۔ اس کا سانولا رنگ پرکشش کہا جا سکتا تھا۔ اگر اس کا چہرا اس طرح موٹے موٹے کیلوں اور دانوں سے بھرا نہ ہوتا۔ اس لڑکی میں اٹریکٹ کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ پتا نہیں ڈاکٹر زین نے اس سے محبت کس طرح کی ہوگی۔ اس کی باتوں سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے بے پناہ چاہتا تھا۔ بے حساب۔

کیا ڈاکٹر زین کا دل اس کی اس چھوٹی سی ناک میں الجھ گیا تھا۔لیکن نہیں خصوصیت سے تو اس کی ناک پر نظر پڑتی ہی نہیں تھی۔ بظاہر وہ بالکل عام سی معمولی سی لڑکی نظر آتی تھی۔ ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں لڑکیاں ہمارے پاس سے گزر جاتی ہیں اور ہم انہیں...... آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔

اور اب یہ اس کی روم میٹ مارتھا۔اور کیا مارتھا سے بھی کسی نے محبت کی ہوگی۔کسی ڈاکٹر زین نے یا کسی اور نے۔

ربی بھی تو مارتھا ہی کی طرح ہے۔ بلکہ مارتھا کا جسم رباب سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلکش تھا۔بھرا بھرا گداز جسم۔

اور عینی وہ۔وہ کس قدر دلکش ہے۔شاید کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔

اس کا جسم، اس کا قد، اس کی رنگت، اس کی آنکھیں اس کی ناک، اور پیشانی سب۔سب کچھ کیسا سانچے میں ڈھلا ہے اور محبت تو عینی جیسی لڑکیوں سے کی جاسکتی ہے۔

لیکن عینی سے کسی نے محبت نہیں کی۔اس کے منگیتر نے بھی نہیں۔

جس نے محض یہ کہہ کر اپنی بچپن کی نسبت توڑ دی۔" کہ اسے عینک لگانے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ اور یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ لینس بھی لگوا سکتی تھی اور پھر عینک اس کے گول چہرے پر کتنی سجتی ہے لیکن اس کے منگیتر نے اسے رد کر دیا۔ اور اس خوبصورت لڑکی کے دل میں کتنا گہرا گھاؤ ہے۔ جو بھرتا ہی نہیں۔اور یہ۔

یہ بے حد عام سی سانولی رنگت اور معمولی نقش و نگار والی لڑکی کتنی خوش قسمت ہے۔

اپنے دل کے سیپ میں ڈاکٹر زین کی محبت کا موتی چھپائے ہوئے ہے اور اس کی باتیں کرتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کیسے دمکنے لگتی ہیں۔

اور سانولی رنگت کیسے لو اُٹھتی ہے۔

اور یہ محبت کا فلسفہ بھی کچھ عجیب ہے۔

کبھی ایک عام سی معمولی سی سانولی لڑکی کی جھولی اس خزانے سے بھر جاتی ہے اور کبھی ایک بہت اچھی بہت پیاری، بہت قابل لڑکی جو محبت کیے جانے کی اہل ہوتی ہے اسے محبت نہیں ملتی۔ میں نے برسوں سوچا ہے کہ بھلا ایسا کیوں ہے جب اللہ میاں نے محبت کا یہ ننھا سا جذبہ دل میں رکھا ہے۔تو پھر یہ محبت ہمیں ملتی کیوں نہیں ہے۔ہم اس محبت سے محروم کیوں

رہ جاتے ہیں۔ برسوں میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔زاویے سے۔

بھلا مجھ میں کیا کمی تھی جو۔

متناسب جسم بڑی بڑی گھنی لانبی پلکوں والی دلکش براؤن آنکھیں، گندمی رنگت، خوبصورت کٹاؤ والے ہونٹ، پیاری سی ناک۔

مجھے تو اپنا آپ ہمیشہ ہی اچھا لگا۔

اور یہی نہیں میرا تو من بھی بڑا خوبصورت تھا۔ میرا دل جس میں ایک جہان کے لیے محبت بھری تھی۔ جسم میں کہیں کسی کے لیے نفرت نہیں تھی۔

میں کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتی تھی۔ مجھے کبھی کسی پر غصہ نہیں آیا تھا۔ کوئی مجھ سے کتنی بھی زیادتی کرے معاف کر دیتی تھی۔

میں پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ ہمیشہ ٹاپ کرتی میں کوکنگ میں ماہر تھی۔ میرے ہاتھوں میں بہت ذائقہ تھا۔ سلائی کڑھائی۔گھر کی ڈیکوریشن۔

لیکن میری اتنی بہت ساری خوبیاں کبھی کسی کو نظر ہی نہ آئیں اور میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر شخص کا جوڑ پیدا کیا گیا ہے۔

اور وہ ایک شخص پتا نہیں کہاں جا چھپا تھا۔ جسے مجھ سے محبت کرنا تھی۔

اور جس کے لیے میں نے اپنے دل میں ڈھیروں محبتیں چھپائی ہوئی تھیں اور یہ لڑکی اس نے کچھ چاہا بھی نہیں مانگا بھی نہیں۔

مہینوں ہی زین...... ہاں ڈاکٹر زین کی محبت سے بھاگتی رہی۔اور وہ اس کی جھولی میں اپنی محبتوں کے پھول پھینکتا رہا۔اور پھر جب اس نے اس کی محبتوں کے پھول چن کر دل میں چھپا لیے تو وہ اسے انتظار کرنے کا کہہ کر خود نہ جانے کہاں چلا گیا۔

میں نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ وہ ناشتے کے برتن سمیٹ چکی تھی اور اب پھر اپنے کپڑے تہہ کر کر کے الماری میں رکھنے لگی تھی۔

افوہ...... وہ کس قدر عام سی لڑکی تھی۔ بلکہ عام سے بھی قدرے کم تر۔ یقیناً ڈاکٹر زین بھی ایسا ہی ہوگا۔ یوں ہی عام سی شکل وصورت کا، چھوٹے سے قد والے ڈاکٹر احسن میری آنکھوں کے سامنے آگئے یقیناً وہ ایسا ہی ہوگا۔

کالا سا، چھوٹے سے قد کا، معمولی نقش و نگار کا۔

"ربی! زین کیسا تھا۔"

"اچھا۔ بہت اچھا ہے۔ اس نے مڑے بغیر کہا۔

"نہیں میرا مطلب ہے شکل وصورت۔"

"وہ بہت خوبصورت ہے، بہت اسمارٹ، اونچے لمبے قد کا، پورا چھ فٹ قد ہوگا اس کا گورا چٹا......اور آنکھیں بڑی بڑی، بالکل مغل بادشاہوں جیسی۔"

"اور پھر بھی اس نے تمہیں چاہا۔"

بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں پھر بھی اس نے مجھے چاہا۔"

وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگی اس کے چہرے پر الوہی چمک تھی۔

یہ چمک احساس محبت نے اسے عطا کی تھی، یہ احساس کہ کوئی اسے چاہتا ہے، دل کی تمام تر گہرائیوں سے، روح کی شدتوں کے ساتھ۔

اور یہ جو اس کے سانولے چہرے پر رونق اور چمک آئی ہے، چھوٹی چھوٹی باریک آنکھیں میں برق سی کوندتی ہے۔ تو یہ سب اسی محبت کا کرشمہ ہے۔

اور میرے چہرے پر کیسی بے رونقی ہے۔ صرف ستائیس سال کی عمر میں میری آنکھوں کے گرد لکیریں پڑ گئی ہیں۔ اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔

کاش مجھے بھی کسی نے چاہا ہوتا۔

مجھ سے بھی کسی نے محبت کی ہوتی۔

تو آج میرے چہرے پر بھی یہ الوہی سی چمک ہوتی اور میری آنکھوں میں بھی، بجلیاں کوندتیں، کیا تھا کیا تھا اگر عثمان علی مجھے نہ ٹھکراتا۔ لیکن اس نے تو مجھے دیکھے بنا ہی رد کر دیا تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا۔

اگر وہ مجھ سے مل لیتا تو......تو شاید۔

"کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے فاطمہ؟"

چند لمحے مجھے یوں ہی دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم مارتھا اور عینی سے پوچھ لو۔ بلکہ آخری بار جب وہ جا رہا تھا تو اس نے ان دونوں کی کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ مجھے منا لیں اور ہم دونوں کورٹ میرج کر لیں۔ لیکن میں اس

کے لیے تیار نہ تھی۔"

"اچھا وہ تم سے کورٹ میرج کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں، تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں نہیں ربی! مجھے تمہارے بتائے گئے ایک ایک لفظ کا یقین ہے۔ سچ کی اپنی ایک الگ ہی خوشبو ہوتی ہے۔ جو اپنا پتا دیتی ہے۔ بلکہ جب سے تم نے زین کے متعلق بتایا ہے تب سے میں دل ہی دل میں تمہارے لیے دعا کر رہی ہوں۔ کہ خدا کرے تمہارا انتظار جلد ختم ہو جائے۔ تمہارا زین جلد لوٹ آئے۔"

"تھینک یو فاطمہ......" وہ مڑ کر پھر الماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

یہ رباب ہے، جو کبھی کیتھی تھی، میں جب سے آئی ہوں فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ یہ خوش قسمت ہے۔ یا بد قسمت۔

کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی کہوں کیونکہ اس نے اپنی مٹھی میں محبت کا موتی بند کر رکھا ہے۔

اور کبھی میرا دل چاہتا ہے۔ اسے دنیا کی بد قسمت ترین لڑکی کہوں جو سب اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی پچھلے چار سالوں سے اکیلی ہے۔ کیونکہ وہ کیتھی سے ام رباب بن گئی۔

اس لیے اس کے ماں باپ نے اس سے اپنا ہر تعلق توڑ لیا ہے۔ اور یہ کتنا مشکل ہے۔ اس طرح اپنا مذہب، اپنا عقیدہ اور اپنے والدین، بہن بھائیوں کو چھوڑنا۔

لیکن اس نے ایسا کیا، کیونکہ اس کے دل میں زین کی محبت بہت پاورفل تھی۔ سو زین کی محبت ان سب کی محبت پر بازی لے گئی۔ اور وہ سب جنہوں نے اسے پالا پوسا تھا۔ بڑا کیا تھا۔ ان سب کی محبت ہار گئی۔

کچھ محبتیں بڑی پاورفل ہوتی ہیں۔

جیسے......جیسے اس نامعلوم لڑکی کی محبت جس نے عثمان علی کو۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ پتا نہیں ربی خوش قسمت ہے یا بد قسمت۔ لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں ستارے دمکتے دیکھے ہیں۔

اور ستارے تو انہی کی آنکھوں میں دمکتے ہیں، خود کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ اور میں نے جب پہلی نظر اس لڑکی کے چہرے پر ڈالی تھی تو اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر

جو سکون اور طمانیت مجھے دکھائی دی تھی اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ لڑکی بڑی خوش قسمت ہے تب مجھے اس کے متعلق کچھ بھی تو پتا نہیں تھا۔ میں سیدھی کراچی سے آ رہی تھی۔

ایئرپورٹ سے یہاں تک کا فاصلہ میں نے سوچتے ہوئے کاٹا تھا۔ کہ اگر مسز رباب نہ ملیں تو۔ اور اس تو کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں کیا کروں گی۔ میں یہاں لاہور میں کسی کو نہ جانتی تھی۔

دراصل یہاں لاہور میں ایک تعلیمی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اور مجھے بھی اس کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھنا تھا۔ یہ کانفرنس تین روز تک جاری رہنی تھی۔ اور اس سیمینار میں شرکت کرنے والوں نے اپنی رہائش کا بندوبست خود کرنا تھا۔ اور جب مجھے پتا چلا تو میں نے اس میں شریک ہونے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ مگر میری کولیگ مس عابدہ اور میری پرنسپل نے بہت اصرار کیا۔

''تمہیں ضرور جانا ہے۔''

''لیکن میں لاہور میں کسی کو نہیں جانتی۔''

''بھئی تم۔ اپوا ہوسٹل میں چلی جانا، وہاں پر میری دوست رہتی ہیں۔ مسز رب، تم ان کے پاس رہنا جتنے دن دل چاہے میں خط لکھ دوں گی۔''

لیکن میں پھر بھی متذبذب تھی۔

''تم نے جو پیپر وہاں پڑھنا ہے فاطمہ! وہ بہت اہم ہے، اس میں بہت سی چونکا دینے والی باتیں ہیں۔ بہت سے غور طلب مسائل کی طرف تم نے توجہ دلائی ہے۔ تمہیں ضرور جانا چاہیے۔''

پرنسپل نے مجھے متذبذب دیکھ کر کہا تو میں تیار ہو گئی۔ لیکن اندر سے میں ڈر رہی تھی اگرچہ میں ایک ذمہ دار لیکچرر ہوں، چار سال سے پڑھا رہی ہوں، اور اپنے بڑے سارے گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ تنہا رہتی ہوں، بظاہر بہت بہادر ہوں۔ لیکن اندر سے میں بڑی ڈرپوک ہوں۔ راہ چلتے چلتے ڈر کر ٹھٹک کر رک جاتی ہوں۔

ایک دم اپنے اکیلے ہونے کا تنہا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے میں بغیر کسی تحفظ کے اور بغیر کسی سہارے ہوں۔ سو ایئرپورٹ پر اترتے ہی یہ خوف میرے دل میں دامن گیر ہو گیا کہ اگر مسز رب نہ ہوئیں تو؟ مسز رب کے نام لکھا ہوا خط میرے پاس موجود تھا لیکن اس

خط کا کیا فائدہ اگر مسز رب نہ ہوئیں تو، حالانکہ عابدہ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ صرف لمبی چھٹیوں میں گھر جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کا گاؤں بہت دور ہے۔ وہ لاہور کے کسی کالج میں پڑھاتی ہیں...... پھر بھی نہ جانے کیوں یہ خیال میرے دل میں آ گیا تھا۔

ہوسٹل کی عمارت کافی بڑی تھی۔

میں سیدھی چلتی گئی۔ سامنے کوارٹر سے بنے ہوئے تھے۔ لمبے سے برآمدے میں کچھ لڑکیاں رسی پر کپڑے لٹکا رہی تھیں۔

''یہ چھ نمبر کدھر ہے۔''

''آگے ہے۔'' ایک لڑکی نے اشارہ کیا۔ ''دوسرے حصے میں۔''

چھ نمبر پر تالا پڑا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس اجنبی شہر میں کہاں جاؤں۔ کیا کسی کالج کے ہوسٹل میں چلی جاؤں، پچھلے سال اسلام آباد میں سیمینار ہوا تھا تو رہائش کا بندوبست بھی، نہ جانے اس سال ایسا کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ والدہ کی علالت کی وجہ سے میں نہیں جا سکی تھی۔ البتہ مسز راجا گئی تھیں اور ہفتوں وہاں کے بہترین انتظام کی تعریف کرتی رہی تھیں۔ میں نے سوچا ممکن ہے کہیں باہر شاپنگ کے لیے گئی ہوں اور پانچ نمبر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

اندر سے رباب نکلی تھی۔

''جی۔''

''مجھے مسز رب سے ملنا تھا۔''

''پلیز آپ اندر آ جائیں وہ تو...... وہ تو گاؤں گئی ہیں۔ ان کی دادی اماں بیمار تھیں۔ اور عینی ذرا بازار تک گئی ہے۔''

''اوہ!'' میرے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ یکایک بھاری لگنے لگا۔ میں نے اسے زمین پر رکھ دیا۔

''کیا یہاں اس ہوسٹل میں اگر دو چار روز کے لیے ٹھہرنا چاہیں تو جگہ مل جائے گی۔''

''آپ کہیں دور سے آئی ہیں؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

"ہاں کراچی سے۔"

"اوہ، آپ پلیز چلیں۔ اندر آئیں۔ کیا آپ مسز رب کی عزیز ہیں۔"

"نہیں۔" میں بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔ چھوٹا سا صحن تھا۔ اور چھوٹا سا ہی کمرا تھا۔ جس میں دو بیڈ بچھے تھے۔ سائیڈ پر ایک لوہے کی الماری تھی۔ ایک کونے میں لکڑی کی بنچ نما میز پڑی تھی۔

"آپ بیٹھیں پلیز اطمینان سے اور فکر مت کریں، مسز رب یہاں نہیں ہیں تو ہم تو ہیں۔ عینی ہے ان کی روم میٹ، وہ ابھی آ جائے گی۔ تو آپ ادھر چلی جایئے گا۔ اور مسز رب بھی شاید ایک دو روز میں آ جائیں۔ بلکہ عینی کہہ رہی تھی، امید ہے کل تک آ جائیں گی۔"

"اچھا" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"مگر عینی تو مجھے نہیں جانتی اور جانتی تو مجھے مسز رب بھی نہیں ہیں۔" میں نے اپنے متعلق تفصیل اسے بتائی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"یہاں تو ایسا ہوتا رہتا ہے۔ میری مہمان آ جائیں اور فرض کریں میں نہ ہوں تو مارتھا انہیں اٹینڈ کر لیتی ہے اس طرح میں ان کے مہمان کو۔ ہوسٹل میں تو ایسے ہی چلتا ہے۔
آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ باہر صحن میں چلی گئی۔ باہر صحن میں ہی اک طرف چھوٹا سا کچن اور چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ اور ابھی ہم چائے پی رہے تھی کہ گیلے بالوں کو تولیے سے پونچھتی ہوئی گہرے سانولے لیکن تیکھے نقوش والی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

"یہ مارتھا ہے۔" اس نے تعارف کروایا۔" میری روم میٹ ہے۔ اور میرا نام ام رباب ہے۔"

اس نے اپنا نام بتایا۔

"اور مارتھا! یہ فاطمہ ہیں کراچی سے آئی ہیں۔ مسز رب کی مہمان ہیں۔"

اور پھر چائے پیتے ہوئے ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں نرسیں ہیں۔ باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے جو اجنبیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم سے اپنائیت میں بدل گئی تھی۔ میں کچھ دیر بعد سو گئی اور جب جاگی تو وہاں

اداس آنکھوں والی ایک اور لڑکی بھی بیٹھی تھی۔

"یہ عینی ہے۔" رباب نے تعارف کروایا۔

وہ بھی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اس کا مزاج بھی بہت اچھا تھا۔ رات کا کھانا وہ کمرے میں لے آئی تھیں۔ ہم سب نے کھانا ساتھ کھایا۔ اور کھانے کے بعد عینی نے میرا بیگ اٹھا لیا۔

"چلیں۔"

"نہیں بھئی، یہ ہماری مہمان ہیں اب۔" رباب نے مجھے روک لیا۔

"فاطمہ پلیز، آپ ادھر ہی رک جائیں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ بالکل اپنی اپنی سی۔ جب مسز رب آئیں گی تو چلی جایئے گا۔"

"اچھا!" مجھے کیا اعتراض تھا، مجھے تو رہنا ہی تھا۔ کہیں بھی ٹھہر جاتی۔

"میں اور مارتھا ایک بیڈ پر سو جائیں گے۔" اس نے فیصلہ سنایا۔

"ہاں بھئی عینی! تم جاؤ۔" مارتھا نے بھی کہا۔

"ویسے بھی فاطمہ کراچی سے آئی ہیں اور کراچی کی تو ہوائیں بھی اسے محبوب ہیں اور پھر یہ تو جیتی جاگتی انسان ہیں۔"

"کیوں کیا کراچی میں رباب کا گھر ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس کے زین کا گھر ہے۔"

مارتھا نے بتایا۔

"اس کا زین، اس سے محبت کرتا تھا۔ اسے انتظار کرنے کا کہہ کر کراچی گیا اور تین سال ہو گئے پھر لوٹ کر ہی نہیں آیا اور یہ تین سال سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پاگل بھلا اسے لوٹ کر آنا ہوتا تو اب تک آ نہ گیا ہوتا۔"

"تین سال سے وہ آیا نہیں اور یہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔" مجھے حیرت ہوئی۔

"ہاں۔" مارتھا نے کہا تھا۔

"اور یہ اس کے پیچھے اپنا دین دھرم ماں باپ سب چھوڑ بیٹھی ہے۔"

"اچھا۔"

میں نے پہلی بار غور سے اس سانولی سی دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔ جو ایک شخص کے

لیے سارے رشتے ناتے توڑ بیٹھی تھی، اور وہ شخص اسے انتظار کرنے کی سولی پر لٹکا کر چلا گیا تھا اور مجھے وہ بہت اچھی لگی، بہادر اور بلند، یکایک میرے دل میں اس کے لیے اپنائیت اور محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

''ادھر آ جاؤ رباب، میرے پاس اور مجھے سب بتاؤ۔''

میں نے کھسک کر اپنے بستر پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں۔'' وہ ذرا سا شرمائی تو مجھے اور بھی اچھی لگی۔

محبت میرے لیے ہمیشہ ایک بیکار فضول اور غیر اہم سے رہی تھی، لیکن پچھلے ایک سال سے جب سے عثمان علی نے مجھے بغیر دیکھے رد کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ کسی اور سے محبت کرتا تھا۔ تب سے ہاں میں ہر اس لڑکی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ جس سے کسی نے محبت کی ہو۔ جو کسی سے محبت کرتی ہو۔ اور خود میرے دل کی زمین پر یکایک ہی راتوں رات خواہشوں کے لمبے لمبے پودے اگ آئے تھے۔ بانس کے پودوں کی طرح۔

کوئی ہو جو مجھے چاہے۔ مجھ سے محبت کرے، اور میں بھی فخر سے کہہ سکوں کہ میں بھی اس کی اہل ہوں کہ کوئی مجھ سے محبت کرے، مجھ سے محبت کرے عثمان علی کیا ہوا جو تم کسی اور سے محبت کرتے تھے۔ لیکن میں بھی چاہے جانے کے قابل ہوں۔

اگر معاشرتی دباؤ اور خوف نہ ہوتا تو شاید میں کشکول ہاتھوں میں لے کر باہر نکل آتی اور آوازیں لگاتی پھرتی کہ کوئی ہے جو میرے اس کشکول میں بھی بھیک ڈال دے۔

دراصل عثمان علی کی اک ذرا سی بات نے میرے اندر یکایک بہت سے کمپلیکس پیدا کر دیے تھے۔ میں صورت و سیرت میں اچھی تھی۔

لوگ کہتے تھے، میں جس گھر میں جاؤں گی۔ اسے جنت بنا دوں گی جس کے نام کے ساتھ میرا نام لگے گا۔ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہوگا۔ لیکن عثمان کو شاید کسی جنت کی چاہ نہ تھی۔ اور کسی خوش قسمتی کی تلاش نہ تھی۔ وہ تو بس صرف اس لڑکی کا ساتھ چاہتا تھا جو نہ جانے کتنی حسین ہوگی اور کتنی خوبصورت، کاش میں اسے دیکھ سکتی۔

اور ایک یہ لڑکی ہے، بے حد عام سی، بے حد معمولی سی، لیکن اسے بھی کسی نے چاہا کہ اس نے ساری زنجیریں توڑ دیں۔

''تم کرسچن ہو۔''

وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

''ہوں نہیں تھی۔ اب تو میں مسلمان ہوں۔''

''ہاں۔'' میں ذرا سا شرمندہ ہوئی۔

''تمہیں اسلام کیا لگا؟''

''پتا نہیں۔ میں نے اس کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''کیا تمہیں اسلام نے اٹریکٹ کیا تھا۔''

''نہیں، میں تو زین کے لیے مسلمان ہوئی ہوں۔ کیونکہ وہ ایسا ہی چاہتا تھا۔'' اس کا خیال تھا کہ اس کی ممی ایک کرسچن لڑکی کو کبھی قبول نہیں کریں گی۔''

''اچھا وہ تمہیں اچھا لگتا تھا۔''

''ہاں، بہت اچھا وہ ہے ہی بہت اچھا، سادا، مخلص، سچا اور کھرا۔''

اور پھر رات دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔

مارتھا نے...... اپنے گھر کی باتیں بتائیں، عینی کا قصہ سنایا اور ہوسٹل میں رہنے والی دو چار اور لڑکیوں کے متعلق بتایا اور راتوں رات ہم آپ سے تم پر آ گئے۔ کبھی آدمی سالوں ملتا رہے تو بے تکلفی نہیں ہوتی۔ اور کبھی لمحوں میں سارے فاصلے طے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ دوسرے دن مسز رب آ گئی تھیں اور میں نے انہیں مس عابدی کا خط دے دیا تھا۔ اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بہت اصرار کیا تھا۔ لیکن میں نہیں گئی۔

''اب ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ مسز رب۔''

''ہاں مسز رب! ربی اور مارتھا نے بھی کہا۔

''فاطمہ اب ادھر ہی رہے گی۔ دو چار دن تو رہنا ہے۔''

اگلے دو تین روز میں مصروف رہی تھی۔ مجھے کانفرنس ہال میں لانے لے جانے کی ڈیوٹی خود بخود ربی اور مارتھا نے سنبھال لی تھی۔ اور اب کل مجھے چلے جانا تھا۔ پھر شاید کبھی ان پیاری لڑکیوں سے میری ملاقات نہ ہو۔

''مجھے آپ دونوں کا خلوص ہمیشہ یاد رہے گا۔''

میں نے رباب سے کہا جو الماری میں تمام کپڑے ترتیب سے رکھ چکی تھی۔ اور اب میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''اور تم بھی فاطمہ! تم بھی ہمیں بہت یاد آؤ گی۔''

''کاش ربی! میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی، کیا زین کا ایڈریس تمہارے پاس ہے۔''

اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر ربی کے پاس زین کا ایڈریس ہو تو میں خود جا کر اس سے ملوں گی اور اسے بتاؤں گی کہ ایک سانولی سلونی سی لڑکی اپوا ہوسٹل کے ایک اداس کمرے میں تین سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

''نہیں'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اور اس کے وہ دوست ڈاکٹر، ان سے پوچھ کر بتا دو۔''

میں ہر قیمت پر اس لڑکی کا انتظار ختم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے زین کو اس سے ملانا چاہتی تھی۔

''وہ تو زین کے جانے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر عابدین کو سعودی عرب میں جاب مل گئی تھی۔ ڈاکٹر ناصر اور ڈاکٹر خالد ہائر اسٹڈی کے لیے امریکہ چلے گئے تھے۔ پھر پتا نہیں وہ وہاں سے لوٹے یا نہیں۔''

'کیتھی۔' دروازے میں سے ایک لڑکی نے اندر جھانکا۔

''آج فارغ ہو تو ذرا میرے ساتھ بازار تک چلو گی میں نے آج چھٹی کی ہے۔ چھوٹی بہنوں کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔''

''نہیں، میری مہمان آئی ہوئی ہیں۔ اور میں کیتھی نہیں ہوں رباب ہوں۔''

''اوہ سوری یاد نہیں رہتا۔''

''اس نے کہا اور پھر مجھے سلام کر کے واپس چلی گئی۔

''ہوں یاد نہیں رہتا'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

''کیوں کیا تمہیں اپنا نام بہت پسند ہے۔''

''ہوں۔''

''کیا زین نے یہ نام رکھا تھا۔''

''نہیں، عینی نے رکھا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جو کم عمری میں مر گئی تھی۔ اس کا نام تھا۔ ام رباب اور پھر جب میں کیتھی ہوں نہیں تو کوئی مجھے اس نام سے کیوں پکارے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ربی! تین سال بہت نہیں ہوتے کیا؟ تین سال میں تو پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ پھر تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ ضرور آئے گا۔''

''تم نے کہا تھا نا ابھی کچھ دیر پہلے کہ سچ کی اپنی خوشبو ہوتی ہے تو مجھے اس کی باتوں سے سچ کی خوشبو آتی تھی۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ جب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ تب بھی اور جب مجھ سے محبت کرنے لگا تب بھی۔ اگر اس نے نہ آنا ہوتا تو وہ مجھے کہہ دیتا۔

''سوری ربی! تم میرا انتظار نہ کرنا میں نہیں آؤں گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ اس لیے میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ یقیناً ابھی اپنی ممی کو نہیں منا سکا ہو گا۔ اور یہ تو میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی ممی کو خفا نہ کرے۔ دراصل فاطمہ تم نے اسے دیکھا نہیں ہے تم اسے جانتی نہیں ہو اس لیے اس کے متعلق شک میں پڑ گئی ہو لیکن میں تو اسے جانتی ہوں مجھے تو اس کے کہے ایک ایک لفظ کا یقین ہے۔ تمہیں ساری کہانی کا پتا بھی تو نہیں ہے۔ اسے کوئی ایک دم سے ہی مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ اور نہ ہی مجھے اس سے ایک دم عشق ہو گیا تھا۔ ہم تو پورا ایک سال یونہی ملتے رہے تھے دوستوں کی طرح کبھی کبھار پھر۔''

وہ خاموش ہو کر بستر کی چادر درست کرنے لگی۔

ہاں مجھے واقعی پوری کہانی کا نہیں پتا تھا۔ میں تو صرف اتنا جانتی تھی کہ ایک لڑکا تھا زین جو ربی سے محبت کرتا تھا اور بس اس کی کوئی کوئی بات وقتاً فوقتاً رباب نے مجھے بتائی تھی اور بس۔

''تو تم مجھے پوری کہانی سناؤ ربی۔''

میں نے پرشوق آواز میں کہا۔

''پوری کہانی۔'' وہ دونوں پاؤں بیڈ پر رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔

''زین بہت عجیب سا لڑکا تھا۔ ہمدرد مخلص سچا بے باک اور شادا وہ اپنے تینوں دوستوں سے مختلف تھا۔ اس روز جب میں نے اس کے ساتھ چائے پی تھی اور وہ اپنے دوستوں سے شرط جیت گیا تھا۔ تو اس بات پر وہ میرا بہت ممنون تھا۔ اور اب اکثر ادھر ادھر گزرتے ہوئے سامنا ہوتا تو وہ مسکرا کر مجھے دیکھتا۔ اور نہایت خلوص سے حال پوچھتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک روز وہ بیمار ہو گیا۔ اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ہاسپٹل میں ہی ایڈمٹ

تھا۔ اور میری ڈیوٹی اس کے کمرے میں تھی۔ میں ڈیوٹی ٹائم کے بعد بھی اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اکیلا تھا۔ اس کے سب گھر والے کراچی میں رہتے تھے اور اس نے ان کو اطلاع بھی نہ دی تھی۔

''ڈاکٹر! آپ اپنے گھر اطلاع کیوں نہیں کرتے۔''

اس روز اس کا بخار بہت تیز تھا۔ میں اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔

''گھر۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔

''میرا اپنا تو کوئی گھر نہیں ہے۔ بس ایک ممی ہیں۔ جو ماموں کے گھر رہتی ہیں۔''

''تو ممی کو ہی بلالیں۔''

''ممی کو نہیں۔''

آپ کے ڈیڈی۔''

میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ وفات پا چکے ہیں۔ جب وہ صرف چھ سال کا تھا۔ تب سے ان دنوں وہ بالکل کسی بچے کی طرح ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو بیٹھے بیٹھے رونے لگتا تھا۔ ان دنوں اس نے مجھ سے بہت باتیں کیں۔

اپنے دکھ۔

اور اپنے غم اس نے مجھے بتائے۔

اپنی تنہائیوں کا ذکر کیا۔ اسے اپنی ممی سے بہت شکوے تھے۔

''ممی کو کبھی میرے لیے فرصت ہی نہیں ملی۔ وہ سارا وقت ماموں اور خالہ کے بچوں میں گھری رہتی تھیں۔ وہ اکثر بتایا کرتا تھا۔

''انہیں جتنی محبت خالہ کی بیٹیوں سے تھی۔ اتنی محبت انہوں نے مجھ سے کبھی نہیں کی۔ حالانکہ وہ سب کی سب...... مجھ سے بڑی تھیں۔ لیکن وہ میری خالہ کی چھوٹی بیٹی بھی جو مجھ سے چار سال بڑی تھی ممی اس کو بھی گود میں لیے پھرتیں اس کے لاڈ اٹھاتیں۔ لیکن میرے تو وہ آنسو بھی نہ پونچھتی تھیں۔ اور میرے مماموں کے بیٹے وہ ضد کرتے تو میرے کھلونے میرے ڈیڈی کے لائے ہوئے کھلونے بھی انہیں دے دیتیں۔ ان کی ذرا سی جھوٹی شکایت پر بھی مجھے دھنک کر رکھ دیتیں۔

ان کے سر میں درد ہوتا تو تڑپ اٹھتیں میں بخار میں پھنکتا رہتا تو انہیں پروا تک نہ ہوتی۔'' اور ایسے میں وہ اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بتایا کرتا تھا۔ اور جب وہ صحت یاب ہوا تو تب تک ہم دونوں میں بہت دوستی ہو چکی تھی۔ خود بخود ہی میرے دل میں اس کے لیے ایک جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ خلوص و محبت کا جذبہ اور یہ جذبہ کوئی ایسا جذبہ نہیں تھا کہ میرے دل میں اس کی رفاقت کی خواہش پیدا ہوتی۔ یہ محض دوستی کا جذبہ تھا۔

''چلو کیتھی ہم دونوں دوست بن جائیں۔''

ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔

''دوست تو ہم ہیں۔''

''ہاں واقعی دوست تو ہم ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''میں نے اپنے دل کی باتیں صرف تم سے کی ہیں۔ کیتھی۔'' صرف تم سے۔ عابدین سے بھی کبھی نہیں کی۔ حالانکہ وہ میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ لیکن پتا نہیں شاید میں بیماری کی وجہ سے بہت رقیق القلب ہو رہا تھا۔ اور تمہارے علاوہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں اس سے اس طرح بات کرتا لیکن شاید کوئی اور تمہاری طرح اتنی توجہ محبت اور خلوص سے میری بات نہ سنتا۔ تم بہت اچھی ہو کیتھی تم نے میرا درد بٹایا۔ اور بس اسی بات پر ہماری دوستی پکی۔ ہاتھ آگے کرو۔''

اور میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''تھینک یو کیتھی آج کی تاریخ یاد رکھنا۔''

''کیوں؟''

''بس اس تاریخ کو ہم اپنی دوستی کی سالگرہ منایا کریں گے اور وہاں اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ایک کپ چائے پیا کریں گے۔ یاد ہے نا ہماری پہلی ملاقات چائے کے ایک کپ کے لیے وہیں ہوئی تھی۔''

اور پھر کچھ دنوں بعد اس کا ہاؤس جاب ختم ہو گیا۔ اور اسے کسی دوسرے شہر میں نوکری مل گئی۔ مگر کبھی کبھی پندرہ بیس دن بعد وہ لاہور آتا تو مجھ سے ملنے ضرور آتا۔''

میں بہت انہماک سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ ایکا یک خاموش ہو گئی تو میں بھی اپنے انہماک سے چونکی۔ وہ یوں سامنے دیکھ رہی تھی جیسے بیتے دنوں کو

دیکھ رہی ہو۔

"پھر کیا ہوا ربی۔"

میں نے ہولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پھر۔" وہ چونکی۔

"پھر فاطمہ! پتا نہیں کب پتا نہیں کیسے اسے مجھ سے محبت ہوگئی۔ میں جو اس کی ہم مذہب بھی نہیں تھی۔ میں جو ایک بہت معمولی شکل وصورت کی ایک نرس تھی۔ فاطمہ تمہیں بھی یقین نہیں آیا تھا مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا۔ کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ میں کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"زین! اس طرح کا مذاق مت کرو۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"میں نے بہت سوچا ہے، بہت غور کیا ہے تو جانا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے زین میں ایک کرسچن لڑکی ہوں۔ میرے پاپا فادر ہیں وہ مجھے تم سے دوستی کی اجازت تو دے سکتے ہیں۔ لیکن محبت کی نہیں۔"

"مجھے سب پتا ہے۔ اور میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔"

"میں تو، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

جانے کیسے بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"مجھے پتا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"فرق صرف یہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کی تو تمہیں بتا دیا۔ اور تم دل میں چھپائے ہوئے تھیں۔"

میں اپنی بے اختیاری پر شرمندہ سی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"محبت کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ تم اتنی شرمندہ کیوں ہو رہی ہو۔ بس ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں تم سے کوئی وعدے نہیں کر رہا ساتھ نبھانے کے ساتھ دینے کے۔ اس لیے کہ مجھے پتا ہے میری شادی کہیں اور کسی اور لڑکی سے ہوگی۔ اپنی ہم مذہب لڑکی سے جہاں ممی

چاہیں گی۔ لیکن میں محبت تو تم سے کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔ بس تم سے شادی نہیں کر سکتا چاہو تو میں تم سے نہ ملوں۔"

لیکن فاطمہ، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لاہور آتا اور مجھ سے نہ ملتا یا میں اسے ملنے سے منع کر دیتی۔ اس نے میرے ساتھ کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کوئی فریب نہیں دیا تھا مجھے۔ بلکہ بڑی صاف دلی سے بتا دیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اس کی معاشرتی مجبوری ہے شادی کے لیے بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ خاندان، مذہب، اسٹیٹس اور بہت کچھ جب کہ محبت کچھ نہیں دیکھتی۔ یہ کم بخت خود بخود دل میں پیدا ہوگئی ہے تو میں کیا کروں۔

وہ جب اس طرح کی باتیں کرتا تو بہت معصوم لگتا تھا۔ اور وہ صحیح کہتا تھا فاطمہ شادی تو میں بھی اس سے نہیں کر سکتی تھی، خاندان برادری گھر سب کو چھوڑنا ناممکن تھا۔

لیکن یہ محبت ہاں محبت خود بخود ہی تو دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ میں ہر وقت اسے سوچتی رہتی تھی۔ اس کی باتیں یاد کرتی رہتی تھی۔ ایک بار وہ پورے تین مہینے تک نہیں آیا تو میں نے سوچا شاید وہ مجھے بھول گیا ہے۔ آخر میرا اس کا ناتا مشکل سے ہی نبھ سکتا تھا۔"

"شاید وہ کراچی چلا گیا ہوگا۔" میں نے رائے دی۔

"نہیں۔" وہ جو سوچوں میں کھوئی گئی تھی۔ چونک کر بولی۔

"میں نے بھی سوچا تھا کہ وہ کراچی چلا گیا ہے۔ اور شاید اس کی ممی نے اس کی منگنی یا شادی کر دی ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا فاطمہ ایک روز جب بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ چوکیدار اس کی چٹ لایا تو میں برستی بارش کی پروا نہ کرتے ہوئے گیٹ کی طرف بھاگی۔ وہ بھی اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اور بارش میں اسے بھگو رہی تھی۔

"کیتھی۔" وہ بے چین ہو کر میری طرف بڑھا پھر رک گیا۔

"کیتھی!" میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"اس کی آواز میں آنسو مچل رہے تھے۔

"تم کہاں تھے کہاں کھو گئے تھے۔"

میری پلکیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

"تم نے مجھے یاد کیا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے تھے۔

''تو پھر یہ طے ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

وہ ہنسا اور میرے ساتھ چلتا ہوا برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔

''پتا ہے کیتھی! میں نے سوچا تھا کہ جب میں تم سے شادی نہیں کر سکتا تو مجھے تم سے محبت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم سے نہیں ملوں گا۔ تو تمہاری محبت آپوں آپ ختم ہو جائیگی۔ ایسے ہی جیسے خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے ہی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ تین ماہ میں نے کیسے گزارے کیتھی بتا نہیں سکتا۔ خود سے لڑلڑ کر تھک گیا۔ لیکن تم تو ایسے دل میں دھرنا جما کر بیٹھی ہو کہ نکلتی ہی نہیں ہو۔''

میں یونہی روئے چلی جا رہی تھی۔

''ارے پگلی! روتی کیوں ہو۔''

اس نے انگلی کی پوروں سے میرے آنسو پونچھے۔

''تم نے سوچا ہوگا بڑا بے وفا دوست تھا۔ لیکن میں بے وفا نہیں تھا۔ کیتھی میں تو ہر روز تمہاری محبت کو جڑ سے نکال کر باہر پھینک دیتا۔ اور سوچتا کہ اب کل تم سے ملنے جاؤں گا یوں کہ میرے دل میں تمہاری محبت کا کوئی چور نہیں ہوگا۔ ہم دوستوں کی طرح ملیں گے، چائے پیئں گے، ہنسیں گے، قہقہے لگائیں گے اور پھر آدھے لاہور کی سیر کریں گے۔ اور پھر تمہیں تمہارے ہوسٹل ڈراپ کر کے خوش خوش واپس جاؤں گا۔ لیکن ظالم لڑکی ہر روز جب میں تمہاری طرف آنے کا قصد کرتا تو دیکھتا کہ وہ محبت جسے میں نے اپنے خیال میں جڑ سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ وہ تو اسی طرح لہلہا رہی ہے۔ پہلے سے زیادہ تناور زیادہ مضبوط، سو میں ہار گیا۔ اور چلا آیا۔

''آؤ کیتھی! ہم شادی کر لیں۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''لیکن میرے پاپا کبھی نہیں مانیں گے۔''

میں نے مایوسی سے کہا۔

''اور میری ممی بھی۔''

اس کے ہونٹ لٹک گئے۔

''آؤ کیتھی! ہم کہیں دور چلے جائیں جہاں یہ پاپا اور ممی نہ ہوں۔''

''تم اداس ہو چلو تمہیں گھما لاؤں۔''

اور پھر اس روز ہم دیر تک ڈرائیورنگ کرتے رہے۔

''کیتھی! کیا تم میری خاطر اپنا مذہب چھوڑ سکتی ہو؟''

اس نے پوچھا اور میں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور ہاں کہہ دیا۔ اس لیے کہ ان تین ماہ میں اس کی جدائی میں جو اذیت میں نے اٹھائی تھی۔ اتنی جدائی تو میں نے کبھی ممی پاپا کی بھی محسوس نہیں کی تھی۔

''تھینک یو۔'' وہ خوش ہو گیا۔

''اور اس روز اس نے مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے بتایا وہ دو ایک روز تک کراچی جا رہا ہے۔ اور یہ کہ وہ ممی کو اس دفعہ میرے متعلق بتائے گا۔''

''تو پھر اس کی ممی نے انکار کر دیا ہوگا۔''

وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''دوبارہ جب وہ آیا تو وہ بہت پریشان اور اداس تھا۔

''کیتھی۔''

''نہیں رباب۔''

''اوہ کیتھی۔'' وہ ایک دم بہت خوش ہو گیا۔

''تم!''

''ہاں میں مسلمان ہو گئی ہوں۔ اور عینی نے میرا نام ام رباب رکھا ہے۔''

''آؤ تو پھر اسی خوشی میں باہر کہیں لنچ کرتے ہیں۔''

''مگر ابھی جب تم آئے تھے تو تم بہت پریشان لگ رہے تھے زین کیا ممی۔''

''ہاں کیتھی، سوری ربی، ممی کسی طرح نہیں مانتیں۔ وہ کہتی ہیں اس طرح وہ اپنے خاندان میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ ان کی بھابیاں اور بھائی سب ان کا تمسخر اڑائیں گے۔ ان کے بیٹے نے ایک کرسچن نرس سے۔''

وہ پھر اداس ہو گیا تھا۔

''میں نے انہیں قائل کرنے کی ہر طرح کوشش کی لیکن وہ تو میری کوئی بات نہیں

سنتیں۔ خودکشی کی دھمکی دیتی ہیں۔ اپنے احسانات کا ذکر کرتی ہیں کہ میری خاطر انہوں نے شادی نہیں کی۔ مجھے پڑھایا لکھایا۔"

"ہاں زین۔"

میں بھی اداس ہوگئی۔

"تمہاری ممی صحیح کہتی ہیں۔ انہوں نے ایک تمہاری آس پر تو۔"

"وہ میرے لیے نہیں تھکیں۔ وہ تو بس اپنی بھانجیوں اور بھتیجے بھتیجیوں کے لیے تھکتی رہی ہیں۔"

"کیا پتا زین۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"وہ یہ سب تمہاری ہی خاطر کرتی ہوں تاکہ ایک پناہ گاہ تمہیں حاصل رہے۔ تمہاری ممانیاں تمہیں اور تمہاری ممی کو بوجھ نہ سمجھیں۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا ربی! بس میں اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور میں بہت بزدل ہوں میں اپنے ماموؤں سے اور ان کے خاندان سے مخالفت بھی مول نہیں لے سکتا۔ وہ تمہیں عزت نہیں دیں گے۔ وہ تمہیں کوئی بہت حقیر شے سمجھیں گے۔ اور تمہیں ایک چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیں گے۔ اور میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

بتاؤ میں کیا کروں۔"

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ اور میرے پاس بھی اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ میں جو کرسکتی تھی وہ میں نے کردیا تھا۔ اور میری اس حرکت پر میرے پاپا اور ممی مجھ سے خفا ہوگئے تھے۔ میرے بھائی رچی نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن پاپا نے اسے سمجھایا کہ مجھے قتل کرنے سے اسے پھانسی ہوسکتی ہے۔ بس یہ ہمارے لیے مرگئی۔

"بتاؤ زین! میں اور کیا کرتی۔"

"تم بہت اچھی ہو ربی! اور تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک محبت کرنے والی لڑکی ہی کرسکتی ہے۔ اور میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکا۔

"لیکن میں، ہاں میں۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"میں ممی کو الگ گھر لے دیتا ہوں۔ اب میں...... برسرروزگار ہوں کیا ضروری ہے کہ ہم ساری زندگی دوسروں کے گھر میں گزار دیں۔ فی الحال کرائے پر پھر بعد میں اپنا بھی بن

جائے گا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جب ممی اپنے گھر میں رہیں گی تو پھر انہیں ماموں جان کا ڈر بھی نہیں ہوگا۔ انہیں میری خوشی زیادہ عزیز ہوگی۔ تو صحیح کہتی ہو۔ وہ ماموں کے بچوں کی سائیڈ اس لیے لیتی ہوں گی کہ وہ پناہ گاہ ہم سے چھن نہ جائے۔ اب تو میں ہوں نا۔"

وہ ایک دم خوش نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوجاتا تھا۔ بالکل کسی بچے کی طرح معصوم اور سیدھا سادا۔ اس میں ذرا بھی فریب نہیں تھا۔ فاطمہ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی ہوئی تھی۔ چہرا بے رونق لگ رہا تھا۔ لیکن اب پھر اس کی آنکھیں دمکنے لگی تھیں اور چہرہ روشن روشن لگنے لگا تھا۔

"ممی مان جائیں گی ربی! مجھے یقین ہے۔"

مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے مجھے یقین دلایا۔

"میں غور سے اسے دیکھ رہی تھی زین کی باتیں کرتے ہوئے اس کا چہرہ کیسے چمک اٹھا تھا۔ اور کتنا حسن اتر آیا تھا۔ اس کے چہرے پر اور وہ عام سی معمولی سی شکل کی لڑکی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی لمحے میں زین کے دل میں اس کی محبت اتری ہوگی۔

"فاطمہ! تم بور ہوگئی ہو۔"

مجھے سوچتے پا کر اس نے پوچھا۔

"نہیں! بالکل نہیں، میں تو بہت اشتیاق سے سن رہی ہوں۔ اور سچ بتاؤں مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"پھر کیا ہوا زین نے اپنی ممی کو الگ گھر لے دیا۔"

"ہاں، زین نے اپنی ممی کو الگ گھر لے دیا اور اس کی خاطر اسے کراچی جانا پڑا۔ اس نے کراچی کے ہی ایک ہاسپٹل میں جاب کرلی تھی۔"

"دیکھو، یہ ضروری ہے کہ میں وہاں رہوں ممی کے پاس۔ ممی اکیلے گھر میں تو نہیں رہ سکتیں نا۔ میں آتا رہوں گا تم سے ملنے کے لیے، دو تین مہینوں بعد۔ اور پھر تمہیں حاصل کرنے کے لیے جو جنگ میں لڑ رہا ہوں، یہ جدائی اسی جنگ کا ایک حصہ ہے۔" وہ چلا گیا لیکن وعدے کے مطابق چکر ضرور لگاتا اور ہر بار امید دلاتا تاکہ شاید ممی جان مان جائیں لیکن آخری بار جب وہ آیا تو بہت مایوس تھا۔

"ربی! ممی نہیں مانتیں کسی صورت میں نہیں۔ انہوں نے میرے لیے ایک لڑکی بھی

ڈھونڈ لی تھی۔ اور اس سے رشتے کی بات طے کر دی تھی۔ بغیر مجھے بتائے مجھ سے مشورہ کیے۔ میں نے بھی انکار کر دیا۔ ممی بہت روئیں۔ منتیں کیں ماموں غصے ہوئے۔ خالہ نے مجبور کیا۔ اس لڑکی کی اتنی تعریفیں کیں اگر تمہاری محبت میرے دل میں اتنی پاور فل نہ ہوتی تو میں بغیر دیکھے ہی اس پر عاشق ہو چکا ہوتا۔ لیکن اس کی تعریفیں سن سن کر مجھے اس سے چڑ ہو گئی تھی۔ میں نے ممی سے صاف کہہ دیا۔ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔“ اور پتا ہے ممی مجھ سے خفا ہیں، ناراض ہیں کہ انہیں شرمندگی ہوئی۔ مگر میں بھی تو ان سے خفا ہوں۔ آخر وہ میری بات کیوں نہیں مان لیتیں چلو ربی آؤ ہم کورٹ میرج کر لیں۔ میں لوٹ کر کراچی نہیں جاتا۔ بس ہم دونوں رہیں گے۔ یہاں ابھی کل ہی مجھے میرے ایک سر ملے ڈاکٹر بٹ، انہوں نے اپنا ذاتی کلینک بنایا ہے۔ اور مجھے بھی آفر کی انہوں نے جاب کی۔“

پتا ہے فاطمہ وہ ایک ہفتہ لاہور رہا اور ایک ہفتہ مسلسل مجھے کورٹ میرج کے لیے کہتا رہا۔ اس نے مارتھا اور عینی سے بھی کہا کہ مجھے سمجھائیں میں ضد نہ کروں۔ لیکن میں اس کے لیے تیار نہ ہوئی۔“

”تمہیں اس کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ ربی اس کے سوا اب اور چارا بھی کیا تھا۔“

”نہیں فاطمہ! میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ میرے ساتھ میرے اپنے ماں باپ کی دعائیں بھی نہیں تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں کی دعاؤں سے بھی محروم ہو جاؤں۔ میں ماں باپ کی جدائی کا کرب سہہ رہی تھی اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ زین کے لیے یہ مشکل ہو گا۔ اسے اپنی ممی سے ہزاروں شکوے تھے۔ لیکن وہ اپنی ممی سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ باپ کے بعد وہی تو اس کی محبت کا محور تھیں۔ میں تو بہت بعد میں ملی تھی اسے۔ میں اسے تقسیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی تو اس کی ممی مان...... جائیں گی۔ سو میں نے اسے مایوس لوٹا دیا۔

”اچھا تو پھر تم میرا انتظار کرنا۔ اب میں جبھی آؤں گا جب ممی مان جائیں گی یہ روز روز کا ملنا اور پھر جدا ہونا بہت اذیت دیتا ہے۔ بس ایک ہی بار ملیں گے اور کبھی جدا نہیں ہوں گے۔

”دیکھو، تم میرے انتظار سے تھکو گی تو نہیں۔“

”نہیں کبھی نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

”چاہے دس سال گزر جائیں۔“

”ہاں چاہے دس سال گزر جائیں۔“

”اور کیا خبر ممی کبھی بھی نہ مانیں۔“ اس نے مجھے ڈرایا۔

”ابھی بھی سوچ لو۔ میں ٹکٹ پھاڑ دیتا ہوں۔ دو چار دوستوں کو اور کسی مولوی کو پکڑ لاتا ہوں۔ اور ہم نکاح کر لیتے ہیں۔“

”نہیں زین، میں ایسے نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری ممی کو تمہاری جدائی کا دکھ نہیں دے سکتی۔ بس تم ممی کو مناؤ۔“

”اچھا جیسے تمہاری مرضی لیکن تم میرا انتظار ضرور کرنا پلیز تھک نہ جانا۔ اور مجھ سے کبھی بدگمان نہ ہونا۔ میں ایک دن ممی کو ساتھ لے کر آؤں گا۔“

وہ تھک کر چپ ہو گئی تو میں نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”مجھے یقین ہے ربی کہ تمہارا انتظار ضرور ختم ہو گا۔“

”بس تم میرے لیے دعا کرنا فاطمہ کہ میں تھکوں نہیں۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنہیں چھپانے کے لیے وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور رخ موڑ لیا اور یونہی رخ موڑے موڑے بولی۔

”فاطمہ پلیز ذرا اپنے کپڑے نکال دو، جو پہننے ہیں۔ استری کر دوں۔ مجھے اپنا یونیفارم بھی استری کرنا ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے اٹھ کر بیگ سے کپڑے نکال کر اسے دیے اور نہانے کے لیے چلی گئی۔ جب نہا کر آئی تو مارتھا بھی آ چکی تھی۔

”تمہاری خاطر جلدی آ گئی ہوں فاطمہ، اسٹاف نے بڑی مشکل سے چھٹی دی۔ تم تیار ہو تو چلو شاپنگ کے لیے۔ پھر دھوپ تیز ہو جائے گی۔ اور پھر کھانے کے بعد تمہیں لاہور کی سیر بھی کرانی ہے۔“

”اچھا۔“ میں جلدی جلدی تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دی۔ میں نے مارتھا اور ربی کے لیے بھی دو سوٹ خریدے تھے۔ کھانے سے پہلے ہم واپس آ گئے۔ رباب جا چکی تھی۔

ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ پھر مسز رب اور عینی بھی آ گئی۔ مسز رب اپنی ایک کولیگ سے ان کی گاڑی مانگ لائی تھیں۔ تا کہ مجھے تھوڑے سے وقت میں لاہور کی زیادہ سے زیادہ سیر کرائی جا سکے۔

"کاش رباب بھی ساتھ ہوتی۔"

میں نے کئی بار سوچا۔

پھر ہم شاہی مسجد، مینار پاکستان، شاہی قلعہ اور مقبرہ جہانگیر دیکھ کر تھکے ہارے ہوسٹل لوٹے تو رات ہو گئی تھی۔ رباب آ چکی تھی اور آنکھیں موندے بستر پر لیٹی تھی۔ شاید آج اس نے زین کا بہت ذکر کیا تھا۔ اور وہ اسے بہت یاد آ رہا تھا۔ اور شاید وہ تھک سی گئی تھی۔

"ربی! تم ٹھیک تو ہو نا۔"

میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"تم نے انجوائے کیا۔"

"ہوں۔"

"کیسا لگا ہمارا لاہور۔"

"اچھا۔"

میں اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور بستر پر پڑا ہوا اس کے لیے خریدا ہوا سوٹ کا پیکٹ اسے دیا۔

"ربی! یہ میں نے تمہارے لیے لیا ہے۔"

"تم نے اتنا تکلف کیوں کیا فاطمہ۔"

"یہ تکلف نہیں ہے۔ ربی! یہ ان محبتوں کے شکریے کے اظہار کے طور پر ہے، جو تم لوگوں نے مجھے دیں۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ تم کبھی کراچی آؤ تو میرے پاس ضرور آنا۔ بلکہ جب زین آ جائے گا تو تم زین کے ساتھ ضرور میرے پاس آنا۔ میں بھی تو تمارے زین کو دیکھوں گی۔"

"ارے ربی! تم نے فاطمہ کو زین کی تصویر نہیں دکھائی۔"

مارتھا نے اپنے سوٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے اچانک پوچھا۔

"تمہارے پاس زین کی تصویر ہے۔"

میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔

"تو پھر تم نے مجھے دکھائی کیوں نہیں۔ جلدی کرو دکھاؤ۔ میں تمہارے زین کو دیکھنے کے بے تاب ہو رہی ہوں۔"

وہ اٹھی اور پھر اس نے اپنا اٹیچی کیس کھولا اور سب کپڑوں کے نیچے سے ایک براؤن لفافہ نکالا جیسے وہ کوئی بہت قیمتی متاع ہو۔ اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بے تابی سے اسے کھولا۔ اور ساکت سی دیکھتی رہ گئی۔

"یہ، یہ تو عثمان علی۔"

میں نے کچھ کہتے کہتے لب بھینچ لیے۔

"ہاں زین کا اصلی نام عثمان ہے۔ زین تو اس کے دوست اسے بلاتے تھے۔ دراصل زین العابدین اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ دونوں اکٹھے ساتھ ساتھ پائے جاتے تھے۔ اس لیے سب عثمان کو زین اور اس کے دوست کو عابدین بلانے لگے تھے۔ لیکن تم۔"

وہ بات کرتے کرتے چونک گئی۔

"تم جانتی ہو اسے؟"

"ہاں۔ نہیں تو بس یونہی اس کی تصویر دیکھی تھی اخبار میں ایک بار۔"

ہاں ڈاکٹر ہے نا۔ اس کی تصویر چھپی ہو گی۔ کسی سلسلے میں شاید میں نے بھی دیکھی تھی۔ کیوں مارتھا دیکھی تھی نا۔"

"ہاں شاید۔" مارتھا نے نظریں چرا لیں۔

تصویر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ اور ایسی ہی ایک تصویر ابھی تک میری میز کی دراز میں پڑی ہے۔ اور اس تصویر کو میں نے کئی بار دیکھا۔ اور یہ تصویر ایک دن ممی نے مجھے بڑی خوشی خوشی دی تھی۔

"فاطمہ اسے دیکھ لو، یہ عثمان ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ اس کی ممی نے کسی تقریب میں تمہیں دیکھا تھا۔ تب سے مجھے کہہ رہی تھیں۔ اور آج میں نے ہاں کر دی ہے۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ بہت سلجھا ہوا۔ لاہور میں ہے۔ اور آئے گا تو پھر باقاعدہ منگنی ہو جائے گی۔"

لیکن وہ آیا اور اس نے آتے ہی ہنگامہ کر دیا۔ اس کی ممی شرمندہ شرمندہ سی ہمارے گھر معذرت کرنے چلی آئیں۔ اور اس کی ایک نا نے میری ساری خود اعتمادی کو کرچی کرچی کر دیا۔ میرے اندر کی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اتھل پتھل کر دیا سب کچھ، میرے اندر احساس

کمتری کی فصلیں اگ آئیں۔ راہ چلتے کسی سیدھی سادھی دیہاتن کو بھی اپنے دیہاتی شوہر کے ساتھ خوش خوش اور مطمئن جاتے دیکھ کر میں ایک دم خوفزدہ ہو جاتی جیسے میں بالکل اکیلی ہوں۔ بے سائبان......تنہا۔

اور وہ عثمان علی اس کی محبت کا اسیر تھا۔

اس عام سی معمولی سی نرس کی محبت کا اسیر۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں اس کا اور اپنا موازانہ کرنے لگی۔ تو اس سے ہزار ہا درجے زیادہ خوبصورت تھی مگر شاید محبت۔ بس محبت ہوتی ہے۔ اور پھر اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا۔

ربی نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے تصویر لے لی۔

”کیسا لگا تمہیں زین؟“

”بہت۔ بہت اچھا۔“

میں نے آہستگی سے کہا اور پھر یکا یک مجھے کسی بات کا ادراک ہوا۔ ”ابھی ابھی تم نے کیا کہا تھا کہ تم نے بھی اس کی تصویر دیکھی تھی اخبار میں۔“

”ہاں دیکھی تھی ایک بار، بہت دن ہو گئے۔“

وہ تصویر واپس براؤن لفافے میں ڈالنے لگی۔

”کیوں اچھی تھی اس کی تصویر۔“

میں نے اسے کھوجنے کی کوشش کی۔

”یاد نہیں، بہت دن ہو گئے ہیں شاید وہ جس ہاسپٹل میں نوکری کرتا ہے وہاں کے کچھ ڈاکٹروں کی تصاویر چھپی تھیں نا تو اس کی بھی تھی شاید۔“

اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ جو میں دیکھنا چاہتی تھی۔ ہاں میں نے بھی اس کی تصویر دیکھی تھی۔ کوئی دو سال پیشتر ایک ہی ہاسپٹل کے تین ڈاکٹر کسی ڈنر سے واپس آ رہے تھے۔ کہ کوئلوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک ان کی گاڑی کچلتا چلا گیا تھا۔ اور کتنا المناک حادثہ تھا۔

”تو تم نے، تمہیں اس ہاسپٹل کا نام یاد نہیں ہے۔ ربی! میں وہاں جا کر تمہارے زین کا پتا کرتی۔“

”نہیں بھول گیا ہے۔“

اس نے لاپروائی سے کہا اور تصویر اٹیچی میں رکھنے لگی اور یوں ہی پیٹھ موڑے موڑے بولی۔

”تم پریشان نہ ہو فاطمہ! وہ خود ہی آ جائے گا۔ وہ بے وفا یا جھوٹا نہیں ہے۔ وہ اپنے کہے لفظوں کا مان رکھنے والا ہے۔ بس جس دن اس کی ممی نے اس کی بات مان لی۔ وہ اسی دن اپنی ممی کے ساتھ پہلی فلائیٹ سے آ جائے گا۔

”بس تم ان کی ممی کا دل نرم ہونے کی دعا کرنا۔“

میں نے مارتھا کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہیں چرائے میز پوش کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم اٹھ کر باہر چلی گئی اور جاتے جاتے کہہ گئی۔“

”چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے بہت تھک گئے ہیں۔ تم پیو گی فاطمہ اور ربی تم بھی۔“

”ہاں۔“

وہ اٹیچی کیس بند کر کے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کیا اسے پتا ہے کہ اس کا زین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کیا اس نے اخبار میں وہ خبر پڑھی تھی اور اگر پتا ہے تو پھر یہ انتظار کیوں کر رہی ہے۔ کس کے آ جانے کا۔“

میں متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔ کیا اسے پتا ہے اور یہ محض خود کو فریب دے رہی ہے۔

”فاطمہ میرا انتظار کبھی تو ختم ہو گا۔“ بس یہ آس مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔“

میرا دل چاہا اسے بتا دوں کہ تمہارا انتظار فضول ہے۔ اور تمہارا زین۔

”تمہیں پتا ہے ربی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دنوں ہفتوں مہینوں کسی کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

اور وہ نہیں آتا۔

وہ جس کا انتظار کیا جا رہا ہو۔

ہوں ہوتا ہو گا۔ ایسا لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔

”فاطمہ! وہ ضرور آئے گا۔“

اس نے بڑے یقین سے کہا۔

اور میں اسے بتاتے رک گئی۔

میں کیسے اس کا یقین توڑ دوں کیسے اسے بتا دوں کہ وہ نہیں آئے گا۔ جس کا وہ انتظار کر رہی ہے۔ میں انتظار کے ان جلتے دیوں کو کیسے بجھا دوں جنہیں وہ چار سال سے اپنی ہتھیلیوں پر سجائے بیٹھی ہے۔''

اور اس کی آنکھوں میں جلتی امید اور انتظار کی قندیلیں دیکھ کر مجھے یقین سا آ گیا کہ اسے کچھ علم نہیں ہے کہ اس کا زین۔

وہ دیکھنے میں ابنارمل تو نہیں لگتی تھی۔

وہ جاب کر رہی تھی۔

اس نے میرے ساتھ کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں کی تھی جو ابنارمل ہو کیا پتا کیا خبر کبھی عثمان کی تصویر یوں ہی چھپی ہو اخبار میں اپنے ہاسپٹل کے حوالے سے کیا پتا۔ لیکن پھر مارتھا مجھ سے نظریں چرا کر باہر کیوں چلی گئی ہے۔ میں اپنے آپ سے الجھ رہی تھی کہ اس نے ہولے سے میرے کندھے کو چھوا۔

''فاطمہ! اگر کبھی کراچی میں اتفاق سے تمہیں زین نظر آ جائے تو اسے کہنا۔ میں اس کے انتظار سے تھکی نہیں ہوں۔ اور آخری سانسوں تک اس کا انتظار کروں گی۔''

''اچھا!'' میں نے اسے کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''نہیں۔'' میں اس کا انتظار ختم نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

''اور تم بھی میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم اپنے زین کے ساتھ میرے پاس ضرور آؤ گی کراچی اور پھر تم دونوں میرے پاس رہنا۔ بہت سارے دن۔ میری آواز بھرا گئی۔''

''شیور۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''ہم ضرور آئیں گے فاطمہ۔''

اس نے وعدہ کیا اور کھڑی ہو گئی۔

''ذرا دیکھوں تو یہ مارتھا کہاں گم ہو گئی ہے۔ کھیت میں چائے تو نہیں اگانے لگی۔''

''مارتھا کی بچی، تمہاری چائے کیا ابھی تک گل رہی ہے۔'' وہ زور سے پکارتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اور میں سوچنے لگی۔

ہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ کوئی کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ دنوں ہفتوں مہینوں اور

سالوں سے۔

لیکن وہ نہ آئے۔ وہ جس کا انتظار کیا جا رہا ہو۔

حالانکہ اسے پتا بھی ہو کہ کہیں دور کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے۔

جیسے، جیسے زین کو پتا تھا۔ کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے پتا ہے۔ پھر بھی وہ نہیں آئے گا۔

اور ربی اس کا انتظار کرتی رہے گی۔

جانے کب تک

جانے کب تک

۞............۞

اندھی گونگی بہری

"یہ کیسا احساس ہے جو بادلوں کی طرح میرے دل پر تیرتا پھرتا ہے لیکن برستا نہیں۔" ہوم ورک کی کاپی پر آڑھی ترچھی لکیریں مارتے ہوئے ٹینا علی نے سوچا۔

کیا میں اداس ہوں لیکن میرے پاس اداس ہونے کا کیا جواز ہے۔ آخر کون سی چیز ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے کیا اور لوگ بھی میری طرح بغیر کسی وجہ کے اداس ہوتے ہیں اور کوئی نامعلوم سا احساس ان کا گلا بھینچتا رہتا ہے۔ ان گھنے سیاہ بادلوں کی طرح جو برستے نہیں لیکن فضا میں گھٹن اور حبس ضرور پیدا کر دیتے ہیں یہ کیسا غیر واضح دکھ ہے جو بھاری بوجھ کی طرح میرے سینے پر دھرا ہے۔

"نہیں مجھے کوئی دکھ نہیں۔"

اس نے خود ہی اپنی بات کی تردید کی "ممی مجھے اتنا چاہتی ہیں اتنا خیال رکھتی ہیں میرا۔ انہیں ہر وقت میری ہی فکر رہتی ہے پھر یہ آسائشیں، یہ آرام، یہ سب کچھ جو میرے ارد گرد اتنی بھرپور طور پر خوش کر دینے والی چیزیں ہیں لیکن پھر بھی میں خوش نہیں ہو پاتی، خوش نہیں ہوتی آخر کیوں۔ خوشی کیا ہوتی ہے؟ آدمی کن باتوں پر خوش ہوتا ہے اور کون سی باتیں اسے اداس کر دیتی ہے یہ فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہے اس نے ایک گہری سانس لی۔

فروری کی اس آخری شام میں بڑی گھٹن اور حبس تھا۔ ٹینا نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی سامنے والے بنگلے کے لان میں بچے کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک رہے تھے۔ رات ہی برف باری ہوئی تھی۔ شاید یہ موسم کی آخری برفباری تھی۔ بچے تمتاتے ہوئے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

ان کی ہنسی کتنی سچی ہے۔ یکایک اس کا جی چاہا وہ بھی ان کے ساتھ مل کر قہقہے لگائے شور مچائے اور ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکے۔ بچوں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا ایک بھوری آنکھوں والے شریر بچے نے برف کا گولا اس کی طرف پھینکا جو اس کے ہاتھوں پر لگ کر نیچے گر پڑا وہ ہنس دی بچے بھی ہنسنے لگے تو خوشی یہ ہوتی ہے۔ اس نے کھڑکی پر مزید جھکتے ہوئے سوچا۔

ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکنے میں بارش میں نہانے میں نہا کر بیمار پڑنے میں چلچلاتی دھوپ میں گھومنے میں، درختوں پر چڑھ کر ناشپاتیاں توڑنے میں پھر گر کر چوٹ کھانے میں، کچے امرود املی کے ساتھ ملا کر کھانے میں۔ لیکن میں تو ان ساری خوشیوں سے ہمیشہ محروم رہی ہوں۔ گرمیوں میں ایرکنڈیشن کمروں میں گھس کر اور سردیوں میں ہیٹر کے گرد بیٹھ کر وقت گزارتے ہوئے وہ بھلا ان خوشیوں کا مزا کیسے چکھ سکتی تھی۔ بارش میں بھیگنے کا مزا کیا ہوتا ہے شرارت سے پھینکا ہوا برف کا گولا جب جسم سے چھوتا ہے تو روح میں کیسی ٹھنڈک اتر آتی ہے۔ اف وہ وہ کیسی فضول اور بیکار باتیں سوچا کرتی ہے۔ ممی کہتی ہیں بارش میں بھیگنے سے نمونیہ ہو جاتا ہے۔ کچے امرود کھانے سے گلا خراب ہو جاتا ہے اور۔ اور

"بی بی جی" کریم نے اندر داخل ہو کر اسے آواز دی تو وہ چونک پڑی۔

"کیا ہے؟"

"جی وہ بیگم صاحب کہہ رہی ہیں شال اوڑھ لیجئے گا ٹھنڈ ہو گئی ہے۔"

"اچھا" اس نے مری مری آواز میں کہا اور کھڑکی بند کر کے شال اوڑھ لی۔

"ممی کے پاس کون کون ہے؟"

"جی وہ مسز ملک، مسز راجہ اور بیگم حامد۔" کریم نے خوامخواہ دانت نکال کر کہا۔ وہ یونہی دانت نکالتا ہوا باہر چلا گیا۔

"یہ خود پسند اور مغرور خواتین اگر جان لیں کہ نوکر طبقہ جنہیں وہ گھٹیا اور حقیر سمجھتی ہیں تنہائی میں کس کس طرح ان کا مذاق اڑاتا ہے تو جانے ان کے دل پر کیا گزر جائے۔"

ٹینا نے سوچا اور دروازہ کھول کر باہر کوریڈور میں جھانکا اور ڈرائینگ روم سے ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں وہ دو قدم آگے بڑھ کر واپس لوٹ آئی "کیا کروں گی وہاں جا کر ہمیشہ کی طرح وہی باتیں ہوں گی۔ جیولری کی، کپڑوں کی، نئے اور پرانے فیشن کی،

سیاست کی، بزنس کی یہ عورتوں کو آج کل سیاست اور بزنس سے جانے کیوں اتنی دلچسپی ہوگئی ہے اور ان کی بیٹیاں سب کی سب ایک دم بور ٹینا کو کسی کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔ ان کے پاس خالی وقت بہت ہوتا تھا اور باتیں کرنے کو بھی بہت کچھ تھا لیکن ان کی باتیں کیا ہوتی تھیں وہی بوائے فرینڈز، افیئرز، کون سا اداکار کریز ہے، کون سے گانے ہٹ ہیں اور ٹاپ ٹین پر جا رہے ہیں ٹینا کا جی اوب گیا تھا ایک ہی انداز میں ایک سی باتیں سن سن کر۔ زندگی میں کوئی نئی بات نہیں کوئی نیا پن نہیں۔

کمرے میں ویسی ہی گھٹن اور حبس تھا۔ اس کا جی چاہا وہ ساری کھڑکیاں سارے دروازے کھول دے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے وجود سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جاتے رہیں اور وہ ناک اور منہ کے راستے اس خنک ہوا کو اپنے اندر اتارتی رہے۔

کمرے میں خاموشی اور سناٹا تھا اس نے ٹیپ آن کر دیا اور بہت دیر تک بے مقصد گانے سنتی رہی حتیٰ کہ باہر روشنیاں جل اٹھیں اور کریم اسے کھانے کے لیے بلانے آ گیا۔ ڈرائنگ روم سے ابھی تک مسز ملک کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔" تو کیا ممی نے سب کو ڈنر پر روک لیا ہے۔ اس نے سوچا اور برا سا منہ بنایا۔ تو اب کھانے کی میز پر ان سے ملاقات ہوگئی اور وہی مصنوعی باتیں۔

"ہائے مسز ٹینا کتنی ویک (Week) ہوگئی ہے۔" "کس قدر پیلی ہو رہی ہے۔" فلاں ڈاکٹر کو دکھائیں، فلاں ٹانک کھلائیں اور پھر مسز ملک اور مسز راجہ کی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش۔ مسز راجہ اگر نئے ڈائمنڈ سیٹ کی بات کریں گی تو مسز ملک انہیں شکست دینے کے لیے فوراً اپنی نئی کار کا ذکر لے کر بیٹھیں گی۔ کوئی نہ کوئی روگ پالے رکھتی ہیں۔ ہر ایک کو کسی نہ کسی بات کا جنون ہوتا ہے کسی کو خوبصورت نظر آنے کا، کسی کو دولت مند بننے کا، کسی کو کچھ، کسی کو کچھ۔

اس نے بے دلی سے شال اوڑھی اور ہلکا سا سوئیٹر پہن باہر نکل آئی۔ حالانکہ اس کا سوئیٹر پہننے یا شال اوڑھنے کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اسے پتا تھا اگر وہ یونہی چلی گئی تو ممی خواہ مخواہ الجھیں گی۔ پریشان ہوں گی اور پھر پپا کا ذکر کر کے خوشبو میں بسا ہوا رومال ناک پر رکھ کر شوں شوں کرتی جائیں گی۔ ممی پپا کے ذکر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ دراصل ممی کو پپا کا ذکر کر کے دوسروں کی ہمدردیاں بٹورنے کا جنون ہے کئی بار ٹینا کو سامنے

بٹھا کر پپا کا ذکر کر کے وہ اس رلانے کی کوشش کر چکی تھیں لیکن وہ ٹھس سی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے رونا نہیں آتا تھا۔ پپا کی تصویر دیکھ کر بھی نہیں اور ممی کی رقت بھری باتیں سن کر بھی نہیں۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"ہیلو ٹینا۔"

"ہائے بے بی۔"

سب نے اس کے گالوں کو انگلیوں سے چھوا اور خوش دلی سے اس کا حال پوچھا مسز راجہ نے حسب معمول رائے دی۔

"مسز علی آپ ٹینا کو کسی سائیکرٹسٹ کو دکھایا کریں۔ میں تو تین چار ماہ بعد ضرور بچوں کو سائیکریسٹ کے پاس لے جایا کرتی ہوں۔ پھر بھی جانے کیوں دن بدن پیلی ہوتی جا رہی ہے۔"

ان کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں بے بسی سی چھا گئی۔

جب اس کے پاپا زندہ تھے تب سے ڈاکٹر خان ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔"

ان کی آواز رندھ گئی اور وہ چارلی میں بسے ہوئے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ٹینا نے برا سا منہ بنایا اور پلیٹ پر جھک گئی۔

"ہائے مسز علی آپ نے میرا وہ گارنٹ کا نیا سیٹ دیکھا جو میرے میاں ہانگ کانگ سے لائے ہیں۔" مسز راجہ کو اچانک یاد آیا اور اس کے شکر کیا کہ وہ اب موضوع سخن نہیں رہی مسز راجہ کے سیٹ کے ذکر سے مسز ملک کو اپنی نئی سپورٹس کار کا خیال آ گیا جو ان کے میاں نے ان کی سالگرہ پر انہیں گفٹ دی تھی اور یوں گفتگو فرینڈز اور سپورٹس کاروں اور ہیرے کے سیٹوں کی طرف مڑ گئی کافی دیر بعد مسز حامد نے موضوع بدلا۔

"آپ تو ڈائیٹنگ کرتی ہوں گی مسز علی۔"

"اوہ نو" وہ صاف مکر گئیں۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ڈائیٹنگ چارٹ کے مطابق کھانا کھایا کرتی تھیں اور اپنے جسم کو سلم رکھنے کے لیے باقاعدہ ورزش کیا کرتی تھیں اور مشہور بیوٹی سپیشلسٹ سے مشورہ لینے اور چہرے کا فیشل کروانے کے لیے ہر سال یورپ کا ٹرپ لگاتی تھیں۔

''اس کے باوجود میری کمر کا ماپ آج بھی وہی ہے جو آج سے دس سال پہلے تھا۔ حالانکہ خوب ٹھونس ٹھونس کر کھاتی ہوں۔'' انہوں نے فخر سے کہا۔

''رئیلی۔'' سب نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''اللہ کی دین ہے سب۔'' انہوں نے انکسار سے کہا۔

''یہ عورتیں آخر اتنا بنتی کیوں ہیں۔ خوبصورت نظر آنے کے لیے ہزاروں جتن کریں گی لیکن شو کریں گی جسے سب کچھ خدائی عطیہ ہو۔ ممی اسے سچ بولنے کی تلقین کرتی ہیں اور خود اتنی صفائی سے جھوٹ بولتی ہیں کہ ٹینا بیزار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کھا چکی ٹینا۔'' انہوں نے پوچھا۔

''جی۔'' تب انہوں نے تشویش سے اس کی پیشانی کو چھوا اور نبض ٹٹولی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے چاند۔''

''ٹھیک ہے ممی بالکل ٹھیک۔'' ان کے چہرے اور ان کی آنکھوں میں ڈوبتے ابھرتے اضطراب کے سایوں کو دیکھ کر اس نے خوش دلی سے کہا۔

''اچھا کھڑکیاں بند کر لینا اور کمبل اچھی طرح اوڑھ لینا رات کو خاصی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اگر زیادہ سردی ہو تو ہیٹر لگا لینا۔''

انہوں نے اس کے رخساروں کو چوما اور مسکرائیں۔

''گڈ نائٹ سویٹ ڈریمز۔''

''گڈ نائٹ مما۔''

اس نے آہستگی سے کہا واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں ویسی ہی گھٹن تھی۔ اس نے شال اور سویٹر اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ ''تو ایک دن اور گزر گیا پچھلے تمام دنوں کی طرح عام سا دن، کوئی خاص بات نہیں ہوئی کچھ نہیں ہوا وہی پرانے گھسے پٹے انداز میں دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ملک ٹوٹ رہے ہیں، حکومتیں بدل رہی ہیں، لیکن اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، کوئی انقلاب نہیں آتا۔ وہی سکول، وہی گھر، وہی ممی کا یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو، یہ کھاؤ، وہ کھاؤ۔ یہاں مت جاؤ۔ کاش زلزلہ ہی آ جائے کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، رات گزر جائے گی، پھر صبح ہو گی، وہی پرانی صبح، وہی سکول، وہی سسٹرز کی باتیں، بورڈرز اور ڈے سکالرز لڑکوں اور لڑکیوں کے مقابلے

میں سسٹرز میری کے بور لیکچرز، پی۔ ٹی ماسٹر افلاطون کی گنجلک اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں۔ (بے چارہ افلاطون ساری دنیا کے غم میں مرا جاتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ساری دنیا کو ہتھیلیوں پر سنبھالے ہو۔ بورڈرز نے اسے افلاطون کا نام بھیج ہی دیا تھا۔ سسٹرز میری کی غیر موجودگی میں بینچوں پر چڑھ کر شرارتیں کرنا اور نقلیں اتارنا اور پھر ہمیشہ کی طرح چھٹی کی گھنٹی بج جائے گی۔ اس کا چہرہ مرجھا جائے گا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ جائے گی اور اسے لگے گا جیسے اس کا اندر جلتا زندگی کا شعلہ بجھ گیا ہو۔ ایک انجانا سا خوف، ایک لرزا سا اس کے اندر طاری ہو جائے گا اور جب کتابیں ہاتھ میں لیے وہ دعائیہ ہال میں سے گزرے گی تو دیوار میں نصب فریم کے مجسمے کے پاس ہمیشہ کی طرح ضرور رکے گی اور سوچے گی'' کاش وہ دیوار میں نصب فریم کا بت ہوتی'' اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ فریم کے بت کی طرح کہیں نصب ہو جائے اور پھر فریم کے بت کو دیکھتے دیکھتے اسے یوں لگے گا جیسے شعاعیں سی اس کی طرف لپک رہی ہوں اور اس کی روح مجسمے میں منتقل ہو رہی ہو۔ ایک الوہی سی خوشی اس کے گرد رقص کرنے لگے گی لیکن عین اسی لمحے اس کی نگاہیں کھلی کھڑکی سے باہر پائن کے جھنڈے کے پاس کھڑی ممی کی گاڑی کی طرف اٹھ جائیں گی اور اس کی آنکھوں میں رقص کرتی خوشی ایک دم مر جائے گی اور وہ بجھے بجھے دل سے مرے مرے قدموں کے ساتھ سر جھکائے باہر آ جائے گی۔ ممی حسب معمول بے چینی سے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیں گی۔ اس کی پیشانی کو اور اس کے چہرے کو چومیں گی اور اضطراب سے پوچھیں۔

''تم ٹھیک تو ہو بے بی۔''

''تمہاری طبیعت کو ٹھیک ہے۔''

''دیر کیوں لگی۔'' وہ سر جھکائے گاڑی میں بیٹھ جائے گی اور ممی تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے بار بار پوچھتی رہیں گی۔

''یو آر رائیٹ ڈرالنگ۔'' اور وہ سوچتی رہے گی فریم کے مجسمے کے متعلق جو دعائیہ ہال کی دیوار پر نصب تھا۔ افلاطون کی گنجلک اور نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کے متعلق اور پھر وہی گھر، وہی مصروفیات، ممی کی فرینڈز اور ان کی بے معنی باتیں اور دن گزر جائے گا۔ ایک اور بیکار اور بور دن جس میں کوئی کشش نہیں ہو گی، کوئی جاذبیت نہیں ہو گی، کوئی حسن نہیں ہو گا۔

باہر ایک دم شور مچا۔ اس نے بے اختیار کھڑکی کھول کر دیکھا۔ سامنے والے بنگلے

میں بچے ابھی تک لان میں تھے اور نہ جانے کس بات پر خوش ہو کر تالیاں بجا رہے تھے لیکن اب ان کی معصوم ہنسی میں مردانہ قہقہے بھی شامل تھے اور چوڑیوں کی کھنک بھی۔

"یہ بچے یہ لوگ خوش ہیں کیا انہوں نے سچی اور حقیقی خوشی کا ذائقہ چکھا ہے۔ جو اس طرح اتنا بے اختیار ہو کر ہنستے ہیں۔ شاید انہوں نے ان اندرونی خوشیوں کا راز پالیا ہے۔ جس کا ذکر افلاطون کرتا رہتا ہے لیکن یہ اندرونی خوشیاں کیا ہوتی ہیں۔ کن باتوں سے ملتی ہیں کہاں ملتی ہیں اور جن باتوں پر لوگ خوش ہوتے ہیں کیا وہ واقعی خوش ہونے والی ہوتی ہیں۔ کیا میں بھی کبھی خوش ہو سکوں گی اور ان اندرونی خوشیوں کا ذائقہ چکھ سکوں گی شاید نہیں۔" اور ایک دکھ بھرا اضمحلال، ایک شکستہ سی بے چارگی تھکن بن کر اس کے چہرے پر اتر آئی اپنے بیڈ پر آ بیٹھی۔ باہر بالکل خاموشی تھی شاید مہمان چلے گئے تھے اور ممی اپنی بیڈروم میں جا چکی تھیں۔ اس نے لائیٹ آف کر کے نائٹ بلب جلا دیا اور سونا چاہا لیکن ایک انجانا سا خوف ہمیشہ کی طرح نہ جانے دل کے کن چور دروازوں سے نکل کر اس کے ذہن کی دیواروں پر دستک دینے لگا وہ خوف زدہ سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر ممی کو بلائے اور پھر ان کے سینے سے سر ٹکا کر خوب روئے لیکن وہ ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی۔

"یہ خوف کیوں ہے میں اتنی بزدل کیوں ہوں اس بند کمرے میں بھی ڈرتی ہوں حالانکہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ چوکیدار گیٹ پر ہمہ وقت بندوق ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہتا ہے شاید یہ خوف تنہائی کی پیداوار ہے۔ لیکن میں تنہا کیوں ہوں۔ ممی کی اتنی چاہت اتنی محبت کے باوجود مجھے احساس تحفظ کیوں نہیں ہوتا مجھے یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ میں ایک پناہ گاہ میں ہوں۔ اتنے ڈھیر سارے نوکر، چوکیدار، ممی ان سب کی موجودگی کے باوجود میں خوفزدہ رہتی ہوں جیسے اگر کبھی طوفان آیا، بجلیاں کوندیں، بارش ہوئی تو میں بغیر سائبان، بغیر چھت کے کھلے میدان میں رہ جاؤں گی۔ بجلیاں مجھے جلا ڈالیں گی۔ طوفان مجھے بکھیر دیں گے اور اور" اس نے خوف سے ایک جھرجھری سی لی۔

"شاید افلاطون سچ ہی کہتا ہے۔ آج کا آدمی اندر سے تنہا ہے باہر کی دوستیاں رفاقتیں، محبتیں چاہتیں اس کی تنہائی اس کے خوف کو دور نہیں کر پاتیں مگر اندر کی تنہائی، اندر کا خوف کیسے دور ہو۔ ایسی محبتیں، ایسی رفاقتیں کہاں ملیں گی جو اندر کی تنہائی کو دور کر دیں اور اندر کے خوف کو مٹا کر اسے کوئی پیارا سا، انوکھا سا دلربا سا احساس بخش دیں اور سسٹر میری کہتی

ہیں۔

"عبادت کرو، عبادت سے دل کا سارا خوف ساری تنہائی دور ہو جاتی ہے۔ اور شبنم کی پھواروں کی طرح نرم نرم ٹھنڈا ٹھنڈا سکون روح میں اتر آتا ہے۔"

دور کہیں آہٹ ہوئی شاید کسی بنگلے کی دیوار سے بلی کودی تھی لیکن وہ خوف سے اور بھی سمٹ گئی اسے لگا جیسے کمرے کی دیواریں اپنی جگہ سے کھسک رہی ہوں اور ابھی لمحوں میں اسے اپنے شکنجے میں کس لیں گی۔ شیلف پر پڑے سبز ساٹن کے جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن شریف کو عقیدت سے اٹھایا، آنکھوں سے لگایا چوما اور دوزانوں بیٹھے ہوئے دعا مانگی۔

"اے خدا" پیارے خدا ہمارے ساتھ رہ، ہمیشہ ہمارے قریب رہ۔ ہم پر اپنی برکتیں اتار اور بہشت میں ہمیں اپنی دعوت پر بلا اے خدا، اے صبح و شام کے مالک ہمیں ہر قسم کے خوف سے نجات دلا اور ہمیشہ ہمارے ساتھ رہ۔" دعا مانگ کر اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قرآن شریف کو ایک بار پھر چوما اور شیلف پر رکھ دیا۔ اور سینے پر صلیب بنائی۔

یہ ایک طرح کا کرائسس ہے نئی نسل دوراہے پر کھڑی ہے اور فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ اسے کون سا راستہ پکڑنا ہے۔ وہ ایک طرف ایک قدم اٹھاتی ہے تو اگلا قدم دوسرے راستے کی طرف اور یوں درمیان میں ہی بھٹک رہی ہے۔

"یہ افلاطون بھی عجیب باتیں کرتا ہے۔" افلاطون کی بات یاد کر کے وہ ہنسی۔ خوفزدہ سی ہنسی پھر تکیے کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ شخص اتنا اچھا نہیں ہے پھر بھی میرے دل پر میرے ذہن پر اور وجود پر چھاتا جا رہا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے لیکن لوگ تو کسی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے حتیٰ کہ وہ خدا سے بھی خوش نہیں ہوتے۔ مسز راجہ، بیگم فراز، مسز ملک کوئی بھی تو ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا لیکن پتا نہیں کیوں میں اس کے سامنے بے بس ہو جاتی ہوں۔" گملے کی گگر پر پاؤں رکھتے ہوئے ٹینا ریلنگ پر مزید جھک کر انہیں دیکھنے لگی۔

مسعود احمد ان کے نئے کرایہ دار تھے ممی ہر سال سیزن میں نچلا پورشن کرائے پر دے دیتی تھیں حالانکہ انہیں روپے پیسے کی کمی نہ تھی بس ان کا خیال تھا کہ اس طرح زندگی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ نئی باتیں جاننے اور نئے لوگوں سے ملنے کے مواقع ملتے ہیں اس سال مسعود احمد اپنی بیٹی فرحانہ کے ساتھ آئے تھے وہ پپا کے جاننے والوں میں سے تھے ان کی بیوی

عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ سرخ وسپید رنگ، فریش چہرے اور سیاہ گھنے بالوں کے ساتھ وہ کسی طور بھی ایک سولہ سالہ لڑکی کے باپ نہیں لگتے تھے۔ ٹینا پہلے ہی دن اس سے متاثر ہو گئی تھی۔

فرحانہ کے کندھے پر ہاتھ دھرے دھرے مسعود احمد نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

"تو آپ مسز علی کی صاحبزادی ہیں۔"

"جی ہاں، ٹینا علی۔" وہ مسکرائی۔

"ٹینا یہ بھلا کیا نام ہوا۔"

"ٹینا میرا نک نیم ہے، تانیہ علی نام ہے۔"

"کون سی کلاس میں ہیں۔"

"سینئر کیمبرج۔"

"اوہ تو آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"نہیں میں صحیح کہہ رہی ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔

"یقین نہیں آتا۔" مسعود احمد نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اسے دیکھا سیاہ جینز پر بے بی شرٹ پہنے فیدر کٹ بالوں کے ساتھ وہ بہت کم عمر لگ رہی تھی۔ مسعود احمد بات کرتے کرتے فرحانہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو ان سے قطعی لاپرواہ کھٹا سیب کھا رہی تھی۔

"ندیدی تانیہ کو بھی دو نا۔" فرحانہ نے فوراً ہاتھ میں پکڑا ہوا دوسرا سیب اس کی طرف بڑھا دیا۔

"لیکن یہ تو کھٹے ہیں۔"

تم کھٹے سیب نہیں کھاتیں ہائے ایمان سے اتنے مزیدار ہوتے ہیں۔" فرحانہ نے پہلی بار اس سے بات کی۔

"ممی کہتی ہیں کھٹے سیب سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔"

"تمہارا دل چاہتا ہے کھانے کو۔" مسعود احمد نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

"تو پھر کھاؤ۔"

"مگر ممی" وہ جھجکی۔

"کیا تمہارا گلا کبھی خراب ہوا ہے۔"

"کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر جب کھٹی چیزیں کھانے سے بھی خراب ہو جاتا ہے تو پھر دل بے چارے کو محروم کیوں رکھا جائے۔" مسعود احمد نے پتے کی بات کہی۔

"کھاؤ بیوقوف لڑکی" انہوں نے زبردستی سیب اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا جسے اس نے ڈرتے ہوئے پکڑ لیا۔

"کھاؤ ڈرتی کیوں ہو۔" یہ کیسا پرخلوص سا اصرار تھا کیسا اپنائیت بھرا لہجہ تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار ممی کی نصیحت کو نظر انداز کیے فرحانہ کے ساتھ لان میں بیٹھی کھٹا سیب نہایت اشتیاق سے کھاتی رہی اور ایک انجانی خوشی کا احساس اس کے اندر رقص کرتا رہا جسے وہ پہلی بار خوشی کو چھو رہی ہو اور اسے محسوس کر رہی ہو۔

یہ مسعود احمد کیسا جادوگر تھا جس نے چند ہی دن میں اس کے دل کو اور اس کے ذہن کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ وہ جو کچھ کہتا جاتا وہ آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد کرتی جاتی اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اندر کا خلا بھرتا جا رہا ہو۔ اس کی باتوں میں عجیب سا سحر تھا۔ وہ ایک دم مسحور ہو جاتی تھی ایک روز یونہی اس نے پوچھ لیا۔

"میدانوں میں تو بہت کھلی فضا ہوتی ہے اور یہاں پہاڑ پر اتنی گھٹن ہوتی ہے پھر لوگ میدانوں کی کھلی فضا کو چھوڑ کر یہاں پہاڑ پر کیوں آ جاتے ہیں۔"

"کیا تمہیں یہاں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔"

"ہاں بہت۔"

"دراصل بات یہ ہے تانیہ بی بی کہ اگر تمہارے اندر کا موسم اچھا ہے تو کیسا پہاڑ اور کیا میدان کہیں بھی گھٹن محسوس نہیں ہوتی اگر تمہارے اندر بہار ہے تو خزاں میں بھی تمہیں بہار ہی دکھائی دے گی اور اگر تمہارے اندر حبس، کا موسم ہے تو باہر کی ٹھنڈی اور خشک ہوا میں بھی تمہارا دم گھٹے گا۔" وہ ہمیشہ اس کی باتوں کے حسن میں ڈوب جاتی تھی۔ وہ ہی نہیں ممی بھی اس کی شخصیت کے طلسم میں جکڑی جا رہی تھیں وہ بڑی بے باکی سے ان کے نظریات کا مذاق اڑاتا تھا اور وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ اسے اکثر فلیپر ایمپر یلاکٹ، بوبی شرٹ، لیدر جیکٹ پہنے دیکھ کر ایک روز مسعود احمد نے پوچھا تھا۔

تانیہ آپ ہمیشہ یہی پہنتی ہیں آپ کے پاس شلوار قمیض نہیں ہے۔ دراصل ایسے

اوننگے بوننگے لباس کم عمر لڑکیوں کو اچھے لگتے ہیں تم اس لباس میں اٹھارہ سال کی لڑکی ہرگز نہیں لگتی ہو۔"

"میرے لباس کا انتخاب ممی کرتی ہیں۔"

"تمہاری ممی" وہ تمسخر سے ہنسا۔

"انہیں کم عمر نظر آنے کا کمپلیکس ہے وہ تمہاری بڑھتی ہوئی عمر سے خوفزدہ ہیں انہیں ڈر لگتا ہے کہ لوگ تمہاری عمر سے ان کی عمر کا اندازہ لگائیں گے اس لیے وہ تمہیں ننھی منی سی بچی دیکھنا چاہتی ہیں...... کیوں مسز علی کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ اور وہ جھینپ کر رہ گئی تھیں۔

"وہ کتنی سچی اور کھری باتیں کرتا ہے۔" ٹیٹا نے ریلنگ پر جھکے جھکے سوچا۔ "اس کی باتیں افلاطون کی طرح مشکل اور نہ سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں اس کی باتیں ذہن کو الجھاتی نہیں بلکہ الجھی گرہوں کو کھولدیتی ہیں اس نے کیسے ممی کو اپنی باتوں سے قائل کر کے اس کے سارے ٹانک پھنکوا دیے تھے اور سائی کیٹرسٹ کے پاس جانا بند کروا دیا تھا۔ یہی نہیں وہ ان کے ساتھ کیرم یا بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے بے ایمانی کرتا اور خوب شور مچاتا۔ کچے سیب اور امرود توڑ توڑ کر انہیں دیتا۔ برستی بارش میں انہیں آئسکریم کھلانے لے جاتا ممی نہ نہ کرتی رہ جاتیں اور وہ مزے سے بارش میں بھیگتے ہوئے نکل جاتے اسے لگتا تھا جیسے وہ ایک نئی دریافت کر رہی ہے۔ ایک انوکھی دنیا جس میں وہ نئے ذائقوں اور نئی چیزوں کو محسوس کرنا سیکھ رہی ہے اور وہ احساس جو بادلوں کی طرح اس کے دل پر تیرتا پھرتا تھا کہیں غائب ہو گیا ہے۔

فالتو وقت میں وہ اپنی الجھنوں کی گٹھڑی کھول کر بیٹھ جاتی اور اس سے ڈھیروں باتیں کرتی اپنی سسٹرز کی، دعائیہ ہال میں نصب فریم کے مجسمے کی اور افلاطون کی جو اپنے دل میں ساری دنیا کا غم بسائے بیٹھا تھا اور اس فکر میں گھلا جا رہا تھا کہ دنیا ختم ہو رہی ہے اور نئی نسل تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اور مسعود احمد بڑی محبت، بڑی ہمدردی سے بڑی توجہ سے اس کی باتیں سنتے "یہ شخص کتنا اچھا تھا مجھے لگتا ہے جیسے میں اس کے سامنے ہار رہی ہوں۔" ٹیٹا نے جھک کر گلاب کے دو نوشگفتہ پھولوں کو توڑا اور نیچے دیکھا۔ مسعود احمد آگے آگے بھاگ رہے تھے اور فرحانہ ان کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

"یہ شخص کتنا خوش ہے دراصل یہ زندگی کی ہر شے سے خوشی کشید کرنے کا فن جانتا ہے اسے پتا ہے کہ خوشی کیا ہوتی ہے اور کیسے حاصل کی جاتی ہے اور کچھ لوگ کبھی بھی خوش نہیں

رہتے۔ ممی کی طرح جب پپا زندہ تھے تب بھی وہ روتی رہتی تھیں اور اب وہ مر گئے ہیں تب بھی روتی رہتی ہیں۔" مسعود احمد نے بھاگتے بھاگتے اوپر دیکھا اور مسکرائے۔

"ہیلو ٹیٹا۔"

"ہیلو۔" وہ بھی مسکرائی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھولوں میں سے ایک ان کی طرف پھینک دیا جسے مسعود احمد نے اپنے ہاتھوں میں کیچ کرتے ہوئے چوم لیا۔

"تمہیں پتا ہے تانیہ بیگم کہ گلاب دوستی اور محبت کی علامت ہوتا ہے اور ہم نے تمہاری محبت کو قبول کر لیا ہے۔" انہوں نے فرحانہ کے بالوں کو شرارت سے کھینچتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سرشار ہو گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے اردگرد پھول ہی پھول کھل اٹھے ہوں اور بہاروں کا قافلہ اپنے تمام تر حسین رنگوں اور خوشبوؤں سمیت اس کے دل کے آنگن میں اتر آیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے اور اس نے بے خیالی میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول کی پتیاں توڑتے ہوئے سوچا۔ "مجھے لگتا ہے جیسے میری زندگی کے دھاگے تمہاری زندگی کے دھاگوں سے الجھ گئے ہیں اور اب کبھی الگ نہ ہوں گے۔ آؤ میں دل کی کتاب کا انتساب تمہارے دل کے نام معنون کر دوں۔"

"پھولوں کو توڑنا اور مسلنا اچھا نہیں ہوتا تانیہ علی" جانے کب مسعود احمد اور فرحانہ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور سوچا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو ٹوٹنے کا عمل بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اور خواہ وہ چیزوں کا ٹوٹنا پھولوں کا مسلنا یا آدمی کی ذات اور شخصیت کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں کتنی بھی خوبصورت کیوں نہ ہوں لیکن ٹوٹ کر ایک بدصورت ڈھیر بن جاتی ہیں۔ میں بھی ایک بدہیئت ڈھیر تھی بے کار بے فائدہ جسے تمہارے فنکار ہاتھوں نے ایک نئے اور خوبصورت پیکر میں تراش دیا ہے۔"

"کہاں کھو گئیں۔" فرحانہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میں سوچ رہی تھی ٹوٹنے کا عمل کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس کرب کو تو صرف ٹوٹنے والا ہی جان سکتا ہے لیکن آدمی اپنی خوشی میں چیزوں کو توڑتے اور پھولوں کو مسلتے ہوئے ان کے کرب کو محسوس نہیں کر سکتا ابھی چند لمحے پہلے میں بھی بہت خوش تھی۔" وہ جھک کر اپنے قدموں کے پاس پڑی کلیوں کے ڈھیر کو چننے لگی۔

"کبھی کبھی تم بڑی جذباتی باتیں کرتی ہو اور لگتا ہے جیسے تم اپنی عمر سے بہت بڑی ہو

اور کبھی کبھی اتنی معصومانہ جیسے تمہیں ابھی دنیا میں آئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور پھر خود ہی ہنس دیے۔

''چلو تمہیں آئسکریم کھلوا لاؤں۔''

''لیکن اس سردی میں ٹینا کا گلا پہلے ہی خراب ہے۔'' ممی نے اپنے کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''اسے کچھ نہیں ہوگا مسز علی آپ اسے اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا پابند مت کیجیے اسے اپنے طور پر جینے دیجیے اس کی اپنی بھی کچھ آرزوئیں ہیں۔ بارش میں نہانا سخت سردی میں آئس کریم کھانا، دھوپ میں گھومنا یہ بے ضرر سے خواہشیں اسے پوری کرنے دیجیے۔'' اس نے ممی کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔

''اگر آدمی کے اندر چھوٹی چھوٹی خواہشیں اکٹھی رہیں تو آخر کار آدمی اس انبار تلے دب کر رہ جاتا ہے اور اس کا حال ملبے تلے دبے اس شخص کا سا ہو جاتا ہے جو نہ ہل سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہو، بس بے زندگی گھٹتا رہے، ٹکڑے ٹکڑے ہوتا رہے۔'' ممی کو بھی زبردستی ساتھ گھسیٹ لے گئے۔ پہلے ممی نے ''کوہسار'' میں آئسکریم کھائی اور پھر ٹھیلے کے پاس کھڑے ہو کر بارہ مسالے والی چاٹ کھائی۔ انہیں تو اس طرح چاٹ کھانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں اس طرح سڑک پر کھڑے ہو کر کھانا تو بڑا آک ورڈ سا لگتا ہے۔'' مگر وہ ان کی پروا کیے بغیر ہنستے ہوئے لطیفے سناتا رہا۔ چاٹ کھاتے وہ دونوں نہایت خوش خوش اس کے بازوؤں سے لگی اونچے نیچے ڈھلوانی راستوں پر چلتی رہیں اور وہ چمکتی آنکھوں اور تمتماتے رخساروں کے ساتھ ہنستی رہی۔'' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں یونہی تمہارے ساتھ زندگی کے ڈھلوانی راستوں پر چلتی رہوں۔ جب بھی تھک کر گرنے لگوں تو تمہارے مضبوط ہاتھ مجھے تھام لیں۔'' ممی ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے ڈانتی رہیں اور وہ نہایت ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

☆☆☆

''تو نے میرے پر کاٹ دیے ہیں اور مجھے سنہرے پنجرے میں ڈال دیا ہے۔

''اے صیاد! میں تیرے پاؤں پکڑتا ہوں اور ہاتھ پھیلاتا ہوں مجھ سے میری

بصارت بھی لے لے تاکہ میں آسمان پر آزادی سے اڑنے والے پرندوں کو نہ دیکھ سکوں۔''

مجھ سے میری سماعت بھی چھین لے تاکہ میں فضاؤں کے نغمے ہواؤں کے گیت اور سمندر کا شور نہ سن سکوں۔

مجھ سے میر گویائی بھی لے لے تاکہ احتجاج نہ کر سکوں اور ہو سکے تو میرے دل اور میرے دماغ کو بھی پابہ زنجیر کر دے تاکہ میری خواہشیں مرجائیں اور میں کچھ نہ سوچ سکوں۔

ٹینا اس فرنچ نظم کا ترجمہ کر رہی تھی جو سر ریاض نے آج ہی انہیں لکھائی تھی۔ کہ حسب معمول فرحانہ سے اونچی اونچی باتیں کرتے مسعود احمد اندر آ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے تانیہ بیگم۔'' انہوں نے کاپی اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا تو شاعری ہو رہی ہے۔''

''نہیں تو۔'' وہ مسکرائی۔

''میں فرنچ سیکھ رہی ہوں ممی کا خیال ہے آج کل لینگوجز کی بڑی مانگ ہے اس لیے مجھے بھی کوئی زبان سیکھ لینی چاہیے۔ آپ کو پتا ہے آج کل سب ہی کوئی نہ کوئی زبان سیکھ رہے ہیں۔''

''اچھا'' انہوں نے قہقہہ لگایا ''تو زبان سیکھنا بھی آج کل فیشن ہے۔'' ٹینا نے نگاہیں جھکا لیں۔ مسعود احمد کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندتی رہتی تھیں۔

''تمہاری آنکھوں میں کتنا سحر ہے۔ مسعود احمد۔ تم یہاں آتے ہو تو لگتا ہے جیسے کمرے کے در و دیوار بھی بولنے لگے ہوں تمہارا میٹھا لہجہ تمہارے شیریں لفظ میری روح میں گھلنے لگتے ہیں اور پھر یہ احساس کتنا طمانیت بخش، خوش کن ہے کہ تمہارا تصور تمہارا وجود میرے اندر کے خوف کو مٹا رہا ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے اب اگر کوئی طوفان آیا، بجلیاں کوندیں، بارش ہوئی تو تمہارے مضبوط بازو مجھے ان سارے طوفانوں سے بچا لیں گے۔ تم میری پناہ گاہ ہو مسعود احمد، میری چھت ہو، میرا سائبان ہو۔''

''تم بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہو بے بی۔'' مسعود احمد نے شیلف پر پڑے ہوئے رسالے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔'' وہ ہنس پڑی جواباً وہ بھی ہنس دیے اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پیکٹ اس

کی طرف بڑھایا۔

''کل فرحی کی سالگرہ ہے میں تمہارے اور فرحی کے لیے ایک جیسی ساڑھیاں لایا ہوں۔''

''مگر میں نے تو کبھی ساڑھی نہیں باندھی۔''

''فرحی تمہیں سکھادے گی۔''

''لیکن ممی کا خیال ہے کہ مجھے ابھی دو تین سال تک ساڑھی نہیں باندھنا چاہیے۔''

''ممی کے بازو کا سہارا لے کر کب تک چلوگی سویٹ گرل اپنے پر اعتماد کرنا سیکھو۔''

ٹینا کی آنکھوں میں تارے دمکنے لگے۔ اور وہ ساڑھی کھول کر دیکھنے لگی۔ مسعود احمد رسالے کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ممی کو ان ادبی رسالوں سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن وہ دوسروں پر رعب جمانے کے لیے وہ بڑی باذوق اور ادب نواز ہیں تمام ادبی پرچے اور کتابیں بڑے شوق سے خریدا کرتی تھیں اور ڈرائینگ روم میں شیلف پر ایسے رکھتی تھیں کہ ان کے نام نمایاں نظر آئیں۔ مسعود احمد نے رسالے کی ورق گردانی کرتے بے اختیار کہا۔

''اوہ کتنی پیاری نظم ہے۔''

میرے پھول کس نے چوری کیے
میری شاخیں کاٹ گیا کوئی
میرے خواب کسی نے دیکھ لیے
میری تعبیروں سے بنا کوئی

ان کی آواز میں ایک ٹھہرتا اور سوز تھا وہ ان کے لہجے کے زیرو بم میں ڈوبتی چلی گئی۔ کاش یہ اس طرح پڑھتا رہے میں سنتی رہوں اور وقت گزرتا رہے بغیر ہمیں چھوئے بغیر ہمیں ڈسٹرب کیے۔

''میرے رنگ کسی نے بھگو ڈالے
میری خوشبو لے اڑا کوئی
میں کس سے اپنا راز کہوں
مجھے گھر کا بھیدی لوٹ گیا
دور آسماں پر رات کہیں

میرے نام کا تارا ڈوب گیا۔''

پڑھتے پڑھتے مسعود احمد اچانک رسالہ بند کر کے کھڑے ہوگئے۔

''ارے مجھے تو کیک کا آرڈر دینے جانا تھا تمہیں چلنا ہو تو فٹافٹ تیار ہو جاؤ میں اتنے میں مسز علی سے مل آؤں۔'' اور وہ دونوں خوشی سے تیار ہونے کے لیے بھاگیں اور ان کے اس طرح بھاگنے پر مسعود احمد ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

ساڑھی باندھ کر اس نے تنقیدی نظروں سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا ان چند مہینوں میں اسکے چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی۔ بجھی بجھی آنکھوں میں دھنک کے سارے رنگ اتر آئے تھے اور اس کے زرد رخساروں پر گلابیاں کھیل رہی تھیں۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرائی۔

''دنیا میں کتنا حسن اور خوبصورتی ہے جیسے وادیوں میں گھاٹیوں پر راستوں میں بچھے پھول ہنس رہے ہوں۔ میری خوش قسمتی پر کیا یہ سچ ہے کہ یہ شخص میرے اس قدر قریب آتا جا رہا ہے میری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر لپ سٹک کی ہلکی سی تہہ جمائی اور اعتراف کیا'' ہاں تم میری روح کا عرفان ہو۔ تم میرے عشق کی انتہا ہو اور میں تم سے شادی کروں گی خواہ مجھے اس کے لیے ممی سے دنیا سے اور زمانے سے ٹکرانا ہی کیوں نہ پڑے''

وہ بڑے اعتماد اور یقین سے مسکرائی اور اپنے آپ کو خوشبو میں بسا کر باہر چلی آئی اور ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر جھانکا نیچے خاموشی تھی شاید وہ اپنی بیتابی میں جلدی تیار ہوگئی تھی۔ اس نے جھک کر اپنے لیے ایک گلاب توڑا اور سیدھی ہوئی ہی تھی کہ اس کے کانوں میں وہی مانوس جانی پہچانی آواز آئی وہ چونک کر مڑی ممی کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور مسعود احمد ممی کے بالکل قریب کھڑے تھے۔

''آپ ساری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتیں مسز علی، میرا ہاتھ تھام لیجئے۔ یہ ضروری ہے ٹینا کے لیے۔ آپ کے لیے اور پھر میرے لیے فرحی کو ماں کی اور ٹینا کو باپ کی ضرورت ہے۔''

''مگر لوگ۔''

''لوگ کچھ نہیں کہتے اور پھر لوگوں سے ڈرنے والے ساری زندگی محرومیوں کا شکار .

رہتے ہیں۔ لائیے اپنا ہاتھ ادھر دیجیے میں آپ کو انگوٹھی پہنا دوں۔"

"لیکن اس عمر میں مسعود صاحب۔"

"ارے۔" مسعود احمد نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا۔

"آپ تو ٹینا سے بھی کم عمر لگتی ہیں کون کافر ہے جس کا ایمان آپ کو دیکھ کر متزلزل نہ ہونے لگے۔"

ممی واقعی بہت خوبصورت تھیں اور بہت سمارٹ ٹینا کبھی ویران آنکھوں سے ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اس کا دل ذہن اور دماغ پتھر کی چٹان کی طرح بے جان ہو رہے تھے ابھی لمحہ بھر پہلے وہ کتنی سرد تھی کیسے کیف آگیں لمحے تھے مگر وہ سارے محل جو اس نے تعمیر کیے تھے کانچ کے تھے اور کرچیاں اس کے دل میں اس کی روح میں چبھی جا رہی تھیں۔ مسعود احمد نے پھر کسی بات پر قہقہہ لگایا تو وہ چونکی۔

"نہیں۔ نہیں۔" اس نے ریلنگ کا سہارا لیا اور ہوا سے سرگوشی کی۔

"ان سے کہو اتنی زور زور سے قہقہے نہ لگائیں۔" اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں اور ذہن میں کہے ان کہے جملے گونج رہے تھے عجیب شور سا مچا تھا۔

"تم میری چھت ہو، مرا سائبان ہو، تم سے میں نے اپنی ذات کی پہچان کی ہے۔" وہ سسکی۔

"کل رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں یوں کہ دونوں ایک ہی پودے کی دو شاخیں اور میں ہمیشہ یہ خواب دیکھتا رہوں گا حتیٰ کہ ہم دونوں یک جان دو قالب ہو جائیں جیسا کہ خواب نے ہمارا مقدر کر دیا تھا۔" اسے یوں لگا جیسے وہ صدیوں سے جاگ رہی تھی اور اس نے کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ یا پھر جیسے وہ صحرا میں کھڑی تھی اور گرم ریت اڑ اڑ کر اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اس نے آنکھوں کو کھولا اور بند کیا۔

"لائیے اپنا ہاتھ ادھر دیجیے۔" مسعود احمد کہہ رہے تھے۔

"دیکھو کہیں راستے میں ہاتھ چھوڑ نہ دینا۔" ممی کی کھنکتی ہوئی ہنسی ہوا میں گھل کر اس کے کانوں میں ٹکرائی۔

میری شاخیں کاٹ گیا کوئی

میرے پھول کسی نے چوری کئے

وہ زیرِ لب بولی۔ اسے لگا جیسے چاروں طرف سے گھنے سیاہ بادل یلغار کر کے اس کے دل پر امڈ آئے ہوں۔ اندھیرے اور حبس سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایک ہاتھ ریلنگ پر دھرے دھرے اس نے بے چینی سے اپنے گلے کو مسلا۔ مسعود احمد ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے سرشار سے کھڑے تھے۔ وہ ہاتھ جسے اس نے اپنے ہاتھ میں لینے کی تمنا کی تھی۔

میں کس سے اپنا راز کہوں۔

مجھے گھر کا بھیدی لوٹ گیا۔

اسے لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک رہی ہو۔ اس نے جنگلے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

آؤ میں اپنے دل کی کتاب کا انتساب تمہارے نام معنون کر دوں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو زور سے بھینچ لیا۔

دور آسماں پر رات کہیں
میرے نام کا تارا ٹوٹ گیا

"ٹوٹنے کا عمل بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہیں نا مسعود احمد۔" وہ ہنسی مگر اس کے ہونٹ بھینچے رہے یہ ہنسی اندر سے کہیں ٹوٹ کر بکھر گئی اسے لگا جیسے راستے دھول میں اٹ گئے ہوں۔ وہ طوفان جن سے زندگی بھر ڈرتی رہی تھی ایک دم ہی پل پڑے ہوں اور بجلیاں اس کے سر پر اس کے اردگرد اس کے پیروں کے قریب کوندر رہی ہوں۔

اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ ریلنگ پر ہاتھ دھرے دھرے جھکی اور پھر جھکتی چلی گئی۔ خوف سے اس کا سارا وجود لرز رہا تھا جھکتے جھکتے وہ دوزانوں بیٹھ گئی۔

اے خدا۔ میرے پیارے خدا۔

کانوں میں گونجتے قہقہے معدوم ہو گئے۔ آوازیں مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں سامنے کا منظر دھندلا ہوتے ہوتے غائب ہو گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا لیکن اسے لگا جیسے وہ اندھی، گونگی اور بہری ہو گئی ہے۔

❁..........❁

ہمیں تو راس نہ آئیں

کہاں سے پھول بچھائیں ہم ان کی راہوں میں
یہاں تو خاک اڑانے کو گھر میں خاک نہیں

''اور وہ میرا باس!'' صبا نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے فرحین کی طرف دیکھا۔ ''توبہ، میرے تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔''

''کیوں۔'' فرحین نے بڑی آپا کی گڑیا کی پونیاں بناتے ہوئے صبا کو دیکھا۔

''اوہو بھئی تم بھی بس بے وقوف ہی ہو۔'' صبا کو...... جھنجلاہٹ ہوئی۔

''ہاں، بے وقوف تو وہ تھی۔ آخر اتنے سالوں سے صبا کی کہانیاں سن رہی تھی۔ اب تک کم از کم اسے جان لینا چاہیے تھا کہ کوئی کسی کے پیچھے کب پڑتا ہے اور کیوں پڑتا ہے۔''

''تو تمہارے باس۔'' اس نے گڑیا کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی موصوف میرے عشق میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ بہانے بہانے بلاتے ہیں آفس میں اور کبھی کہتے ہیں تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ تمہیں سوچتا رہتا ہوں۔''

''اور تم...... کیا تم بھی ان سے محبت کرنے لگی ہو؟''

''میں۔'' صبا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ میرا دماغ خراب ہوا ہے بھئی۔ وہ شادی شدہ آدمی ہیں۔ چار بچوں کے باپ ہیں اور ان کا بڑا بیٹا ایم ایس سی کر چکا ہے۔''

''تو پھر انہیں کیا ضرورت تھی محبت کرنے کی۔''

''پتا نہیں۔'' صبا نے معصومیت سے کہا'' کہتے ہیں کہ بس محبت ہو گئی ہے اور وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''اچھا۔'' وہ حیران حیران آنکھوں سے صبا کو دیکھنے لگی۔

کیا تھا صبا میں عام سی شکل وصورت کی معمولی سی لڑکی بلکہ عام سے بھی قدرے کم موٹے موٹے نقش سانولی رنگت اور جسم بھی قدرے فربہی کی طرح مائل قد بھی پانچ فٹ سے کم تھا پھر بھی پتا نہیں ایسی کیا خاص بات تھی اس میں کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اس کی محبت میں مبتلا رہتا تھا۔ جب اسکول میں تھی تب اس کے کتنے ہی کزن اس کی محبت میں مبتلا تھے اور جب یونیورسٹی میں تھی تب بھی وہ پروفیسر ضرغام اور سائکالوجی ڈپارٹمنٹ کا عبدالمنان اور جانے کون کون تھے اور اب جاب کرنے لگی تھی تو یہ اس کے باس حالانکہ شادی شدہ تھے۔ مگر اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''ارے بھئی ایسے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟'' صبا نے پوچھا تو وہ جھینپ گئی۔

''یونہی کچھ سوچ رہی تھی۔''

''اچھا بابا تم ذرا سوچو اور ہم چلے۔''

اور صبا کو خدا حافظ کہہ کر جب وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو بالکل غیر ارادی طور پر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ بے تحاشا خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں بلا کی کشش تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ گندمی رنگ، چھوٹے چھوٹے تراشیدہ ہونٹ بائیں رخسار میں پڑنے والا ڈمپل اور ذرا اوپر رخسار کے بالکل درمیان ننھا سا سیاہ تل۔ ایک لمحے کے لیے تو نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہر سی جاتی تھیں۔ اس نے ہمیشہ لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے تحسین دیکھی تھی۔ اس کا جسم بھی تو بہت خوبصورت تھا۔ لانبا قد اور بے انتہا گھنے بال۔ مگر پھر بھی کتنی عجیب بات تھی کہ آج تک کبھی کوئی اس پر اس طرح فدا نہیں ہوا تھا کہ جس طرح صبا پر لوگ فدا ہوتے تھے اور نہ اسے دیکھ کر کسی کے دل میں اس کی محبت جاگی تھی۔

صبا کا گھر اس کے گھر کے نزدیک تھا وہ لوگ ملتان کے کسی گاؤں سے آئے تھے اور صبا کے خاندان میں صبا پہلی لڑکی تھی جو تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اس لیے صبا اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے عمر میں کافی بڑی تھی۔ کیونکہ وہ ذرا بڑی عمر میں اس وقت آ کر داخل ہوئی تھی جب وہ شہر میں آئے تھے۔ شروع میں فرحین اور وہ ایک ہی جماعت میں تھیں اور چونکہ صبا کا گھر بھی

اس کے گھر کے نزدیک تھا اس لیے دونوں میں دوستی ہوگئی تھی بعد میں جب صبا نے ایک سال میں دو جماعتیں پاس کیں اور چھٹی سے آٹھویں میں آگئی تب بھی ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اور ان دنوں جب فرحین دسویں میں تھی تو صبا نے اسے بتایا۔

''فرحی، یار وہ میرا ایک کزن ہے نا ملک امتیاز حیدر تو وہ مجھ پر فدا ہوگیا ہے۔''

''اچھا۔'' چودہ پندرہ سالہ فرحین کے لیے یہ بڑی تھرل پیدا کرنے والی بات تھی۔ وہ کئی دن تک حیران ہوتی رہی کہ بھلا وہ ملک امتیاز حیدر جو اتنا لمبا چوڑا اونچا اور خوبصورت سا ہے وہ بھلا صبا جیسی لڑکی سے کیسے محبت کرسکتا ہے اور یہی بات جب اس نے صبا سے کہی تھی تو وہ ہنس دی تھی۔

''اری پاگل، محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔ اور وہ ہو جاتی ہے۔ کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔''

اور اس کے بعد صبا نے اسے کتنے ہی چچا زاد بھائی خالہ زاد، ماموں زاد بھائیوں کے متعلق بتایا تھا جو اس کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے جن میں سے ایک دو تو شادی شدہ بھی تھے اور جب اس نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا تو صبا نے بے پروائی سے کہا تھا۔

''بھئی، ہمارے ہاں تو مردوں کا دو یا تین شادیاں کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ میرے ابا نے دو شادیاں کیں۔ چچا نے تین، چھوٹے چچا نے دو۔''

ان دنوں صبا کی باتیں سن سن کر فرحین ایک دم ہی احساس کمتری کا شکار ہوگئی تھی۔ اور گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو تکا کرتی تھی اور سوچتی۔

''آخر اس سے کوئی محبت کیوں نہیں کرتا۔ اتنے ڈھیر سارے تو اس کے کزن ہیں اور صبا کے ٹیڑھے میڑھے خوفناک مونچھوں والے کزنوں سے ہزار ہا درجہ خوبصورت اسمارٹ اور ہینڈسم۔ اور تب ان دنوں وہ دھیان رکھنے لگی تھی کہ کب کون گھر آتا ہے۔ صبی بھائی آئے تو وہ اماں کے کہنے سے پیشتر ہی چائے بنا کر لے گئی اور دوپٹا سر پر لپیٹے ادب سے سر جھکائے اماں کے پاس بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو فرحو! پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔''

اور اس سے یہ دو رسمی سے سوال کر کے صبی بھائی اماں کی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور وہ بہت دیر بعد مایوس سی وہاں سے اٹھ آئی تھی کہ شاید صبی کے دل میں محبت کے جراثیم ہی نہیں

ہیں۔

اور صبی بھائی ہی نہیں عابد، فراز، سہیل کسی نے بھی کبھی اسے قابل توجہ جانا ہی نہیں۔ کبھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی اس کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے نہیں کیے جیسے صبا کے کزن کرتے تھے اور نہ ہی ان کے دل میں خود بخود ہی محبت کی کونپل پھوٹی تھی۔ ایک دم ڈل تھے سب ان سے تو پھر وہ صبا کے ٹیڑھے میڑھے کزن ہی ہزارہا درجہ بہتر تھے جو کم از کم محبت کرنا جانتے تھے اور ان دنوں جب وہ اپنے تمام چچا زاد، خالہ زاد ماموں زاد بھائیوں سے مایوس ہو کر اپنی پڑھائی میں گم ہو چکی تھی کہ گھر میں اچانک ہی بڑی آپا کی شادی کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ کراچی لاہور ملتان جانے کہاں کہاں سے رشتے دار ٹپک پڑے تھے اور انہی میں کراچی سے آنے والی عارفہ پھپھو اور ان کے صاحبزادے متین بھی تھے۔ متین کی طرف اس کی توجہ صبا نے ہی دلوائی تھی۔

''ہائے فرحی! تیری پھپھو کے وہ والے بیٹے کتنے زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔''

''اچھا۔''

اور صبا کی توجہ دلانے پر پہلی بار اس نے متین علی کو غور سے دیکھا۔

''ایمان سے فرحو وہ تو کوئی ہیرو لگتا ہے۔''

''ہاں متین بھائی ہی کیا۔ ان سے بڑے نعیم تو اور بھی خوبصورت ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''فرحو! ایمان سے اگر متین کو تم سے محبت ہو جائے نا تو سچی تم دونوں کی جوڑی بڑی خوبصورت ہوگی۔''

''ہاں۔''

اس نے غور کیا۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے اور اس روز جب پھپھو آئی تھیں تو متین بھائی کتنے غور سے اسے دیکھ رہے تھے اور پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے بھی تو تھے۔

اور پھر جب وہ نئے کپڑے پہنے تیار ہوئی تو متین کے سامنے سے ضرور گزری۔ مگر متین کی آنکھوں میں کوئی اس طرح کا جذبہ لو دیتا اسے دکھائی نہ دیا شاید اتنے ہنگامے میں

متین بھائی نے اسے دھیان سے نہ دیکھا ہو۔ اور آپا کی رخصتی کے بعد جب سب تھکے ہارے رات کو یونہی قالین پر ادھر ادھر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے تو اس نے سنا، متین رضی سے کہہ رہا تھا۔

''یار میں تو کل بھی اوپر چلا گیا تھا۔ نانی اماں والے کمرے میں اور آرام سے سویا۔ یہاں نیچے تو اتنا ہنگامہ تھا کہ بھلا نیند آتی اور آج بھی۔

اور وہ چپکے سے قہوے کی پیالی وہیں رکھ کر اوپر نانی اماں کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا، متین اوپر آئے گا اور اسے سوتا دیکھے گا یونہی کچھ دیر دیکھتا رہے گا۔ سوتے میں وہ یقیناً بہت پیاری لگ رہی ہوگی۔ اور پیاری تو وہ آج لگ ہی رہی تھی۔ مہندی رنگ کے کام والے سوٹ میں کھلے بالوں کے ساتھ وہ بہت دل کش لگ رہی تھی اور اس کی سبھی سہیلیوں نے اس کی تعریف کی تھی۔ اور جب اسے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ جلدی سے سوتی بن گئی۔ اس کے بے حد لانبے بالوں نے جو ابھی تک کھلے تھے اس کے آدھے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ دروازہ کھلا۔

''لاحول ولا ارے یہاں تو پہلے ہی کوئی براجمان ہے۔'' متین کی آواز آئی۔

''کون۔'' یہ شاید رضی تھا اس کا چھوٹا بھائی۔

''فرحی لگتی ہے۔''

''تو جگا دو یہ نیچے جا کر سو جائے گی۔''

''نہیں یار سونے دو اتنے دنوں سے کام کر کے تھک گئی ہوگی۔ ہم نیچے کہیں جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

وہ دروازے سے ہی پلٹ گئے۔

فرحین نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور چھم چھم آنکھیں برس پڑیں۔ اور جانے کب یونہی روتے روتے وہ سو گئی۔

''اس کے کزن تو سب یونہی ہیں احمق اور بے وقوف ذرا جو عقل ہو ان میں۔'' اس نے خود ہی سوچ لیا۔

اور انہی دنوں صبا اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور چلی گئی اور وہ اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی۔ پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اور وہ ہمیشہ جماعت میں اول آتی تھی۔ سو وہ جلد ہی فرحین اور اس کی محبتوں کو بھول گئی تھی اور پھر چار سال بعد اس کی فرحین سے دوبارہ ملاقات

یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔

''اللہ یہ تم ہو نا فرحین! ہائے کتنی سویٹ ہو گئی ہو۔'' جب وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی اپنے ڈپارٹمنٹ کے باہر کھڑی تھی تو جانے کہاں سے صبا آ کر اس کے گلے لگ گئی۔

اور صبا کو دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں اطمینان بھرا سانس لیا۔ اتنے اجنبی چہروں میں کوئی تو اپنا دکھائی دیا تھا۔

صبا اس سے ایک سال سینیئر تھی اور پورا ایک سال جو صبا وہاں رہی تھی وہ سارا وقت صبا کیساتھ ہی رہی۔ صبا بھی ہوسٹل میں تھی کیونکہ اس کے بھائی کا ٹرانسفر واپس اپنے شہر میں ہو گیا تھا۔

''سچی فرحو وہ جو عبدالمنان ہے نا سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ کا وہ بے چارا پچھلے ایک سال سے میری محبت میں مبتلا ہے۔''

''ارے تو یہاں بھی یونیورسٹی میں بھی۔''

فرحین کو بڑی حیرت ہوئی تھی لیکن اب اس نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی صبا کی کہانیاں سن کر اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کوئی اس کی محبت میں بھی گرفتار ہو جائے بلکہ نوعمری کی خواہشات اور کوششوں کے تصور سے اسے ہنسی آتی تھی کہ وہ بھی کتنی بے وقوف اور احمق ہوا کرتی تھی۔ بھلا یوں کوشش کرنے سے کبھی کوئی کسی کی محبت میں گرفتار ہوا ہے۔ محبت تو بس ہو جاتی ہے خود بخود بقول صبا کے اور اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی بلکہ یہ تو وحی کی طرح دل میں اترتی ہے۔ نازل ہوتی ہے۔

سال بھر بعد جب وہ ایم ایس سی کی ڈگری لے کر گھر آئی تو صبا مزے سے جاب کر رہی تھی۔

''صبا! تم نے منان سے شادی نہیں کی؟''

''یار میرے گھر والے خاندان سے باہر شادی کرنا پسند نہیں کرتے۔ منان نے پروپوز کیا لیکن بابا نے انکار کر دیا۔''

''اور تم...... کیا تم نے بتایا نہیں کہ تم......؟''

''میں نے مقدور بھر کوشش کی سب کو منانے کی۔ مگر۔'' عبدالمنان وہ واحد لڑکا تھا جس کی محبت میں صبا خود بھی مبتلا ہو گئی تھی۔ ورنہ درجن بھر اس کے کزن اور دوسرے لوگ جو

اب تک اس کی محبت میں گرفتار ہوئے تھے بقول صبا نے انہیں کبھی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ بس وہ خود ہی اس کے پیچھے خوار ہوتے رہتے تھے۔

"مگر کیا؟" فرحین نے پوچھا تھا۔

"کسی نے میری بات نہیں مانی تو میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ....."

"تم..... تم کیا کرو گی؟" فرحین خوف زدہ ہو گئی۔ "ایسی ویسی کوئی حرکت مت کرنا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں خودکشی کر لوں گی۔ نہیں بھئی مجھے حرام موت نہیں مرنا۔ بس میں نے کہہ دیا ہے کہ منان نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ حالانکہ میرے ماموں زاد امتیاز ملک نے کہا ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کو اب بھی تیار ہے جب کہ وہ تین بچوں کا باپ بھی بن چکا ہے۔"

سو اب صبا مزے سے جاب کر رہی تھی۔ اور آج اپنے باس کی محبت کا قصہ لیے بیٹھی تھی۔

"اور نہ جانے صبا میں ایسی کیا بات ہے کہ لوگ۔" فرحین آئینے کے سامنے سے ہٹ آئی۔

گھر میں کئی دنوں سے اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چھوٹی بہن کی منگنی چند ماہ پہلے اس کے ماموں زاد سے ہوئی تھی۔ اور بقول اماں کے اس نے اسے پیدا ہوتے ہی مانگ لیا تھا۔ مگر باقاعدہ اعلان چند ماہ پہلے ہی ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں کیونکہ فرہاد کو باہر جانا تھا۔ اور ماموں چاہتے تھے کہ وہ بیوی کو ساتھ لے کر جائے۔

"مگر فرحی! تم بڑی ہو پہلے تمہاری ہونی چاہیے تھی۔" صبا نے کہا تھا۔

"وہ فرہاد مجھ سے چھوٹا ہے ناں اور ماموں نے بچپن سے ہی عنبرین کو....." فرحین نے وضاحت پیش کی۔

"لوگ باتیں نہیں کریں گے فرحی کہ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کی پہلے کیوں ہو رہی ہے۔" صبا نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"نہیں کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "سب کو پتا ہے

فرہاد نے باہر جانا ہے۔"

"لیکن پھر بھی فرحی۔"

صبا کے بار بار احساس دلانے پر کچھ دیر کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا لیکن پھر نکل گیا۔ وہ یوں ہی تھی۔ اپنے آپ میں گم اور مست نہ کسی سے شکوہ نہ گلا جو ملا پہن لیا اور جو پکا کھا لیا نہ کوئی ضد نہ کوئی جھگڑا۔ کسی نے چار سنا بھی دیں تو سن لیں۔ رضی اس سے چھوٹا تھا لیکن اس پر خوب رعب جھاڑتا تھا۔ اور وہ مسکرا دیتی۔ گھر میں ہوتی تو ہر ایک کی خدمت کے لیے تیار رہتی تھی۔ کتنی بھی مصروف ہوتی کوئی آواز دیتا تو دوڑتی چلی جاتی۔ بھائی، بھابھی، اماں، ابا کسی کے کام سے اس نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔

اور اس روز جب وہ صبا کے ساتھ بازار کا چکر لگا کر واپس آئی تو صبا نے اسے اس کے گیٹ کے پاس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"بھئی فرحی تم مانو یا نہ مانو آنٹی تمہارے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ فرہاد کو جلدی تھی تو کیا۔ تم دونوں کی اکٹھی شادی کر دیتے۔ آخر تمہارے پروپوزل بھی تو آئے ہوں گے نا اتنی پیاری تو ہو تم۔"

"شاید میں کسی کو بھی اچھی نہیں لگی۔" اس کے دل میں اندر کچھ ٹوٹ گیا۔

اسے یاد تھا کہ آپا کے کتنے پروپوزل آیا کرتے تھے اور عنبرین نے تو ابھی ایف اے کیا تھا اور اس کے لیے تو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کیا کمی تھی اس میں۔

"صبا کا شکریہ ادا کر کے اور اسے خدا حافظ کہہ کر جب وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر آئی تو ڈرائنگ روم سے اماں کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

"فرحین کے دل میں خیال تو ہو گا کہ چھوٹی بہن کی شادی پہلے ہو رہی ہے۔" یہ شاید خالہ جان تھیں۔

"ارے نہیں آپا۔" اماں خوش دلی سے کہہ رہی تھیں۔ "نہ گلہ نہ شکوہ۔ جو پہنا دو پہن لے گی جو کھلا دو کھا لے گی۔ اتنی نرم خو اتنی ہمدرد اور اتنی محبت کرنے والی۔ میری یہ بیٹی تو ہیرا ہے۔ مجھے اس پر بڑا مان ہے اور۔"

اس نے آگے کچھ نہیں سنا کہ اماں کیا کہہ رہی تھیں۔ اماں کو اس پر اتنا مان تھا، اتنا فخر تھا اور وہ۔ اس کے دل پر چھائے ملال کے بادل لمحوں میں چھٹ گئے اور وہ خوش خوش

عنبرین کے لیے خریدی ہوئی چیزیں لے کر اندر داخل ہو گئی۔ خالہ جان اور اماں کی محبت بھری نظریں ایک ساتھ اس کی طرف اٹھی تھیں اور وہ خوش دلی سے مسکرا دی تھی اور اس دن کے بعد سے ایک بار بھی اس کے ذہن میں اس طرح کا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔

''فرحی، اندر کمرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہو ادھر آؤ نا۔ ذرا مہمانوں کی لسٹ بنا لیں۔'' بڑی آپا نے آواز دی تو وہ اٹھ کر باہر چلی آئی لیکن اس کا ذہن ابھی تک صبا اور اس کے باس میں الجھا ہوا تھا۔

''آپا یہ صبا تو اتنی خوبصورت بھی نہیں ہیں پھر بھی اتنے سارے لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ ہم سے تو آج تک کبھی کسی نے محبت نہیں کی حالانکہ ہم صبا سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہیں۔''

''پگلی۔'' آپا ہنس دیں۔

''بتائیں نا آپا، اتنے سارے لوگوں کو صبا سے کیسے محبت ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیں نا اس کا باس بھی۔''

''بات یہ ہے فرحی کہ صبا گھومنے پھرنے والی لڑکی ہے۔ جاب کرتی ہے پریکٹیکل لائف میں ہے تو۔''

''مگر آپا جب وہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی تب بھی لڑکے اسے پسند کرتے تھے اور اس کے کزن بھی۔''

''جب وقت آئے گا تو کوئی تم سے بھی محبت کرے گا سچی اور کھری محبت۔'' بڑی آپا نے پیار سے اسے دیکھا۔ اور جن محبتوں کا ذکر صبا کرتی ہے نا تو یہ محبت نہیں ہے، محض دل لگی ہے۔''

بظاہر اس نے آپا کی بات پر سر جھکا دیا تھا لیکن کئی دنوں تک اس کے ذہن میں یہ بات رہی کہ وہ تو صبا سے زیادہ خوبصورت ہے پھر آج تک اس سے کسی نے محبت کیوں نہیں کی۔

عنبرین رخصت ہو کر چلی گئی تو اس نے اماں سے اجازت لے کر اسکول میں جاب کر لی۔

اور اس نے تو بچپن سے لے کر اب تک نہ کبھی کوئی خواہش کی تھی اور نہ ضد۔ سو

انہوں نے اسے اجازت دے دی۔

''جب تک شادی نہیں ہوتی کر لے کیا ہے۔ بچیوں کو علم ہی دے گی نا۔'' رضی کے اعتراض پر انہوں نے کہا اور یوں وہ اسکول جانے لگی۔ اور اسکول جاتے ہوئے اسے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اسکول میں سالانہ تقریب انعامات کا فنکشن آ گیا۔

''بھئی مس فرحین! اس فنکشن کی تمام تر ذمے داری آپ پر ہے۔ بہت یادگار ہو۔ آپ ینگ ہیں نئے خیالات نئی سوچ ہو گی۔ چھوٹے دو چار اچھے سے آئیٹم تیار کروا لیں۔''

''جی بہتر۔''

''فنکشن بہت کامیاب رہا تھا۔ اس کی اناؤنسمنٹ کو تو بہت ہی پسند کیا تھا اس کا دلکش لہجہ خوبصورت الفاظ اور پھر اس کا پیش کردہ پروگرام سب ہی لاجواب تھا۔ سب ہی اسکی تعریف کر رہے تھے۔

اگلے روز میڈم زبیری نے اسے آفس میں بلایا ان کے پاس ایک ڈیسنٹ سا مدبر سا شخص بیٹھا تھا۔

''یہ میجر منصور ہیں۔'' میڈم زبیری نے تعارف کروایا۔ ''اپنی بچی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا کیا نام ہے آپ کی بچی کا؟''

''ماریہ منصور۔''

''ہاں وہ تو بہت اچھی ہے میرے خیال میں اس کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پڑھائی میں بہت تیز ہے۔''

''جی میں تسلی کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ ایڈجسٹ تو ہو گئی ہے نا۔ شروع میں نئے اسکول میں آ کر بہت ڈسٹرب رہی تھی۔ اب آپ کی تعریف کرتی ہے۔ خوش ہے بہت۔'' وہ خاموش ہی رہی۔

''منصور صاحب تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔'' میڈم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں کل آپ کی کمپیئرنگ بہت اچھی تھی۔ لفظوں کا انتخاب اور برجستہ اشعار سے

میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ کل آپ مصروف تھیں ورنہ کل ہی بات کرتا۔"

"جی تھینک یو۔"

اور وہ چھوٹی بچیوں اور بچوں نے ماہی گیروں والا جو ٹیبلو کیا تھا آپ نے ہی تیار کروایا تھا۔"

"جی۔"

"ونڈر فل! بہت شاندار تھا۔"

"تھینک یو سر۔"

اس نے پھر شکریہ ادا کیا۔ اور میڈم زبیری سے اجازت لے کر چلی گئی۔ کل کے فنکشن میں کتنے ہی بچوں کے والدین آئے ہوئے تھے اور کتنوں نے ہی اس کی تعریف کی تھی۔ سو اس نے مجر منصور کی تعریف کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھی کہ اس کا کام قابل تعریف تھا۔ سو اگر لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے تو یہ اس کا حق تھا۔

فنکشن کے سلسلے میں وہ اتنی بے تحاشا مصروف رہی تھی کہ شاید اسی تھکن سے اور کچھ بدلتے موسم کی وجہ سے اچانک ہی بیمار ہو گئی۔ بخار بہت تیز تھا وہ کئی دن تک اسکول نہ جا سکی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ لڑکیوں میں خاصی ہر دلعزیز ہو گئی تھی چنانچہ اس کے گھر کے آس پاس رہنے والی اس کی کلاس کی دو چار لڑکیاں اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر آئیں۔ ان کی اس محبت پر اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"مس ہم آپ کے لیے دعا کریں گے آپ جلدی اچھی ہو جائیں۔" سمیرا نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"مس۔" روحی نے اس کے سرہانے والی ٹیبل پر فون رکھے دیکھ کر پوچھا۔ "مس ہم فون کر کے آپ کا حال پوچھ لیا کریں۔ ہمارے گھر فون ہے۔"

"بھئی میں کوئی ایسی خطرناک بیمار تو نہیں ہوں دو چار روز میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"نہیں مس۔" روحی نے فوراً بیگ سے کاپی نکال کر نمبر نوٹ کر لیا۔

اگلے دن شام کو جب وہ یونہی آنکھیں موندے لیٹی تھی کہ بیل ہوئی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسور اٹھایا اور اجنبی سی آواز پر اس نے پوچھا۔ "آپ روحی ہیں۔"

"تو مس میں ماریہ ہوں۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"فائن لیکن آپ نے فون نمبر کہاں سے لیا؟"

"روحی سے مس۔"

"اوہ اچھا اسے یاد آ گیا کہ روحی نے کل فون نمبر نوٹ کیا تھا۔

اور اسی رات جب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی میجر منصور کا فون آ گیا۔ کتنی دیر تک وہ حیران سی رہی۔

"آپ سر۔ آپ نے کیسے فون کیا؟"

"جیسے سب کرتے ہیں۔" وہ ہنسے۔ "اصل میں کچھ دیر پہلے ماریہ نے میرے کمرے سے آ کر آپ کو فون کیا تھا۔ اور میں نے اس وقت سوچا تھا کہ کاش میں نے خدا سے اس وقت کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ پتا ہے مس فرحین میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ کاش آپ کے گھر فون ہوتا اور میں...... مجھے آپ کا فون نمبر معلوم ہوتا تو میں آپ کو فون کرتا۔"

"مگر کیوں۔"

"آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ کتنے دنوں سے ماریہ گھر میں ذکر کر رہی ہے کہ مس بیمار ہیں تو اس لیے۔"

"شکریہ میں تو ٹھیک ہوں۔ بالکل معمولی سا بخار تھا۔"

"اور ہماری جان پر بنی ہوئی تھی کہ دعائیں مانگ مانگ کر تھک گئے کہ خدا ماریہ کی مس کو جلدی سے اچھا کر دے۔"

"جی شکریہ بہت۔" اس کے علاوہ وہ بھلا کیا کہتی۔ اور اسے اس فون کی بھی کوئی تک یا وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"اچھا جی خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"کچھ لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں میجر منصور کی طرح، بھلا اب مجھے فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

پھر کئی دن گزر گئے وہ ٹھیک ہو کر اسکول جانے لگی تھی اور میجر منصور کا خیال اس کے ذہن سے نکل بھی گیا تھا کہ ایک دن شام کو اچانک ان کا فون آ گیا۔

’’جی آپ کون۔‘‘

’’آپ نے پہچانا نہیں۔‘‘

’’جی نہیں۔ آپ کو کس سے بات کرنا ہے۔‘‘

’’بات تو مجھے آپ سے ہی کرنا ہے۔ آپ مس فرحین ہیں نا۔‘‘

اور اس سے پہلے کہ وہ مزید بات کیے بغیر فون رکھ دیتی۔ اس کو جیسے اس کا ارادہ معلوم ہو گیا۔

’’ارے پلیز رکھیے گا نہیں میں میجر منصور ہوں۔‘‘

’’اوہ آپ، فرمایئے کیسے زحمت کی۔‘‘

’’بس یونہی آپ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔‘‘

’’جی کیوں۔‘‘ اس نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

’’اس کیوں کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔‘‘ وہ ہولے سے ہنسا۔ ’’آپ کو فون کرنے سے پہلے میں نے پہلے بھی اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ کیوں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں مگر کچھ سمجھ نہیں آئی، کچھ جواب نہیں ملا۔‘‘

’’جی۔‘‘ وہ پھر احمقوں کی طرح صرف جی کر کے رہ گئی۔

’’دراصل آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور آپ سے کبھی بات کرنا چاہتا ہوں بس۔‘‘

’’سوری میجر صاحب! میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔‘‘ اس نے ریسور رکھ دیا۔ اور پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کرنے لگی۔ کسی اجنبی مرد سے اتنی دیر تک اس نے پہلی بار بات کی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

’’آپ مجھے اچھی لگی ہیں۔‘‘

اس کے کانوں میں بار بار یہی جملے گونج رہے تھے۔ تو کیا وہ کسی کو اچھی لگ سکتی ہے صبا کی طرح۔

فون کی بیل پھر بج اٹھی۔

’’مس فرحین۔‘‘ دوسری طرف پھر وہی تھا۔ ’’دیکھنے میں تو آپ بہت نرم خو اور نرم دل لگتی ہیں۔ لیکن آپ نرم دل تو نہیں۔ پھر آپ نے کتنی بداخلاقی سے فون نیچے رکھ دیا۔‘‘

’’جی۔‘‘ وہ بہت حیران تھی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ میجر منصور کی بات کا کیا جواب دے۔

’’مس فرحین! کیا آپ یقین کریں گی کہ جب میں نے فنکشن والے دن آپ کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں آپ کو برسوں سے جانتا ہوں۔ صدیوں کی جان پہچان ہے۔ اگر میں آواگون پر یقین رکھتا تو یقیناً سمجھتا کہ ہم کسی پچھلے جنم میں ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔ کیا آپ نے بھی ایسا محسوس کیا۔؟‘‘

’’نہیں۔ نہیں تو۔‘‘ اس نے گھبرا کر کہا۔

میجر منصور نے لمبا سانس لیا۔

’’چلیں، آپ نے ایسا محسوس نہیں کیا تھا مگر اب مجھے یہ بتائیں کہ میں نے ایسا کیوں محسوس کیا حالانکہ میں نے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔‘‘

’’جی پتا نہیں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔‘‘

’’اچھا تو سوچیے گا غور کیجیے گا خدا حافظ۔‘‘

’’خدا حافظ۔‘‘ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور بالکل غیر ارادی طور پر میجر منصور کے متعلق سوچنے لگی۔

اگلے روز عین اسی وقت پھر اس کا فون آ گیا۔

’’ہاں تو مس فرحین سوچا آپ نے۔‘‘

’’شاید میری شکل آپ کی کسی عزیزہ سے ملتی ہوگی۔‘‘

’’ہائے اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔‘‘ میجر منصور نے بے ساختہ کہا۔ ’’مس فرحین! آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکیں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔‘‘

’’جی۔‘‘ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ ’’محبت۔‘‘

’’جی محبت۔‘‘ شوخی سے کہا گیا۔

’’مگر آپ شادی شدہ ہیں۔ آپ کی ماشاءاللہ دو بچیاں ہیں۔‘‘

’’تو کیا شادی شدہ لوگ محبت نہیں کرتے۔ بھئی یہ جذبہ بڑا بے اختیار ہوتا ہے۔ آدمی اس میں بڑا مجبور ہوتا ہے۔ یہ کونپل تو خود بخود دل میں اگ جاتی ہے اور آدمی اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک بھی نہیں سکتا۔‘‘

''جی۔'' وہ ہونق بنی سنتی رہی اور میجر منصور خدا جانے کیا کیا کہتا رہا۔

بالکل وہی باتیں وہی جو صبا اسے بتایا کرتی تھی۔ کتنے دن اس پر سنسنی سی طاری رہی۔

''یہ کیا ہوا۔ ایسا کیوں ہوا اس کے ساتھ۔

''بھلا وہ شخص اس سے کیوں محبت کرنے لگا ایک بار ہی تو اس نے اسے دیکھا تھا پھر۔ وہ حیران ہو ہو کر سوچتی رہی اور میجر منصور کے فون اٹینڈ کرتی رہی حالانکہ ہر بار اس سے بات کرنے کے بعد وہ سوچتی کہ اب کے اگر فون آیا تو وہ انہیں آئندہ فون کرنے سے منع کر دے گی مگر وہ چپ چاپ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہتی اور سوچتی ہی رہ جاتی کہ اب اسے منع کرتی ہے کہ آئندہ وہ بات نہیں کرے گی مگر فون بند ہو جاتا اور وہ کہہ نہ پاتی۔

انہی دنوں بڑی آپا کے میاں کا خط لے کر ان کے ایک دوست آ گئے۔ ابا نے تعارف کروایا۔

''یہ ولید مرزا ہیں۔ مشہور صحافی روز نامہ ''صبح'' سے وابستہ ہیں۔ کسی کام کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں اور اس دوران ان کا قیام ادھر ہی رہے گا۔''

''اچھا۔'' اس نے سرسری نظروں سے اسے دیکھ کر سلام کیا۔

وہ ادھیڑ عمر کا لگ رہا تھا۔ کنپٹیوں کے بال سفید تھے۔ ابا سے عمر میں کچھ تھوڑا ہی کم ہوگا۔ چونکہ ابا نے اس کی بہت تعریف کی تھی اس لیے خود بخود ہی اس کے دل میں احترام پیدا ہو گیا تھا۔ ورنہ اسے اخبار رسالے وغیرہ پڑھنے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ گھر میں ان دنوں چونکہ وہی تھی رضی بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوات گیا ہوا تھا۔ اس لیے اسے ولید مرزا کو کمپنی دینی پڑی۔ اس روز کھانے کے بعد ابا عشا کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور وہ انہیں قہوہ دے کر جانے لگی تو انہوں نے روک لیا۔

''بھئی فرحین بیٹھو نا تم بہت بوریت محسوس کر رہا ہوں۔ کوئی بات کرتے ہیں۔''

''جی۔'' وہ ایک طرف بیٹھ گئی کہ آپا نے خاص طور پر کراچی سے دو بار فون کر کے ولید صاحب کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔

''تم جاب کرتی ہو شاید۔''

''جی اسکول میں پڑھاتی ہوں۔''

''اچھا۔ اچھا کام ہے بچوں کو پڑھانا وہ بھابھی نوید کی بیوی بڑی ہیں تم سے یا چھوٹی۔''

''بڑی ہیں۔'' اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا تو وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ''دو بہنیں بڑی ہیں مجھ سے۔ ایک بہن اور بھائی چھوٹا ہے مجھ سے۔''

''بڑی بہنوں کی تو شادیاں ہو گئیں اور چھوٹی بہن اور بھائی بھی نظر نہیں آئے گھر میں۔''

''رضی تو سوات گیا ہوا ہے اور عنبرین کی شادی ہو گئی ہے۔''

''تو تمہاری شادی کیوں نہیں ہوئی۔''

''پتا نہیں۔'' اس کی پلکیں جھک گئیں۔

''کہیں کوئی انڈر اسٹینڈنگ۔''

''نو نو سر۔''

''یہ شخص کس قدر بے باک تھا۔

''تو پھر۔'' اس کی سوالیہ نظریں فرحین کی طرف اٹھیں۔

''پتا نہیں شاید میں کسی کو اچھی نہیں لگی۔''

''نو۔ نو میں نہیں مان سکتا۔ تم تو اتنی پیاری ہو، اتنی دلکش اور خوبصورت کہ تمہیں دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کاش میں تیس سال پیچھے پلٹ سکتا تو۔''

''جی۔'' وہ ہونق سی بنی اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں فرحین ان چھ سات دنوں میں پتا نہیں کب پتا نہیں کیسے تم میرے دل میں آ چھپی ہو۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ فرحین جانتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں ایسے تمام حقوق بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ بس خود بخود ہو جاتی ہے۔ آپوں آپ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ یہ کب عمر کے کس حصے میں حملہ آور ہو جائے گی۔''

''اوہ نو۔'' اس کا چہرہ تپ اٹھا اور دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ ''مگر میں...... میں تو۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہا جان کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ بس مجھے اجازت دو کہ میں تم سے محبت کرتا رہوں۔ تم میری محبت قبول کر لو بس۔''

''تب ہی بیل بج اٹھی۔''

''ابا آگئے ہیں شاید۔''

اس نے شکر کیا۔اور دروازہ کھولنے کے لیے باہر چلی گئی۔

یہ کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔

پہلے میجر منصور اور پھر یہ ولید مرزا۔

میجر منصور دو بچیوں کا باپ اور ولید مرزا نہ جانے کتنے بچوں کا باپ تھا اور۔

اب اس عمر میں جب وہ ہر بات سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ یہ اس کی محبت کے دعوے دار بن کر اس کی زندگی میں داخل ہو رہے تھے۔کم عمری میں جب صبا کی باتیں سن سن کر اس کا دل بھی چاہنے لگا تھا کوئی اس سے بھی محبت کرے تو تب تو اس کی ہر کوشش ناکام رہی تھی اور اب جبکہ وہ۔

''اوہ خدایا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

اس روز جب اس نے صبا کے جانے کے بعد بڑی آپا سے کہا تھا کہ ہم سے تو آج تک کسی نے محبت نہیں کی تو۔تو کیا وہ کوئی لمحہ شنید تھا مگر اسنے اس لیے تو نہیں کہا تھا اس نے تو بس یوں ہی عام سی بات کی تھی نارمل۔اس میں نہ کوئی حسرت چھپی تھی نہ کوئی خواہش بس یونہی مگر شاید وہ لمحہ کسی گرفت میں آ گیا تھا اور اب یہ دو اشخاص اس کی محبت کے دعویدار بن کر آ گئے تھے۔

وہ ایک دم پریشان رہنے لگی تھی۔الجھی سی گئی تھی۔

ادھر میجر منصور تھا جو ہر تیسرے چوتھے دن فون کھڑکا دیتا تھا۔

''آپ آخر چاہتے کیا ہیں۔'' ایک دن زچ ہو کر اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بھئی۔ جانتا ہوں، تم تک رسائی ناممکن ہے۔ بندھا ہوا ہوں پاؤں میں زنجیریں پڑی ہیں یہ زنجیریں نہ ہوتیں تو کب کا تمہیں حاصل کر چکا ہوتا۔''

''تو پھر اب آپ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔''

''کیا لیتا ہوں تمہارا کوئی نقصان تو نہیں ہوتا نا تمہیں۔بس باتیں ہی کرتا ہوں۔اور دل میں ٹھنڈک سی اتر آتی ہے۔''

اور اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔

''میرے پانچ بیٹے ہیں بیٹی کوئی نہیں۔'' ایک روز ولید مرزا نے بتایا۔''سب کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ وہ بھی باہر جانے کو پر تول رہے ہیں۔ بیوی تین سال قبل اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔''

''کیسی تھی آپ کی بیوی؟'' اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ولید مرزا سے کیا بات کرے۔

''اچھی تھی۔ جانتی تھی کہ کھانا کیسے پکایا جاتا ہے بریانی میں کون سے مسالے پڑتے ہیں اور کوفتے کیسے اچھے بنتے ہیں لیکن ایک بات کی اسے زندگی بھر خبر نہ ہوئی کہ اس کا شوہر کیا چاہتا ہے۔'' انہوں نے چہرے پر مظلومیت طاری کر لی ہونٹ لٹکا لیے اور آنکھوں میں اداسی بھرے اسے تکنے لگے۔

''مردوں کے ہتھکنڈے۔''

اسے بڑی آپا کی بات یاد آئی تو وہ بیزار سی ہو گئی۔ ولید مرزا اسے کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ البتہ میجر منصور کی باتیں اس کے دل میں لمحہ بھر کے لیے ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ بعد میں وہ خود کو خوب ہی برا بھلا کہتی تھی لیکن جب بات کر رہی ہوتی تھی تو اسے محبتوں کا اظہار سننا اچھا لگتا تھا۔

وہ ذہین تو بہت تھی اور بقول بڑی آپا کے عقلمند ذرا بھی نہ تھی۔ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ سوائے صبا کے اس کی کسی کے ساتھ دوستی نہ ہوئی تھی۔ اور صبا کی ہر بات کو وہ سچ جانتی تھی جھوٹ سے تو وہ قطعی لاعلم تھی۔ اسے ہرگز علم نہیں تھا کہ مرد محبت کرتا نہیں بلکہ محبت ہونے کا ناٹک کھیلتا ہے۔ سو اسے کبھی منصور پر ترس آتا اور کبھی ولید مرزا سے ہمدردی محسوس ہوتی۔

''کاش تم مجھے پہلے مل گئی ہوتیں فرحین! اب تو میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں تم سے محبت کرتے ہوئے بھی شرمندہ ہوتا ہوں۔ مجھے کیا حق ہے کہ تم جیسی کم عمر اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے محبت کروں۔ مجھے معاف کر دینا پلیز۔'' جاتے جاتے ولید مرزا نے کہا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

یا اللہ کیا تھا جو یہ شخص آج سے بہت پہلے ملا ہوتا مگر۔

اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

جب ولید مرزا کی شادی ہوئی ہوگی تب تو وہ پیدا بھی نہیں ہوئی ہوگی۔

کیا تھا جو یہ شخص بیس سال بعد پیدا ہوا ہوتا اس کے دل میں میری محبت پیدا ہوئی ہی تھی تو یہ......“

”میں تو اس مقام پر کھڑا ہوں کہ تمہارے لیے تمہارے والدین کے سامنے جھولی بھی نہیں پھیلا سکتا۔ ہاں اگر مجھے اسکا یقین ہو کہ تم...... میں......میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔ اس نے سٹپٹا کر سوچا۔

اور اماں کا خیال اس کے ذہن میں آ گیا۔ کتنا مان ہے اماں کو اس پر کتنا فخر کرتی ہیں وہ اس پر کیا سوچیں گی بھلا وہ کہ میں۔ مجھ سے اپنا آپ سنبھالا نہیں گیا اور یہ شخص جو ابا کی عمر کا ہے ان کے گھر چند دن آ کر رہا تو وہ۔“

”یوں بھی ولید مرزا کے لیے اس نے اپنے دل میں محبت تو کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ بس ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔

”دیکھو فرحین مجھے پتا ہے کہ میرے لیے تم لاحاصل ہو لیکن خط تو لکھو گی نا مجھے، میں تمہیں خط لکھا کروں گا تم جواب دینا۔ دو گی نا، تمہارے خط میرے اندھیروں میں روشنی کی کرن بن کر چمکیں گے۔

”جی۔“ انکار تو اس سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ مروت میں آ جاتی تھی۔ بعد میں اسے خود پر بہت غصہ آیا خواہ مخواہ وعدہ کر لیا کبھی ابا یا رضی نے جو خط کھول لیا تو۔

ولید مرزا کے خط کا لفظ لفظ محبتوں میں ڈوبا ہوتا۔ صحافی تھا۔ لکھنے کا ہنر جانتا تھا جانے کہاں کہاں سے لفظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا تھا کہ وہ خط پڑھتی تو رخسار تپ اٹھتے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ ادھر میجر منصور تھے جن کی بے تابیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

”تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہیں دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں ایک بار ملو۔“

”مگر کیسے؟“ وہ حیران ہو کر پوچھتی۔

”کہیں بھی آ جاؤ۔ کسی بھی ریسٹورنٹ میں کسی ہوٹل میں تمہارے روبرو بیٹھ کر حال دل کہوں گا۔“

”مگر یہ تو مناسب نہیں ہے۔“

”نہ ہو مناسب دل کو تو تسکین ہو جائے گی نا پلیز۔“

”مگر میں تو اسکول کے علاوہ کبھی کہیں گئی نہیں۔“

”کسی سہیلی کے گھر کا بہانہ کر لو۔“

”میری تو کوئی سہیلی ہی نہیں ہے ایک صبا تھی، وہ بھی آج کل ملتان گئی ہوئی ہے پھر اس کا گھر بھی میرے گھر کے پاس ہی ہے۔“

”تم کیا چیز ہو فرحین نواز۔“ وہ جھنجلا جاتا لیکن دو چار روز بعد پھر وہی تکرار اب تو اسے بھی میجر منصور کے فون کا انتظار رہنے لگا تھا۔ دو تین دن فون نہ آتا تو وہ مضطرب سی ہو جاتی۔

”ہیں“ ایک دن اس نے چونکتے ہوئے سوچا۔ کہیں مجھے بھی تو میجر منصور سے محبت نہیں ہو گی۔“

مگر پھر اسے کچھ سمجھ نہ آ سکا کہ اسے محبت ہوئی ہے یا نہیں۔ یا یہ جو اسے میجر کے فون کا انتظار رہتا ہے اور اس کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔

یہ ہی محبت ہے

یا محبت کچھ اور ہوتی ہے۔

کوئی اور انوکھا سا جذبہ۔

منفرد اور الگ۔

اس روز بھی وہ میجر منصور کے فون کا انتظار کر رہی تھی کہ بیل ہوتے ہی اٹھ کر بھاگی۔ دوسری طرف چھوٹی آپا تھیں۔

”کیسی ہو فرحو؟“ چھوٹی آپا چہک رہی تھیں۔

”فائن۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”کیا کرتی رہتی ہو؟“

”اسکول جاتی ہوں اور بس۔“

”اب اسکول سے چھٹی کرو اور تیاری کرو اگلے گھر کی۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب بھی ہم ہی بتائیں بھئی نعیم بھائی آ گئے ہیں امریکہ سے لمبی چوڑی

ڈگریاں لے کر اور پھپھو بھاگم بھاگ تیاری کر رہی ہیں تمہیں لانے کی اور دو چار روز میں آنے والی ہیں تاریخ لینے۔“

”مگر میں نعیم بھائی“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”اچھا اماں کو دو۔“

”اماں۔“ اس نے وہیں سے آواز لگائی۔ ”آپا کا فون ہے۔“

اور پھر ریسور اماں کو پکڑا کر حیران حیران سی وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

”یہ کیا۔ یہ چھوٹی آپا کیا کہہ رہی تھیں۔

”شکر ہے صبا تم آ گئی ہو۔“ اماں فون کر کے باہر نکلیں تو شاید انہیں صبا نظر آ گئی۔

”فرحی کہاں ہے۔“

”اپنے کمرے میں ہے۔ پر سنو تو۔“ اماں اسے زور و شور سے بتانے لگیں۔

”ہائے میرے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ ادھر نمو بتا رہی ہے کہ فرحی کی پھپھو تو بس جلد از جلد رخصتی کروانا چاہتی ہیں۔“

”کس کی رخصتی۔“ صبا حیران ہو رہی تھی۔

”ارے فرحین کی۔“

”فرحی کی منگنی ہو گئی؟ کب کس سے۔“

”اے منگنی کہاں اپنوں میں، پیدا ہوتے ہی اسے تو اس کی پھپھو نے نعیم کے لیے مانگ لیا تھا۔“

”ہائے کتنی گھنی ہے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“

”ہائے نا۔“ اماں کے لہجے میں پیار ہی پیار جھلک رہا تھا۔“ اس معصوم کو کیا خبر آمنہ نے اس کے بچپن میں ہی نعیم کے لیے مانگا تو میں نے کہہ دیا کہ کیا خبر بڑے ہو کر نعیم کیسا نکلے۔ یوں ہی نام نہیں لیتے پھر نعیم باہر جانے لگا تو آمنہ نے چاہا کہ فرحی کو انگوٹھی پہنا دیں مگر تب اس کے ابا نے منع کر دیا کہ نہیں نعیم واپس آ جائے تو تب کیا خبر دیار غیر میں کیسا وقت گزارے۔ اپنے چچا کی طرح وہیں کا ہو رہے تو خواہ مخواہ فرحی کا ذہن خراب ہو گا یوں بھی فرحی تمہاری ہے۔ تو بی بی پھر فرحی کو کیسے خبر ہوتی کہ۔“

باہر اماں اور جانے کیا کیا تفصیلات بتا رہی تھیں اور اندر فرحین دونوں ہاتھ گود میں

رکھے ساکت بیٹھی تھی۔

نعیم جو خاندان کا سب سے خوبصورت۔

سب سے زیادہ ایجوکیٹڈ۔

اور سب سے زیادہ اچھا لڑکا تھا۔

وہ اس کا نصیب تھا۔

اس کی محبتیں اسے ملنا تھیں۔

اور وہ...... وہ کہاں الجھ گئی تھی راستے میں۔

اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر میجر منصور نے آج اسے کہیں باہر ملنے کو کہا تو وہ ضرور ملے گی کتنا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دلکش سا شخص اس کے روبرو بیٹھا اپنی محبتوں کا حال سنائے اور وہ دھڑکتے دل اور سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس کی بے قراریاں سنے۔ وہ ایک شخص جو اس کا نہیں ہو سکتا تھا۔

جو اس کا تھا بھی نہیں۔

اور وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھی۔

پھر بھی۔ پھر بھی اس کے دل میں اس کی محبت کا گداز جاگ اٹھا تھا اور اب اتنے اچھے شخص کی رفاقت کی خبر سن کر بھی اس کے دل میں کہیں کوئی خوشی نہیں پھوٹی تھی۔ کہیں پھول نہیں کھلے تھے۔

”فرحین تو میری سادھو صفت بیٹی ہے قانع اور مطمئن۔“

اماں کے لہجے میں کتنا فخر تھا کتنا غرور۔

اس کے اندر جل تھل ہونے لگا۔

”نہیں بھلا، میں کہاں قانع ہوں، کہاں سادھو صفت ہوں۔ میں تو بڑی حریص ہوں۔ بڑی بے مہری ہوں اور میں نے...... میں نے اماں۔“

اب اماں کو کیا خبر۔

کہ وہ ولید مرزا جو ابا سے تھوڑی ہی کم عمر ہے مجھے کیسے لمبے لمبے محبت بھرے خط لکھتا ہے۔ لفظ لفظ محبت میں پرویا ہوا۔

اور وہ میجر منصور۔

جتنی دیر وہ گفتگو کرتا تھا، وہ سحرزدہ سی بیٹھی رہتی تھی۔

اور جس سے ملنے کا پروگرام وہ آج بنا رہی تھی۔

اور وہ کتنی کمزور تھی کہ

''افوہ...... تو دلہن صاحبہ ادھر چھپی بیٹھی ہیں۔'' صبا مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ اور کھلے کھلے چہرے کے ساتھ۔

اور یہ صبا کتنی مطمئن اور خوش رہتی ہے حالانکہ اتنے سارے لوگوں نے اس سے محبت کی ہے اور وہ خود بھی تو عبدالمنان سے محبت کرتی تھی لیکن اس کے چہرے پر کہیں کوئی ندامت کہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ جب کہ وہ اندر باہر سے پانی پانی ہو رہی ہے۔

''آؤ صبا۔'' اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ''تم نے بہت دن لگا دیے ملتان میں۔''

''ہاں یار۔'' صبا اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ''وہاں سب نے مل کر میرا گھراؤ کر لیا اور بالآخر نکاح کروا کے ہی چھوڑا۔''

''نکاح ہو گیا تمہارا؟ کس سے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ابا کے دور کے کوئی رشتے دار ہیں محکمہ جنگلات میں آفیسر ہیں۔ رباب خان نام ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دو ماہ بعد رخصتی ہے۔''

''اور کیا تم خوش ہو صبا۔''

''ہاں بھئی، ناخوشی کی کیا بات ہے۔ رباب خان خوبصورت ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ دولت والا ہے اور کیا چاہیے ہوتا ہے ایک لڑکی کو رباب خان کو تو خاندان کا ہر شخص لڑکی دینے کو تیار تھا۔ مگر اس کی ایک ہی شرط تھی کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو سو قرعہ فال میرے نام پڑا تم اپنی سناؤ خالہ کہہ رہی ہیں کہ خاندان کے سب سے اچھے لڑکے کا نصیب بننے جا رہی ہو۔''

''ہاں، خاندان کا سب سے اچھا لڑکا۔''

اس نے سوچا اور کہا وہ بھی صبا کی طرح خوش رہ سکے گی۔ کیا وہ بھی کبھی فخر کر سکے گی کہ وہ نعیم احمد کی بیوی ہے اور۔''

فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اس نے چونک کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف میجر منصور تھا۔

''سوری رانگ نمبر۔ اس نے آہستگی سے کہہ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور جیسے

کوئی تیر سا اس کے دل میں کھب کر رہ گیا۔ ندامت کا...... شرمندگی کا تیر۔

اور کیا کبھی یہ تیر اس کے دل سے نکل سکے گا۔

ذرا سی جذباتیت نے عمر بھر کی ریاضت پر پانی پھیر دیا۔ اور کیا کبھی اس کی زندگی سے یہ چند ماہ نکل سکیں گے۔ زندگی کی شفاف سڑک پر یہ ذرا سی دھول جو آ پڑی تھی، کیا صاف ہو سکے گی۔

کیا وہ کبھی سر اٹھا کر فخر کے ساتھ نعیم کے ساتھ چل سکے گی۔ وہ نعیم جو دیار غیر سے اس کے لیے خود کو بچا کر لے آیا تھا اور وہ۔ کتنی کمزور تھی اور کتنی بے بس۔

کہ محض ایک جھوٹے جذبے کے ہاتھوں بے مول ہو گئی تھی۔ اور غلطی تو اسی کی تھی نا۔ اگر وہ پہلے ہی دن ولید مرزا اور میجر منصور کو ڈانٹ دیتی تو۔

مگر شاید اس کے لاشعور میں کہیں چاہے جانے کی خواہش چھپی ہوئی تھی۔

''تم خوش تو ہو نا فرو۔'' صبا نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''خوش۔'' اس نے سوچا۔ ''شاید وہ کبھی بھرپور طور پر خوش نہ ہو سکے۔''

''یہ تیر شاید ہمیشہ اس کے دل میں گڑا رہے گا، چبھتا رہے گا۔''

کسک دیتا رہے گا،

''بولو نا فرو۔''

''ہوں۔''

اس نے سر ہلایا مگر اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ پلکیں نم ہو گئیں اور پھر وہ یک دم ہی صبا کے کندھے پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔

....

کرب نارسائی

"اور تم تو سدا کی احمق ہو ربیعہ احمد علی۔" اس نے اپنے سامنے پڑی ڈائری کو دیکھ کر سوچا۔

"دس سال پورے دس سال تمہیں بیوقوف بنایا جاتا رہا اور تمہیں خبر تک نہیں ہوئی۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں گمان تک نہ گزرا، شک تک نہ ہوا کہ ان دونوں نے مل کر تمہیں بیوقوف بنایا ہے۔"

وہ دونوں جن میں سے ایک تمہاری بے حد پیاری سہیلی ثنا ملک ہے اور دوسرا وہ شخص جس نے بے شمار لوگوں کی موجودگی میں تمہیں بہ عوض پانچ ہزار حق مہر سکۂ رائج الوقت نصف معجّل اور نصف غیر موجل قبول کیا ہے۔ وہ دونوں دس سال سے عین تمہاری آنکھوں کے سامنے محبت کا یہ کھیل، کھیل رہے ہیں اور تم ایسی بے خبر کہ خط لکھ لکھ کر منتیں کر کر کے ثنا ملک کو بلاتی ہو۔ تم جو بڑی اسکالرشپ ہولڈر اور گولڈ میڈلسٹ بنتی ہو۔ خواہ تم چاند پر بھی جھنڈے گاڑ آؤ مگر اس دنیا کو نہیں سمجھ سکو گی۔ ربیعہ احمد علی دانی بھائی سچ ہی کہتے تھے۔"

"تجھے تو اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

تیری ماں بھی تیرے لیے ٹھیک ہی ڈرتی تھی۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری اٹھائی۔ ایک بار پھر اس کی ورق گردانی کی اور اسے شیلف پر رکھ دیا۔ اس کی رنگت یک دم سفید ہو رہی تھی اور دل جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

وہ بچپن سے ہی ایسی تھی۔ بھولی بھالی اور معصوم مگر اس کا دل بڑا غنی، بڑا فراخ، بڑا

سخی تھا۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن، گول چہرہ، دمکتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جنہیں ذرا جھکاتی تو لمبی پلکوں کے گھنے سائے رخساروں پر پھیل جائے۔ چھوٹے چھوٹے گول گول سے گداز ہونٹ، سب کو اس پر بے اختیار پیار آتا۔ اور بھائی تو اس کے دیوانے تھے لیکن جتنا اس سے پیار کرتے تھے اتنا ہی اسے تنگ بھی کیا کرتے تھے۔ اسے بیوقوف بنا کر انہیں لطف آتا۔ بچپن میں تو انہوں نے سینکڑوں بار اسے بیوقوف بنایا تھا مگر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ بھائی اسے بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال رہے ہیں اور اگر کبھی پتا چل بھی جاتا تو وہ ہنس دیتی "چلو کوئی بات نہیں۔"

ابا چاروں کو برابر جیب خرچ دیتے تھے۔ احسان جو اس سے چھوٹا تھا اسے چڑاتا۔

"ابا اس چوہیا نے اتنا جیب خرچ کیا کرنا ہے۔ کنجوس مکھی چوس ایک دھیلا خرچ نہیں کرتی۔"

"اس کے پیسے جمع ہوتے رہیں گے تو اس کا کوئی زیور بن جائے گا۔" اماں فوراً اس کی مدد کو آئیں۔ "لڑکیوں کا زیور، کپڑا لتا، برتن ایک دن میں تھوڑا ہی بن جاتا ہے۔"

مگر اس کے پاس پیسہ کبھی جمع نہ ہوا۔ بھائی چند دنوں میں ہی اپنا جیب خرچ ختم کر کے جیبیں جھاڑ لیتے پھر اس کے جیب خرچ پر ان کی نظر ہوتی۔ کبھی عدنان منہ بنا کر بیٹھ جاتا تو وہ پریشان ہو جاتی۔

"دانی بھیا کیا ہوا؟"

"آج میرا دل بڑا اداس ہے ربی۔ میرا ایک دوست ہے شاید اس کا نام اسکول سے کٹ جائے۔"

"مگر کیوں۔"

"بے چارہ دو ماہ کی فیس جمع نہیں کرا سکا۔ کاش میرے پاس پیسے ہوتے تو اس کی فیس جمع کرا دیتا۔ اتنا ذہین لڑکا ضائع ہو جائے گا ربو۔"

ربیعہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ اپنی ساری جمع پونجی ان کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔

کبھی عمران اسے بیوقوف بنایا۔ "ہائے ربی، آج تو وہ غریب عورت تو ایسے بلک بلک کر رو رہی تھی کہ بس یوں لگتا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"کیا ہوا مانی بھائی اس عورت کو؟" وہ روہانسی ہو جاتی۔

"کاش میرا بلڈ گروپ اس کے بیٹے سے مل جاتا۔ میں آج ہاسپٹل گیا تھا۔ وہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔ بے چاری غریب عورت کے پاس اپنے بیٹے کے لیے خون خریدنے کے پیسے نہیں تھے۔ بہت بیمار تھا اس کا بیٹا۔"

اور مانی کی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے نقوش بنتے بگڑتے رہتے۔ جیسے ابھی رو دے گی۔ پھر اس کا جیب خرچ مانی کے ہاتھوں میں ہوتا، اور وہ التجا کر رہی ہوتی۔

"مانی بھائی، پلیز ابھی جائیے اس عورت کو خون کی بوتل لے دیجیے۔"

عمران کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک اس نامعلوم بچے کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہتی۔

اور شانی تو اسے سب سے زیادہ تنگ کرتا۔ "آؤ ربی جاسوس، جاسوس کھیلیں۔"

وہ بھاگی بھاگی آتی۔

"چلو تم کیپٹن حمید، بنو اور میں کرنل فریدی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"بس تو اب جاؤ اور چپکے سے دادی اماں کے پان دان سے پیسے نکال لاؤ۔"

"مگر یہ تو چوری ہوگی شانی بھائی۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی۔

"ارے چوری نہیں پگلی۔ یہ تو تمہاری ٹریننگ ہے۔ تم پیسے نکالو گی تو میں جا کر رکھ آؤں گا۔ آخر کو میں نے بڑے ہو کر کرنل فریدی یا عمران دی گریٹ بننا ہے۔ اور تم ہوگی میری اسسٹنٹ۔"

اسے ابن صفی کے ناول بہت پسند تھے۔ اسسٹنٹ بننے کے شوق میں وہ دادی اماں کے پان دان سے پیسے نکال کر شانی کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا ہوتا۔

"دادی اماں کو پتہ بھی نہیں چلا شانی۔"

"تو بس اب دادی اماں کو پتا بھی نہ چلے گا اور میں پیسے رکھ آؤں گا۔"

شانی پیسے لے کر ہوا جاتا مگر شام کو جب دادی اماں شور مچاتیں تو وہ جھٹ سے بتا دیتی۔

"دادی اماں وہ تو ہم جاسوس جاسوس کھیل رہے تھے اور......"

دادی اماں ساری بات سن کر سر پیٹ لیتیں۔ "ارے احمق وہ چھوٹا ہے تجھ سے پھر بھی بیوقوف بنا جاتا ہے تجھے۔"

مگر اسے دادی اماں کی بات پر اعتبار نہ آتا۔ بھلا شانی اسے کیوں بیوقوف بنائے گا۔

"کیوں شانی؟" وہ پوچھتی۔

"ہاں بھلا میں تمہیں کیوں بیوقوف بناؤں گا۔ وہ تو دادی اماں خزانے کے سانپ کی طرح پان دان کے پاس پہرے دے رہی تھیں تو میں باہر چلا گیا کہ پھر آ کر رکھ دوں گا۔"

"پھر کیا ہوا اب تو دادی اماں کو پتا چل ہی گیا ہے۔ اب دے دو۔"

"اوہ اب تو نہیں ہیں۔ شاید جیب پھٹی ہوئی تھی۔ گر گئے۔" شانی اپنی جیبیں ٹٹولتا اور وہ مطمئن ہو جاتی۔

پھر ماسی نوراں کی مرغیاں تھیں جن کے سلسلے میں اکثر اسے بیوقوف بنایا جاتا۔ جب کبھی دانی بھیا کے دوست اکٹھے ہوتے تو مرغیوں کی شامت آ جاتی اور "بیٹھک" میں تیل کے چولہے پر مرغیاں روسٹ کر کے خوب دعوتیں اڑائی جاتیں۔ وہ انہیں دیکھ لیتی تو عدنان جھٹ کہتے!

"ہائے بے چاری ماسی نوراں کی مرغی کو سانپ نے ڈس لیا۔ مرغی بے چاری۔"

"پھر آپ اسے کاٹ کیوں رہے ہیں۔"

"چیل کوؤں کے لیے اور کیا۔"

رات کو جب ماسی نوراں چپلیں گھسیٹتی مرغیاں ڈھونڈنے آتی تو وہ جھٹ سے انہیں بتا دیتی۔ "ماسی نوراں آپ کی مرغی کو تو سانپ نے کاٹ لیا اور پھر دانی بھائی۔"

اور دانی بھائی اسے گھورتے رہ جاتے۔

کبھی کتے کے سامنے مرغی کے پروں کا ڈھیر لگا کر اسے چیخ چیخ کر آوازیں دیتے

"اے ربو...... ربی بچاؤ ماسی نوراں کی مرغی ٹامی کھا گیا ہے۔"

وہ بے چاری ننگے پاؤں بھاگی آتی مگر سوائے پروں کے کچھ ہاتھ نہ آتا اور وہ پورے اعتماد سے نوراں کو بتاتی ہائے ماسی نوراں آپ کی مرغی ہمارا ٹامی کھا گیا۔"

"وہ کمبخت تو زنجیر سے بندھا رہتا ہے۔ پھر حویلی میں کیسے آ گیا۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ قسم کھائے جاتی۔ ''قسم سے ماسی نوراں میں نے مرغی کو ٹامی کے منہ میں دیکھا تھا۔''

''ارے یہ سب شرارت دانی کے دوستوں کی ہے۔ سب جانتی ہوں۔''

دانی کو انہوں نے دودھ پلایا تھا اس لیے اسے کبھی برا نہیں کہتیں۔

بھائی تو خیر بیوقوف بناتے ہی تھے۔ لیکن جب وہ اسکول میں داخل ہوئی تو لڑکیوں نے بھی اسے تاڑ لیا۔ بہلا پھسلا کر اس سے ہوم ورک کرا لیتیں۔ اس کے شارپنر، ربڑ، پنسلیں ان کے استعمال میں رہتی تھیں اور وہ تھی بھی تو دل کی غنی ایک بار جو چیز دے دی، پھر نہ لی فری کو تو وہ اکثر اپنا لنچ بھی دے دیتی اور خود بھوکی گھر آ جاتی۔

''ارے پاگل آج پھر لنچ دے دیا کسی کو۔'' امی کو غصہ آ جاتا۔

''تو کیا کرتی امی وہ فری بے چاری لنچ لے کر نہیں آتی اور اسے بھوک لگتی ہے۔''

''تجھے بھوک نہیں لگتی بیوقوف۔''

''لگتی ہے پھر اسے زیادہ لگتی ہے۔''

یہی نہیں ایک بار تو اس نے اپنی سونے کی چوڑیاں اتار کر فری کو دے دیں۔ اماں نے اس کی کلائیاں خالی دیکھیں تو سر پیٹ لیا۔ ''چوڑیاں کہاں گئیں۔''

''ایک سہیلی کو دے دیں۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

''کیوں دے دیں سونے کی تھیں بیوقوف۔'' اماں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''بس دے دیں اس نے مانگی جو تھیں تو کیا ہم انکار کر دیتے۔''

''ارے انکار کرنے سے تیری شان میں فرق پڑ جاتا ہے۔'' وہ بوکھلائی جا رہی تھیں۔

پھر جب اسے پتا چلا کہ اماں چوڑیاں لینے فری کے گھر جا رہی ہیں تو رو رو کر اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کہ اماں نے چوڑیاں واپس لیں تو فری کہے گی۔ اس نے تھوک کر چاٹ لیا ہے۔

''باؤلی ہوئی ہے لڑکی۔ اب ہزاروں روپے کی چوڑیاں ہی چھوڑ دوں۔''

مگر وہ روئے چلی گئی۔ تب ابا نے اسے بہلا لیا۔ ''نہیں بیٹا ہم چوڑیاں نہیں لیں گے۔''

''چوڑیاں فری کے گھر سے کیسے واپس آئی تھیں۔ اس کے بارے میں اسے کچھ پتا نہ تھا۔ لیکن ابا نے اس کی خوشی کے لیے فری کو دو سیٹ چوڑیوں کے خرید کر دیے تھے۔

ایسے ہی ایک بار گلی میں کھیلتے ہوئے کسی شخص نے اس کی سونے کی بالیاں اتار لیں۔

''ارے ربی بالیاں کہاں ہیں۔'' اس نے بال بناتے ہوئے اماں نے پوچھا۔

''وہ تو جب کل شام ہم گلی میں کھیل رہے تھے ایک آدمی اتار کر لے گیا۔''

''کہاں کب۔'' اماں گھبرا گئیں۔

''کل جب ہم نیچے کھیل رہے تھے۔ اس نے کہا۔ تیری بالیاں کتنی خوبصورت ہیں دکھا تو بھلا۔ ہم نے دکھائیں تو وہ اتار کر لے گیا۔''

''ارے تو چیخی کیوں نہیں، آواز کیوں نہیں دی مجھے۔''

''کیا کرتے آواز دے کر وہ تو بھاگ ہی گیا تھا۔ آپ کو ملنا تھوڑی تھیں۔''

''ابا نے سنا تو بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

''شکر کرو بچی کی جان بچ گئی ورنہ آج کل تو دھیلے کی چیز کے لیے لوگ جان لے لیتے ہیں اور اب یہ زیورات والے چونچلے مت کرنا اس کے ساتھ۔''

اماں نے بھی توبہ کر لی۔

اس کا بچپن ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ تعلیمی میدان میں وہ بہت تیز تھی۔ کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتی۔ پانچویں، آٹھویں، دسویں، تینوں کلاسوں میں اسکالرشپ لیا بلکہ بہترین اسٹوڈنٹ کا اعزاز اور ٹاپ کرنے پر گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہ صرف طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے سادہ تھی بلکہ دل کی بھی بڑی غنی تھی۔ کالج میں بھی لڑکیاں اسے بیوقوف بنا کر اپنا مطلب نکال لیتیں۔ اماں کو ہر دم اس کی فکر کھائے جاتی۔

''ہائے اس لڑکی کا کیا ہو گیا۔ اسے تو لوگوں کی طرح چالاکیاں بھی نہیں آتیں۔ اس کی عمر کی لڑکیاں کیسے آنکھوں سے اور اشاروں سے باتیں کرتی ہیں۔''

اور ابا فخر سے کہتے۔'' میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ زبیدہ اس کے اندر باہر کی دنیا میں تضاد نہیں ہے۔ اصل میں یہ سب کو اپنے جیسا ہی سمجھتی ہے۔ مخلص بے ریا، بے غرض، ہمیں

تو شکر کرنا چاہیے کہ خدا نے ہماری بچی کو اتنا سخی، اتنا ہمدرد دل دیا ہے۔"

"واقعی دل کی تو وہ اتنی سخی تھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ مانگنے والے کو پورا گھر اٹھا کر دے دے۔"

"مگر یہ دنیا تو بے غرض نہیں ہے۔" اماں دلیل پیش کرتیں۔ میری بچی کو "بل چھل" نہیں آتے درانی صاحب۔ یہ کیسے مقابلہ کرے گی اس ظالم دنیا کا۔"

"پگلی، جس خدا نے اسے اتنا معصوم اتنا سادہ دل دیا ہے وہی خدا اس کی حفاظت بھی کرے گا۔"

وقتی طور پر وہ مطمئن ہو جاتیں لیکن پھر اس کی سادگی کوئی نہ کوئی ایسا گل کھلا دیتی کہ وہ دامن پھیلا پھیلا کر اس کے اچھے مقدر کی دعا مانگنے لگتیں۔

"تو تو اتنی سمجھدار ہے ربی، پھر کیوں نہیں سمجھتی کہ تیرے ساتھ فریب کیا جا رہا ہے۔"

"کیا کروں اماں مجھے تو سب سچ لگتا ہے۔" کیا لوگ اس طرح بھی جھوٹ بول لیتے ہیں جو بالکل سچ لگے۔

اماں منہ کھولے اسے دیکھتی رہ جاتیں جسے جھوٹ سچ کی پہچان نہیں تھی۔

"اور پھر اماں میں یہ بھی سوچتی ہوں کیا پتا میرے ساتھ سچ ہی بولا جا رہا ہو اور اگر میں استطاعت رکھتے ہوئے بھی مدد نہ کروں گی تو بعد میں اگر وہ سچا ہوا تو مجھے ندامت ہوگی۔ پچھتاوا ہوگا۔ بس یہ بات ہے۔"

ایک بار تو وہ خود بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ یہ دنیا واقعی بہت عیار ہے۔ یہاں جھوٹ اور فریب زیادہ ہے۔ سچائی اور نیکی کم۔ جس طرح مسز خاقانی اور مس سہراب نے اسے اکسا کر مس ملک کے خلاف کالج میں ہڑتال کروائی تھی۔ اس سے اسے کافی سبق حاصل ہوا تھا۔ مس ملک بے قصور تھیں۔ جب اسے حقیقت کی خبر ہوئی تو وہ بہت پچھتائی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ آئندہ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں آلہ کار نہیں بنے گی بلکہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے اٹھائے گی۔ انہی دنوں دانی بھائی نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔

"دیکھو ربو! ہر بندے کو اپنا جیسا مت سمجھ لیا کر۔ سارے لوگ قابل اعتماد نہیں ہوتے۔ کسی پر بھروسا کرنے سے پہلے اسے سمجھ لیا کر۔ مجھے تیری فکر رہتی ہے۔ ربو اور میرا دل

تیرے لیے ڈرتا ہے۔"

اس نے دانی سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ وہ بہت احتیاط کرے گی۔

وقت گزرتا گیا اس نے بی۔ اے کر لیا۔ اماں کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لیے اتنی ہی تعلیم بہت ہے لیکن عمران عدنان نے اس کی سخت مخالفت کی۔

اماں اسے یونیورسٹی میں ضرور بھیجو۔ گھر سے باہر ہوسٹل میں رہے گی تو اس کی عقل بڑھے گی۔ اعتماد پیدا ہوگا۔ وہاں طرح طرح کے لوگوں سے ملے گی تو اسے انسانوں کی پہچان ہوگی۔ دنیا کا پتا چلے گا ورنہ تو یہ بی اے کر کے بھی بونگی کی بونگی ہی رہ جائے گی۔ دیکھ لیجیے گا ابھی کسی بھکارن نے آ کر دو آنسو بہائے تو اس نے اٹھا کر سارا گھر ہی دے دینا ہے۔ ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیاں بڑی تیز ہو جاتی ہیں۔"

ابا نے بھی ان کی حمایت کی تو ایک دن وہ نیو کیمپس میں مانی کے ساتھ سہمی سہمی کھڑی تھی۔

"گھبراؤ نہیں ربی میں بھی تو یہاں ہوں۔ تیری خبر لیتا رہوں گا۔"

"پتا نہیں میری روم میٹ کیسی ہوگی مانی بھائی! مجھے تو بس یہ ڈر لگ رہا ہے۔ اگر وہ کوئی لڑاکا سی لڑکی ہوئی تو پھر۔"

"ارے تو تم بھی لڑ لینا۔ اچھا ہے لڑائی کی ٹریننگ ہو جائے گی۔ جو سسرال میں کام آئے گی۔"

"مانی بھائی پلیز۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"اچھا، اچھا گھبراؤ نہیں اگر ایسا ہوا تو کمرا بدل لیں گے۔"

مانی نے اسے تسلی دی مگر اسے کمرا نہ بدلنا پڑا اس کی روم میٹ ایسی ہی تھی کہ لمحہ بھر کو وہ بیگ دروازے کی دہلیز پر رکھے اسے دیکھتی ہی رہ گئی وہ بھی شاید کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی۔ اس کا ہولڈال کمرے کے بیچوں بیچ پڑا تھا اور وہ بکس کے اوپر دونوں ہاتھوں کی کٹوریوں میں ٹھوڑی ٹیکے کچھ پریشان سی بیٹھی تھی۔ بے حد سفید رنگت جس میں ہلکی ہلکی سرخی کی آمیزش تھی جیسے کسی نے میدے میں ہلکا سا گلابی رنگ گھول دیا ہو ہاتھ بھی بے حد نازک، سفید سفید لانبی مومی انگلیوں والے اور آنکھیں، بے حد لمبی یوں جیسے سارے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہوں، بالکل کابل کے باداموں جیسی اور ان آنکھوں کی رنگت کتنی دل کش تھی۔ چاکلیٹ،

چاکلیٹی سی۔ بال بھی اسی رنگت کے تھے اور بہت لمبے، باریک ہونٹ، چھریرا بدن دراز قد۔

''کیا دیکھ رہی ہو بھئی۔'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''میں دیکھ رہی ہوں تم کوئی مغل شہزادی تو نہیں ہو جو راہ بھول کر ادھر آ نکلی ہے۔''

''اور پتا ہے میں کیا سوچ رہی ہوں؟ تم کوئی اپسرا تو نہیں ہو۔ بھولی بھالی معصوم سی کوئی دیوی۔''

پھر وہ دونوں ہنس پڑی تھیں۔

یوں ثناء ملک اور ربیعہ درانی کی دوستی ہوگئی اور دوستی بھی ایسی کہ پوری یونیورسٹی میں مشہور ہوگئی۔ بہت کم لڑکیوں کو معلوم تھا کہ ان میں ربیعہ کون ہے اور ثناء کون۔

ثنا بڑی مہربان، بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ مخلص اور چاہنے والی، ربیعہ پر تو وہ بڑی مہربان تھی۔ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی۔ اسے سر درد بھی ہوتا تو گھنٹوں سر دباتی اور وہ خوش ہو کر سوچتی۔

''دنیا میں اتنی بری بھی نہیں ہے دانی بھائی خواہ مخواہ مجھے اس سے ڈراتے رہتے ہیں۔ یہ تو اچھے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں سے۔''

وہ ثناء کو اپنا دوپٹا دیتی تو ثنا پورا سوٹ ہی اسے دیتی۔ وہ ثناء کے لیے بازار سے ایک چیز لاتی تو وہ دس لے آتی پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ دینے ہی میں نہیں، لینے میں بھی چارم ہوتا ہے۔ ایک بڑی انوکھی سی خوش کن مسرت ہوتی ہے۔ اس ذائقے سے اسے ثناء نے روشناس کرایا تھا۔ بہت کچھ دیا تھا اس نے اسے۔ اپنی محبتیں، چاہتیں خلوص اور پیار۔ مگر وہ جو دانی کا خیال تھا کہ ہوسٹل میں رہ کر اور یونیورسٹی میں جا کر اس کا مشاہدہ بڑھے۔ وہ خام ہی ثابت ہوا۔ اس کے مشاہدے میں تو ذرا بھی اضافہ نہ ہوا تھا بلکہ وہ اپنے عقیدے میں اور بھی راسخ ہوگئی۔ اس نے ثناء کے علاوہ کسی سے دوستی نہ کی۔ کسی سے ملی ہی نہیں صرف ثنا کو ہی دیکھا تھا۔ اسے ہی پرکھا، اسے ہی سمجھا تھا اور جتنا ثنا کے بارے میں سوچا تھا۔ اسے ایک جواب ملا تھا کہ جمع، تقسیم، ضرب کے بعد بھی ایک جواب کہ وہ بڑی مخلص، بڑی محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ اس کے اندر باہر میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ ایسی ہی ہے۔ جیسی دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت اتنی ہی دلکش جتنی باہر سے ہے۔ تب اس نے بڑے فخر، بڑے اعتماد سے دانی بھیا کو بتایا۔

''یہ جو ثنا ملک ہے نا میری بہت اچھی دوست ہے۔ مخلص، ہمدرد اور مہربان اور یہ لڑکی ہے جس کے بارے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میرے ساتھ اس کی دوستی بے غرض بے ریا ہے۔''

''ابھی تو تمہیں اس سے ملے صرف تین ماہ ہوئے ہیں۔ گڑیا۔ اتنی جلدی کسی کے بارے میں رائے قائم نہیں کرتے۔''

بھائی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ''یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے ربو یہاں لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے لگائے پھرتے ہیں۔ کسی کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیسا ہے۔''

پھر بھی اسے یقین تھا کہ ثنا ایسی نہیں ہے وہ دوسرے سارے لوگوں سے مختلف ہے۔ اور گزرتے وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کا یقین غلط نہیں تھا۔ اس بار اس نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ اور کئی بار بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا کہ اگر وہ دانی بھائی اور مانی بھائی کی منگنی نہ ہو چکی ہوتی تو وہ ضرور اُسے بھابھی بناتی اور یہ بات اس نے ثنا سے کہہ بھی دی۔ تب ثنا ہنس پڑی۔''

''چلو یہ اچھا ہوا کہ تمہارے بھائیوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ ورنہ تمہیں مایوسی ہوتی کیونکہ ہمارے ہاں لڑکیوں کی شادی خاندان سے باہر نہیں کی جاتی۔ اور پتا ہے میرے چاچا ملک فیملی کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن میرے بابا نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ ملک تو کہلواتے تھے لیکن ہماری طرح قطب شاہی اعوان نہیں تھے۔''

''تو تمہاری شادی خاندان میں کس سے ہو گی ثنا۔'' اسے تجسس ہوا۔ ''وہ کیسا ہے۔''

بھئی اس وقت تو میرے سامنے خاندان میں صرف دو ہی لڑکے ہیں۔ ایک میرے چاچا کا بیٹا ملک ٹیپو سلطان تو مجھ سے آٹھ برس چھوٹا ہے اور دوسرا میری پھوپھی کا بیٹا ملک ارسلان جو ابھی صرف دو برس کا ہے۔''

''ارے ایسی حماقت مت کرنا ثنا ملک۔''

''نہیں کروں گی۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تو دونوں ہنس پڑیں۔ جلد ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے گھر کے ایک ایک فرد کے بارے میں جان گئی تھیں۔ ربیعہ کو ثنا ملک

کے گھر کا کوئی فرد اجنبی نہ لگتا تھا حالانکہ اس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا اسد ملک کو جو ثنا کا اکلوتا بھائی تھا اور سب کی خواہشوں کے برعکس فوج میں چلا گیا تھا اور اس سے صرف دو سال بڑا تھا۔ ثنا کے بابا کو جان گئی تھی جو بڑے مہربان مگر بہت سخت بھی تھے اس کی ماں جی کو بھی جو بڑی نرم دل تھیں۔ اس کی چچی ثریا اور اس کے بچوں کو بھی ماسی میراں کو جو ایک طرح سے ان کی انا تھی اور احمد علی کو بھی۔

احمد علی ثنا کا چاچا کا منہ بولا بیٹا تھا۔ مگر وہ بڑی باقاعدگی سے اسے یونیورسٹی ملنے آتا تھا اور اس کے جانے کے بعد وہ گھنٹوں اس کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہ احمد علی کا اتنا ذکر کرتی تھی جتنا کبھی اس نے اپنے سگے اکلوتے بھائی اسد علی کا بھی نہیں کیا تھا۔ ربیعہ نے اگرچہ احمد علی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ اس کی ایک ایک عادت ایک ایک انداز سے اس طرح واقف ہوگئی تھی جیسے وہ اسے برسوں سے جانتی ہو۔

''علی بھائی کے ساتھ زندگی نے کوئی زیادہ اچھا سلوک نہیں کیا ربو۔'' کئی بار کی دہرائی ہوئی یہ بات وہ پھر بتاتی تو بھی ربیعہ بڑے دھیان سے سنتی۔

''اتنی سی عمر میں انہوں نے بڑے دکھ سہے ہیں۔ دو سال کے تھے کہ ماں مرگئی۔ چاچی ثریا نے انہیں دیکھا تو فدا ہوگئیں گول مٹول گورے چٹے صحت مند احمد علی انہیں بہت بھائے۔ وہ بے اولاد تھیں اور اسے گود لینے کے لیے مچل گئیں۔ چاچا نے بہت ٹالا، بابا نے سمجھایا۔ وہ اسے گود لینے کے خلاف تھے کیونکہ وہ ہمارے ایک مزارع کا بیٹا تھا مگر چاچی نے بھوک ہڑتال کردی اور چاچا مان گئے۔ ان کے نزدیک وہ ایک کھلونا تھا جسے انہوں نے چاچی کا دل بہلانے کے لیے خرید لیا تھا۔ اور انہوں نے اسے کبھی بیٹے کی حیثیت نہیں دی البتہ چاچی اس کا بہت دھیان رکھتیں بہت پیار کرتیں۔ مگر شاید ماں باپ کے پیار کی طرح یہ پیار بھی اس کے نصیب میں نہ تھا۔ جب وہ آٹھ سال کا ہوا تو چاچی کی گود بھرگئی۔ یکے بعد دیگر تین لڑکے اور پھر ایک لڑکی اور یوں ہولے ہولے احمد علی پس منظر میں چلا گیا۔ چاچی کو یاد بھی نہ رہا کہ یہ وہی احمد علی ہے جسے گود لینے کے لیے انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کے باپ کو مجبور کر کے اسے لیا گیا تھا۔ احمد علی کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ خود بھی اداس ہو جاتی۔ ''پتا ہے جب آدمی کو یک دم بلندیوں سے زمین پر پٹخ دیا جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور احمد علی بھی کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ چاچی جو لقمے بنا بنا کر

اس کے منہ میں ڈالتی تھیں اور دن میں دو دو بار کپڑے بدلتی تھیں اب اگر وہ ہفتوں کھانا نہ کھاتا تو پوچھتی بھی نہیں۔ عید بقرعید پر سب ملازموں کے ساتھ اس کے کپڑے بھی بن جاتے تھے بس ماسی میراں تھیں جنہوں نے خود بہ خود ہی اس کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ نام کو وہ ہمیشہ چچا کا منہ بولا بیٹا ہی رہا کہ اب یہ بھی شان کے خلاف تھا۔ کہ ایک بار اسے بیٹا کہا۔ اس کے باپ سے چھینا اور اب اسے گھر سے نکال دیتے سو وہ اسی گھر میں رہا۔

''اسد بھائی کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی۔ اس لیے وہ اکثر ہمارے گھر ہی رہتا، اماں جی اور بابا فطرتاً بڑے رحم دل ہیں انہوں نے ہمیشہ علی بھائی سے اچھا سلوک کیا۔ اسی لیے تو...... وہ اکثر کہتا تھا کہ وہ صرف ہماری وجہ سے اس گھر میں رہ رہا ہے ورنہ کب کا چلا گیا ہوتا۔

وہ اسد بھائی کے ساتھ اسکول جاتا تھا لیکن اس نے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ ہی کبھی چاچا چاچی کو خیال آیا کہ اسے بھی پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ اسد بھائی اکثر اس کی مدد کر دیا کرتے تھے مگر وہ اسکول سے آکر اسٹیشن چلا جاتا اور لوگوں کا سامان اٹھاتا۔ میٹرک کے بعد جب وہ شہر گیا تو یہاں اس نے ٹیوشنز کرلیں اور یوں زندگی کا یہ سفر طے کیا۔ آج وہ ایک کامیاب انجینئر ہے۔''

ایسی ہی ڈھیر ساری باتیں ثنا اسے احمد علی کے بارے میں بتایا کرتی تھی۔ ایک روز جب وہ دونوں باہر گراؤنڈ میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں کہ ثنا نے اسے بتایا۔

آج کل علی بھائی بہت پریشان ہیں ربو۔ یکایک ہی ان کے دل میں اپنے باپ کو تلاش کرنے کا خبط سا گیا ہے ماسی میراں نے شاید انہیں بتا دیا تھا کہ چاچا نے ان کے والد کو زبردستی گاؤں سے باہر بھیج دیا تھا۔ لیکن سوچو تو اتنے سال بعد ایک بے حد عام سے شخص کو اتنی بڑی دنیا میں کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مگر علی بھائی تو دیوانے ہو رہے ہیں اخبار میں اشتہار شائع ہو رہے ہیں اور وہ خود چھٹی والے دن ارد گرد کے گاؤں قصبے چھانتے پھرتے ہیں۔ میں انہیں بہت سمجھاتی ہوں مگر وہ تو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں۔ یقین کرو ان کے چہرے پر اتنا کرب ناک سوز ہوتا ہے کہ میں ان کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتی۔''

''ایسا کرو ثنا'' اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔ ''تم اپنے اس منہ بولے بھائی کی شادی کر دو۔ کسی بہت اچھی سی، بہت مخلص لڑکی سے جو اس کا درد بانٹ لے۔ ارے دیکھ لینا اس کے سارے زخم خود ہی بھر جائیں گے۔''

ثنا کو اس کا مشورہ پسند آیا بولی۔ ''لیکن ایسی لڑکی کہاں ملے گی ربو جو بہت مخلص، بہت ہمدرد ہو، جو اسے اتنی محبت دے کہ اس کی ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جائے۔''

''وہ لڑکی کیا تم خود نہیں ہو سکتیں ثنا ملک۔''

اس نے ورق الٹتے ہوئے یونہی کہہ دیا تو ثنا کے چہرے کا رنگ بدل گیا لحہ بھر کو تو وہ یونہی ششدر سی بیٹھی رہی......تم......تم نے یہ بات کیوں کی ربی۔''

''اس لیے کہ تم بہت مخلص ہو اور تمہارے دل میں جتنا درد اس کے لیے ہے اتنا کسی اور لڑکی کے دل میں اس کے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔''

''بیوقوف وہ میرے لیے اسد بھائی کی طرح ہے اور میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا اور اگر میں اس کے لیے دُکھی ہوں تو اس لیے کہ وہ مجھے اسد بھائی کی طرح ہی عزیز ہیں۔''

''سوری ثنا۔'' وہ شرمندہ ہو گئی۔

''کوئی بات نہیں۔''

ثنا نے بات ختم کر دی تھی۔ لیکن ربیعہ کتنے ہی دن تک اندر ہی اندر شرمندہ ہوتی رہی کہ بھلا وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی کہ میں نے ایسی بات کیوں کی۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ ثنا جب بھی گاؤں سے واپس آتی تو بتاتی۔ ''ماں جی نے احمد علی کے لیے گاؤں کی لڑکیاں دیکھ لی ہیں۔ لیکن انہیں کوئی پسند نہیں آئی اور نہ ہی اسد بھائی کو۔ اسد بھائی کو علی بھائی سے بہت پیار ہے بقول ان کے وہ ان کے والد کے دوست ہیں اور چاچی اکثر کہتی ہیں کہ اس لڑکے نے تو دونوں بہن بھائیوں پر جادو کر رکھا ہے۔ مگر وہ ہے ہی ایسا۔ بابا بیمار ہوئے تو اس نے ان کی اتنی خدمت کی کہ میں اور اسد بھائی بھی نہ کر سکے۔

انہیں دنوں جب گرما کی چھٹیوں میں ثنا اس کے گھر آئی تو اس کے ساتھ فاطمہ بھی تھی۔ اس کی پھوپھی کی بیٹی بے حد دل کش نقوش اور رنگ گندمی، سادہ سی لڑکی۔

''ارے ثنا تم سارے شہر میں لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہو اور فاطمہ کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں۔ میرا خیال ہے اس کا اور احمد علی کا جوڑ خوب رہے گا۔''

وہ ایک دم اچھل پڑی۔ ''نہیں ربی نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ ہمارے ایک ہاری کا بیٹا ہے۔ اور ملکوں کی بیٹیاں بھلا مزارعوں، یا ہاریوں کے گھر کیسے

بیاہی جا سکتی ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا ثنا اس نے تمہارے گھر پرورش پائی ہے۔ تم اور اسد اسے بھائی کہتے ہو اور وہ تمہارے چچا کا منہ بولا بیٹا ہے۔''

''پھر بھی نہیں۔ ربیعہ درانی ہے تو وہ ایک ہاری کا ہی بیٹا نا۔ اس بات پر تو ہمارے خاندان میں خون ہو سکتا ہے اگر یہ بات منہ سے نکالوں تو میرے بابا باوجود اس کے کہ وہ بہت نرم دل ہیں مجھے زندہ ہی دفن کر دیں۔''

''مگر وہ پڑھا لکھا ہے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔''

''یہ تم سوچتی ہو ربی، لیکن ہم گاؤں کے لوگوں کے رسم رواج بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ہم کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہو جائیں اپنی روایتوں سے نہیں لڑ سکتے چاہے دلی طور پر ہم انہیں برا کیوں نہ سمجھیں۔ میرے نزدیک بھی سب انسان برابر ہیں خواہ وہ ایک ہاری کا بیٹا ہو یا ملکوں کا وارث۔ لیکن میں اپنی سوچ کو دوسروں کے ذہنوں میں منتقل نہیں کر سکتی۔''

اور اس روز ان کے فائنل کا آخری پیپر تھا۔ وہ دونوں پیپر دے کر آئیں تو کچھ اداس سی تھیں۔

''ایک بات کہوں ربی۔''

''کہو۔''

''مگر ڈر لگتا ہے کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔''

''نہیں! میں تمہاری کسی بات پر خفا نہیں ہو سکتی۔''

''تو......اگر......اگر میں تمہیں احمد علی کے لیے پرپوز کروں تو؟'' اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھا تو لحہ بھر کو ربیعہ بھونچکا سی رہ گئی۔ پھر ہولے سے مسکرائی۔ ''میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی ثنا۔ تم جب اس شخص کی اتنی تعریفیں کرتی ہو تو یقیناً وہ قابل تعریف ہو گا۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے بارے میں سارے فیصلے میرے والدین کریں گے۔''

''تو پھر ماں جی اور چاچی کے ساتھ تمہارے گھر آؤں۔''

''مگر ثنا ایک بات یاد رکھنا اگر میرے والدین نے انکار کر دیا تو تم خفا مت ہونا کہ میرے لیے میرے والدین کا فیصلہ محترم ہو گا خواہ وہ اقرار میں ہو یا انکار میں۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو میں سب ٹھیک کر لوں گی۔''

اور واقعی اس نے سب ٹھیک کر لیا۔ حالانکہ ربیعہ کو اس کی کم ہی امید تھی کہ اماں ابا یہ رشتہ قبول کریں گے۔ لیکن ابا بڑے کھلے دل کے تھے۔ ان کے دل میں بڑی وسعت تھی اور انہیں احمد علی پسند آیا تھا۔

"ہل چلا کر زمین کے سینے سے اناج اگانے والے گھٹیا نہیں ہوتے زبیدہ بیگم۔" انہوں نے اماں کو سمجھایا۔ "گھٹیا تو وہ ہوتے ہیں جو چوری کرے۔ ڈاکے ڈالے محنت کرنے والے تو بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ بھاگوان۔"

"اچھا لڑکا ہے اماں۔" دانی اور مانی کو بھی وہ پسند آیا تھا۔ پھر اپنی ربو کے لیے تو بہت ہی مناسب ہے۔ بڑا ٹیلنٹ ہے اس میں اور اس کا مستقبل بہت روشن ہوگا۔"

یوں فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔

اماں جھولی پھیلا پھیلا کر اس کے لیے دعائیں مانگتیں۔ اللہ میری ربو کا نصیب اچھا کرنا۔ میری بچی کو چھل بل نہیں آتے وہ بڑی سادہ اور معصوم ہے۔"

رزلٹ آتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مانی دانی اور شانی بہانے بہانے سے اسے چھیڑتے اور جب اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں تو فوراً اسے منا لیتے اور شانی لطیفے سنا سنا کر اسے ہنساتا تا کہ وہ تھک جاتی۔

ایک روز مانی نے اسے چھیڑا۔ "ربو تو تو بڑی دیالو ہے بڑی سخی، مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں کسی دن کوئی محترمہ تشریف لائیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہیں "مسز ربیعہ آپ کے میاں ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں اور تم مارے سخاوت کے اسے ہی دان کر دو کہ چلو تمہیں اچھے لگتے ہیں تم لے لو۔"

سب ہنس پڑے تھے لیکن دانی ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "دیکھو ربو ازدواجی زندگی کا سفر بڑا کٹھن ہوتا ہے۔""

"آپ نے تو جیسے دس ازدواجی زندگیاں گزاری ہوئی ہیں۔" شانی نے اسے چھیڑا لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے اسے ہولے ہولے پیار سے سمجھاتا رہا۔ زمانے کی اونچ نیچ، مشکلیں، مصیبتیں اور وہ نم آنکھوں سے سر جھکائے سنتی رہی۔

"رخصتی سے دو دن پہلے ثنا بھی آ گئی تھی۔

"ربی! تم نے کبھی چٹخا ہوا آئینہ دیکھا ہے۔" اس کے ہاتھوں پر مہندی لگاتے

ہوئے ثنا نے پوچھا۔ "اگر چٹخے ہوئے آئینے کو احتیاط سے نہ اٹھائیں، سنبھال کر نہ رکھیں تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، ربی، علی بھائی کا آئینہ بھی چٹخا ہوا ہے اس احتیاط سے سنبھال کر رکھنا کہ کہیں ٹکڑے بکھر نہ جائیں۔"

اور اس نے سچ مچ احمد علی کو چٹخا ہوا آئینہ ہی سمجھا۔ یوں احتیاط سے سنبھال کر رکھا جیسے ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جائے گا بکھر جائے گا۔

پورے دس برس بیت گئے تھے اور ان دس سالوں میں ایک بار بھی اسے گمان تک نہیں ہوا تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور بیتے ہوئے دس سالوں کا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ کیسے روکھے، پھیکے بے رنگ تھے۔ یہ ماہ و سال، مگر آج سے پہلے اس نے اس انداز میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ تو اپنی زندگی سے مطمئن تھی مگر آج...... آج وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی کے بیتے ہوئے سال بڑے بے رنگ تھے۔ حتیٰ کہ اس کی سہاگ رات بھی۔ جس میں وہ پلکوں پر خواب سجائے اور دل میں گنگناتے جذبات لیے اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئی تھیں۔ اور جس کے اختتام پر اس نے سوچا تھا کہ درحقیقت ازدواجی زندگی اور یہ سہاگ رات کوئی اتنی زیادہ رومینٹک بھی نہیں ہوتی۔ یہ سارے فسانے محض صرف سننے سنانے کے ہیں۔ کوئی رومانی، افسانوی بات نہیں ہے۔

نہ کوئی عہد و پیماں ہوئے۔

نہ وہ اس پر وارفتہ ہوا۔

نہ اس نے حسن کی تعریف کی۔

سب کچھ اسے **MATTER OF FACT** لگا پھر بھی وہ ناخوش نہیں تھی کہ شاید میاں بیوی یوں ہی زندگی گزارتے ہیں۔ کون سی ان کی محبت کی شادی تھی یا انہوں نے زمانے سے لڑ کر ہزاروں مخالفتوں کے بعد ایک دوسرے کو پایا تھا۔ بس عام سی شادی تھی ان کی۔ اور شادی سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ اور شادی کے بعد ان کی زندگی ایسے ہی گزرنے لگی۔ جیسے اس کی دانست میں سب میاں بیوی گزارتے ہیں۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں بھی احمد علی نے کبھی اس کے لیے وارفتگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ کبھی اس کے لیے موتیے کے گجرے آئے۔ نہ کبھی میٹھے پان نہ وہ کبھی کہیں گھومنے گئے

نہ علی نے کبھی اس کے لیے شاپنگ کی، نہ کبھی فرمائش کر کے اسے اپنی پسند کے کپڑے پہننے
کے لیے کہا، نہ کبھی محبت بھرے الفاظ کے پھول اس پر نچھاور کیے حالانکہ شادی کے دو سال بعد اس
نے دانی اور مانی کو اپنی بیویوں کے گرد چکور کی طرح منڈلاتے دیکھا۔
کبھی فرمائش کر کے اپنی پسند کے کپڑے پہنائے جا رہے ہیں۔ کبھی پھول آ رہے
ہیں۔ کبھی گھوما جا رہا ہے زبردستی میٹھے پان کھلائے جا رہے ہیں شاعری ہو رہی ہے مگر اس نے
ہمیشہ یہی سوچا کہ احمد علی سنجیدہ ہے محرومیوں نے اس کی ہنسی اس کی شوخیاں چھین لی ہیں۔ بچپن
کے دکھوں کا سایہ ابھی تک اسے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کا شیشہ چٹخا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے
کبھی کوئی گلہ نہ کیا، شکوہ نہ کیا، فرمائش نہ کی اور زندگی کے دس برس بڑی خوشی سے دبے
پاؤں بیت گئے۔

ان دس برسوں میں وہ دو بچوں کی ماں بن گئی وہ فلیٹ چھوڑ کر کوٹھی میں آ گئے۔ احمد
علی نے گاڑی خرید لی اور ثنا ملک نے اپنے سے دس برس چھوٹے اپنے چاچا کے بیٹے سے
شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ چونکہ خاندان میں اس کا ہم پلہ کوئی لڑکا نہ تھا اس لیے اس نے
مزے سے سروس کر لی اور کالج میں لیکچرار ہو گئی۔ چھٹیاں وہ ہمیشہ ان کے پاس گزارتی تھی۔
گاؤں میں تو بس وہ دو تین دن ہی رہتی تھی اور دوسری بار جب وہ ہاسپٹل گئی تو تو اماں کے
ساتھ ثنا نے بھی اس کی اتنی خدمت کی تھی شاید سگی نند ہوتی تو وہ بھی نہ کرتی۔ وہ بھی تو اس کے
چاؤ چونچلے نندوں سے بڑھ کر اٹھاتی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ دنیا بھر کی نعمتیں اس کے
سامنے ڈھیر کر دے۔ وہ آتی تو احمد علی کے چہرے پر بھی رونق آ جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی
ہنستی تھیں اور چہرہ بھی مسکراتا تھا۔ مگر آج سے پہلے اس نے اس تبدیلی کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔
یہ انکشاف تو اس پر آج ہوا تھا۔
یہ تو اسے آج پتا چلا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت
کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو شیلف میں کتابیں ترتیب
سے رکھتے ہوئے اسے علی کی ڈائری ملی تھی۔ اس سے پہلے تو ڈائری اس نے کبھی نہیں دیکھی
تھی۔ وہ اپنی تمام چیزیں ڈاک، اور ضروری کاغذات دراز میں رکھتے تھے جو ہمیشہ لاک رہتی
تھی۔ آج شاید جلدی میں ڈائری بھول گئے ہیں اس نے بغیر کسی تجسس اور شک کے اسے کھولا
تھا کہ دیکھوں تو بھلا علی اپنی ڈائری میں کیا لکھتے ہیں۔ خوب صورت شعر گھر کا حساب کتاب یا

پھر کوئی دلچسپ بات۔ پھر جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکلتی چلی گئی۔ یہ کیسے انکشاف
تھے جو اس کی ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔
"نہیں۔" اس نے ڈائری شیلف پر رکھ دی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا ثنا میرے ساتھ
فریب نہیں کر سکتی۔" مگر کوئی اس کے سینے میں برچھیاں مارتا رہا۔
"تو تم نے بھی ثنا ملک مجھے بیوقوف بنا کر اپنا کام نکالا ہے۔ تم! جس پر مجھے اندھا
اعتماد تھا۔ تمہارے بارے میں اگر کوئی اور مجھ سے یہ بات کہتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر اب
تو سب کچھ کھلی کتاب کی طرح سامنے موجود ہے ایک ایک جذبہ لفظوں میں پرویا ہوا۔"
ثنا اور احمد علی کی شادی نہیں ہو سکتی تھی خود ثنا ہی نے تو اسے بتایا تھا کہ اس کے بابا
اس بات پر اسے زندہ دفن کر دیں گے۔ بھلا ایک ہاری کا بیٹا اور ملکوں کی بیٹی! "یہ کیسے ممکن تھا
ثنا ملک...... تب تم نے سوچا اپنے محبوب کو اپنی دوست کے حوالے کر دو تاکہ راستے تمہارے
لیے کھلے رہیں تمہاری محبت تر و تازہ رہے۔ تم ایک دوسرے کو دیکھتے رہو ملتے رہو۔"
وہ خود ہی کہانی کے تانے بانے بنتی رہی۔
"کاش...... ! کاش تم میں ذرا سی بھی اخلاقی جرأت ہوتی ثنا ملک اور تم مجھے اپنے
اس محبت کے راز میں شریک کر لیتیں تو میں پھر دیکھتیں تم کہ میرے دل میں کتنی وسعت ہے،
مگر تم نے تو میرے ساتھ فریب کیا ہے، مجھے دھوکا دیا ہے۔"
اس نے زور سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔ اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اور آنکھوں کے آگے
دھند چھا رہی تھی۔

نہ کوئی نقش ہے سالم نہ کوئی عکس کہ ہم
کس نظر، کس چہرے پہ اعتبار کریں

گیٹ پر زور زور سے ہارن بجا مگر وہ یونہی پتھر بنی بیٹھی رہی۔ شاید بچے اسکول
سے آ گئے تھے۔ احمد علی خود ہی بچوں کو اسکول سے لاتا تھا۔ شرفو گھر پر ہوتا تو وہ، نہیں تو وہ خود
ہی گیٹ پر جا کر بچوں کو لے آتی تھی اور احمد علی وہیں سے واپس دفتر چلا جاتا تھا مگر آج ہارن
مسلسل بج رہا تھا اور وہ ساکت بیٹھی تھی۔ شرفو بھی ابھی ابھی چھٹی لے کر باہر گیا تھا۔ چھوٹا
گیٹ کھلا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بچے اسے پکارتے ہوئے اندر آ گئے۔ احمد علی ان کے پیچھے تھا۔
"کیا ہوا ربیعہ! تم یہاں بیٹھی ہو اور میں پریشان ہو گیا تھا کہ نہ جانے کیا حادثہ ہو

گیا ہے۔ گیٹ کھلا ہے اور......"

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ شخص کتنا بڑا ریاکار ہے اور ایک طویل عرصے سے ایک بڑا راز چھپائے ہوئے ہے۔

"کیا طبیعت خراب ہے؟"

"ہاں سر چکرا رہا ہے۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ بچے اس سے چمٹے جا رہے تھے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"مجھے تو آفس جانا ہے۔ ایسا کرنا تم ڈاکٹر کے پاس چلی جانا۔ میں وہاں جا کر آفس کا ڈرائیور اور گاڑی بھیج دیتا ہوں۔" "اور ہاں ثنا کا فون آیا تھا۔ اس کا ٹرانسفر یہاں ہو گیا ہے وہ پرسوں آ رہی ہے مانی بھائی نے کام کر ہی دیا۔"

"ثنا کا ٹرانسفر۔" اس نے زیرِ لب کہا اس کے لیے وہ کب سے کوشش کر رہی تھی اور خود اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ثنا ٹرانسفر ہو کر یہاں آ جائے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی اس نے دانی بھائی سے کہہ کر سفارش کروائی تھی۔

"ربیعہ۔" اسے یوں ساکت بیٹھے دیکھ کر احمد علی اس کے قریب چلا آیا۔ "چلو تم تیار ہو جاؤ میں خود تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ آفس فون کر دیتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے ریزہ ریزہ ہوتی ہمتوں کو یکجا کیا۔ "میں اب ٹھیک ہوں۔" "یونہی چکر آ گیا تھا۔"

"وہ اس وقت تنہا رہنا چاہتی تھی اسے اس شخص کا قرب نہیں چاہیے تھا۔ جو مسلسل دس سال سے اس کے ساتھ ایک ڈمی کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ جذبات سے عاری۔

"اچھا بائے۔ آؤ بیٹا گیٹ بند کر لو۔"

بچے اچھلتے کودتے اس کے پیچھے نکل گئے۔

"کس قدر اجنبی، کس قدر اوپرا لگ رہا ہے یہ شخص میری طبیعت خراب ہے۔ میں جو اس کی بیوی ہوں مگر اس نے کسی تشویش کا کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن یہ میں آج اس سے اس بات کی توقع کیوں کر رہی ہوں۔ جو پچھلے دس سالوں میں، میں نے نہیں کی۔" اس نے دکھے دل سے سوچا۔

یہ توقع تو اس نے سہاگ رات ہی ختم کر لی تھی۔

ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ مرد اس سے شاعرانہ باتیں کرے۔ اس کے حسن کو، اس کی خوبصورتی کو اس کے سلیقے کو سراہے۔ وہ ہمیشہ اس کی طرف سے خوب صورت الفاظ میں اپنی تعریف کی منتظر رہتی ہے۔ لیکن اس نے اس خواہش کو کبھی باہر آنے ہی نہیں دیا۔ دل ہی دل میں کہیں دفن کر دیا اور اس کی بے نیازی کو اس کے مزاج کا ہی حصہ سمجھتی رہی۔ اور یہ شخص کس قدر تھڑدلا ہے اس کے دل میں ذرا بھی وسعت اور گنجائش نہیں ہے۔

وہ خود ہی اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔

"یہ ہے تمہاری وقعت ربیعہ احمد علی۔ تم تو شطرنج کا محض ایک فالتو مہرہ ہو یا پھر وہ کیچوا جسے شکاری مچھلی کو پھانسنے کے لیے کانٹے پر لگاتا ہے۔ اس شخص نے کبھی تمہارے لیے ایک خوب صورت لفظ تک نہ کہا۔ کبھی تمہیں نہ سراہا۔ ان خوب صورت آنکھوں کی جن پر لڑکیاں مرتی تھیں نہ سراہا۔ ایک بار بھی تعریف نہ کی اور اس کی ڈائری ایسے ہی سینکڑوں خوب صورت الفاظ اور گنگناتے جذبوں سے بھری ہوئی ہے اس لڑکی کے لیے جس سے بظاہر اس کا کوئی ناتا نہیں، کوئی خونی رشتہ نہیں ایسے خوبصورت لفظ جو شاید کسی لغت میں نہ ہوں ان سارے خوبصورت الفاظ پر، ان سب حسین جذبات پر تو میرا حق تھا۔ تم غاصب ہو احمد علی۔ یہ میرا حق تھا۔ جو تم نے کسی اور کو دے دیا میں تمہیں اس کے لیے معاف نہیں کروں گی۔"

وہ ثنا ملک جتنی حسین نہیں تھی لیکن اسے خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ اس کے حسن کا اپنا ایک رنگ تھا، اپنی کشش تھی اپنی انفرادیت تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ تو ویسی ہی تھی۔ دس سال پہلے کی طرح ان دس سالوں نے اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی پاکیزگی اور معصومیت تھی جسے دیکھ کر ایک بار احمد رضا نے کہا تھا:

She is innocent like a baby.

اس کے ہونٹ اب بھی اتنے ہی دلکش تھے۔ اور اس کی آنکھیں اب بھی ویسی ہی ساحر تھیں۔ بلاشبہ ان پر شاعری کی جا سکتی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ اسے سراہا جائے۔ پسند کیا جائے اور اس سے محبت کی جائے۔ لیکن ساری زندگی بہت سارے لوگوں کی محبتوں سے دامن بھرنے کے باوجود وہ اس شخص کی محبت سے محروم رہی تھی۔ جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس کی کسی ادا نے اسے موم نہیں کیا تھا۔ نہ اس کی خدمت نے نہ اس کے خلوص

نے اور نہ اس کے حسن کی گرمی سے وہ پگھلا تھا۔

"وہ اپنی پرانی محبت میں اتنا ہی راسخ ہے جتنا پہلے تھا اور اماں، تمہاری ساری دعائیں اکارت گئیں۔"

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں لیکن آنسوؤں کا ایک منا سا قطرہ بھی نہیں تھا جو ان کی پیاس بجھاتا۔

"تم سچ کہتے ہو دانی بھائی، کہ اس دنیا کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور یہاں لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے لگائے پھرتے ہیں۔ ثنا ملک اور احمد علی کی طرح۔ لیکن میں میں ربیعہ احمد علی اپنی اس بے قدری اور بے وقعتی کا ضرور بدلہ لوں گی۔ تم سے ثنا ملک اور تم سے بھی احمد علی میں اپنا قتل تمہیں معاف نہیں کروں گی ثنا ملک۔ اپنی انا کا قتل، میں ایک ایک فرد کو تمہارا چہرہ دکھاؤں گی کہ یہ ہے ثنا ملک۔ جس نے دوستی کے پردے میں دھوکا دیا جس نے اپنی دوست کے شوہر کو اپنی محبت میں پھانسا۔ میں تمہارا مکروہ چہرہ سب کو دکھاؤں گی۔ پھر احمد علی تمہیں چھوڑ کر اس گھر سے چلی جاؤں گی۔ تم اس قابل نہیں تھے کہ ایک حساس، شریف لڑکی کے شوہر ہوتے۔ تمہاری عزت خاک میں مل جائے گی ثنا ملک اور تم دونوں ایک دوسرے سے منہ چھپاؤ گے کہ یہی میرا قصاص ہے یہی خون بہا ہے اور یہی میرے قتل کا خراج ہے۔ تم مجھے، میری انا کو قتل کر کے اتنی آسانی سے بری نہیں ہو سکتے۔

اس کی آنکھوں میں آگ سی دہکنے لگی۔ نفرت کی، دشمنی کی، انتقام کی آگ۔

"ممی، ممی۔" دونوں بچے پردے کے پیچھے سے چہرہ نکال کر شرارت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے چونک کر دیکھا ابھی تک یونیفارم میں تھے۔ اس کی زخمی انا تڑپ رہی تھی۔ ہمت کر کے اٹھی مگر اسے یوں لگا جیسے ابھی گر جائے گی۔ نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی ہو۔ پھر بھی اس نے خود کو مضبوط کر کے بچوں کے کپڑے تبدیل کرائے، دودھ گلاسوں میں ڈال کر ٹیبل پر رکھا اور ان سے کہا۔

"ادھر آؤ دودھ پی لو۔"

بچے ہنستے کھیلتے، کودتے ٹیبل کے پاس کھڑے ہو گئے اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے بے خبر دونوں زور زور سے بول رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔

"بیٹا پلیز شور نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"یس ممی پرامس۔ اب شور نہیں کریں گے۔"

وہ خود کو سنبھالتی ہوئی باہر آئی تھی گھنٹی بجی۔ "ڈرائیور ہوگا" اس نے سوچا اور فرخ کو آواز دی۔

"جاؤ بیٹا ڈرائیور سے کہہ دو کہ ممی کو اب ڈاکٹر کے ہاں نہیں جانا۔"

"فرخ اور سہیل دونوں باہر دوڑے۔

"تو یہ طے ہے احمد علی کہ اب مجھے اس گھر میں نہیں رہنا" اس نے کچن کی طرف جاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹی کو دبایا۔ مگر جانے سے پہلے ایک بار تو میں تم سے ضرور پوچھوں گی ثنا ملک، تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔"

اس کا دل و دماغ جیسے کوئی چکی کے پاٹوں میں پس رہا تھا۔ پورے دس برس اس نے دھوکے میں گزار دیے تھے۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو مکمل طور پر اس کا نہیں تھا۔ بلکہ سرے سے اس کا تھا ہی نہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم کیا تھا ثنا نے اس کے ساتھ۔ اسے ایک نامکمل آدھے، بٹے ہوئے آدمی کے حوالے کر کے۔

کچن کے دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے پورے گھر پر نظر ڈالی۔ "یہ گھر جس کی سب تعریفیں کرتے ہیں اور جسے سنوارنے میں میں نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ یہ گھر بھی مجھے چھوڑنا پڑے گا۔ کیا اس گھر اور احمد علی کو چھوڑ دینا آسان ہوگا ان دس سالوں میں تو میں ان کی عادی ہو گئی ہوں۔

وہ سوچتی رہی مگر پھر بھی اس کا فیصلہ اٹل رہا۔ وہ کچن میں نیم دلی سے کام کر رہی تھی اور ہر گزرنے والا لمحہ اس کے فیصلے کو مضبوط کرتا گیا۔

"نہیں میں بٹوارہ نہیں کر سکتی۔" اس نے اپنا تجزیہ کیا۔ "مجھے اس بٹے ہوئے مرد کے ساتھ نہیں رہنا جو مکمل کسی کا بھی نہیں نہ میرا اور نہ ثنا ملک کا میں اپنے دس سالوں کا حساب کس سے لوں؟ احمد علی سے یا ثنا ملک سے۔"

وہ کچن سے کام کر کے اٹھی اور نڈھال سی آ کر اپنے بیڈ پر گر گئی لمحے بوند بوند کر کے وقت کے تھال میں گرتے رہے۔ پھر شاید دو بج گئے۔ بچوں نے شور مچایا۔

"ابو آ گئے...... ابو آ گئے۔"

وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ احمد علی کپڑے بدل کر بچوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا

کھانے کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے کھانا لگا دیا۔ سب کچھ روٹین کے مطابق تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ مگر آج اسے یہ سب کچھ بڑا مشینی سا لگا جیسے وہ کوئی کمپیوٹر ہو جو ہر روز ہی کام کرتا ہے جو اسے فیڈ کیا جائے۔

اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے احمد علی نے اسے دیکھا۔ ''تم نے ڈرائیور کو واپس کیوں بھیج دیا تھا؟ میرے خیال میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔''

''میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' اس نے مختصراً کہا اور بچوں کی پلیٹوں میں کھانا ڈالنے لگی۔ احمد علی نے پھر کوئی بات نہ کی اور کھانا کھا کر اٹھ گیا۔

کس قدر رسمی سا انداز تھا پوچھنے کا۔ جب وہ میکے میں تھی تو اس کے ذرا سے سر درد پر بھی سب لوگ کتنے پریشان ہو جاتے تھے۔ مگر یہاں اس گھر میں اس نے خود کو احمد علی کی بے نیازی کا عادی بنا لیا تھا۔'' آج یہی بے نیازی اسے کچوکے لگا رہی تھی اور وہ اندر سے زخم زخم ہوئی جاتی تھی۔

اس نے برتن سمیٹے اور بچوں کو آرام کرنے کی تلقین کر کے خود ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ پھر وی سی آر پر فلم لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے فلم دیکھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ مگر اس کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ مچی تھی۔ جو شکست و ریخت ہو رہی تھی وہ اس ہلچل کی آوازیں نہیں سننا چاہتی تھی۔ بچوں نے پہلے تو ڈرتے ڈرتے اپنے بیڈروم کے اندر سے جھانک کر دیکھا پھر چپکے سے آ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تو وہ خاموشی سے بیٹھے رہے پھر ان کے نہ ختم ہونے والے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''ممی یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔''

''یہ سپاہی ہے نا ممی۔''

''یہ کون سا باغ ہے۔''

''یہ شالا مار ہے......'' ''نہیں یہ اقبال پارک ہے۔''

مگر وہ بچوں کی باتیں سن رہی تھی۔ نہ ہی فلم دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن تو بس خالی ہو رہا تھا۔

''ممی۔'' فرخ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔ ''یہ عورت کیوں رو رہی ہے۔''

عورتیں تو شاید رونے کے لیے ہی بنی ہیں۔ ان کے نصیب ہی ایسے ہوتے ہیں۔

اس نے سوچا اور انہیں ڈانٹا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو جاؤ جا کر سو جاؤ۔''

''ہم بھی فلم دیکھیں گے۔''

''یہ آرام کا وقت ہے۔''

''تو پھر آپ کیوں نہیں آرام کرتیں۔''

''وہ جھٹ پر اتر آئے تو اس نے اٹھ کر وی سی آر بند کر دیا دونوں کو لے کر ان کے بیڈروم میں آ گئی۔ اور ان کے پاس ہی لیٹ گئی۔

وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک صدی بن کر گزر رہا تھا۔ اسے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب شام ہوئی کب رات ہوئی اور کب صبح ہو گئی۔ سب کچھ روٹین کے مطابق ہوتا رہا۔ دو دن اسی کیفیت میں گزر گئے۔ وقت جیسے اس کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ اور لمحے آگے سرک ہی نہیں رہے تھے۔ پھر لمحوں کی یہ چٹان سرکی۔ احمد علی نے آفس سے آ کر یاد دلایا۔ آج شام ثنا آ رہی ہے۔''

''اچھا۔'' اس نے سوئی سی کیفیت میں سنا۔

تو وہ لمحہ آخر قریب آ ہی گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ نفرت کی وہ چنگاری جو تین دن قبل اس کے اندر سلگی تھی۔ پھیلتے پھیلتے ایک آتش فشاں بن گئی تھی اور اب لاوا اس آتش فشاں سے نکل کر اس کے دل کی زمین پر گر رہا تھا۔

احمد علی اور بچے ثنا کو لینے چلے گئے۔ تو اس نے اٹھ کر ایک اٹیچی میں اپنے اور بچوں کے کپڑے رکھے۔ بچوں کی چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں ان کے سکول کے بیگ اور سارا سامان اکٹھا کر کے اس نے کمرے کے وسط میں رکھ دیا۔ اس کا دل جیسے کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔ اگر احمد علی نے بچے لے لیے تو؟'' اس نے خوف سے جھرجھری سی لی۔ ''نہیں وہ اتنا ظالم اتنا شقی القلب نہیں ہو سکتا۔'' اس نے دل کو اطمینان دلایا۔ ''وہ مجھ سے میرے بچے نہیں چھینے گا۔''

وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور ساکت نظروں سے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگی۔

''دھک، دھک۔'' دل کی دھڑکن کے سوا کوئی اور آواز نہ تھی۔ اور اندر جیسے لمحہ بہ لمحہ سناٹا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ان آخری لمحوں میں اپنے فیصلے کو پرکھ رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی اور دل

اس کی تائید کر رہا تھا کہ اس نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی زخمی انا کے ساتھ اب مزید یہاں نہیں رہ سکتی۔

وہ دونوں ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی۔ پہلے جب کبھی ثنا آتی تھی تو وہ کتنی خوش ہوتی تھی۔ کتنی ڈھیر ساری چیزیں تیار کر کے فریج میں رکھتی تھی۔ پھر احمد علی کے ساتھ اسے لینے ائیر پورٹ جاتی۔ اس روز وہ دونوں رات گئے تک باتیں کرتی رہتی تھیں۔ مگر آج اس پرانی خوشی کی رمق تک اس کے اندر نہیں تھی۔ اندر باہر ہر جگہ بڑا ہولناک سناٹا تھا۔ پھر کار کے ہارن اور بچوں کے شور نے اس سناٹے کو توڑا۔

''آنٹی آ گئیں، آنٹی آ گئیں۔'' بچے شور مچاتے ، دمکتے چہروں کے ساتھ اندر آ گئے۔

وہ اٹھی مگر ٹانگوں نے جیسے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بے آواز دعا مانگی۔ ''خدایا مجھے حوصلہ دے ہمت عطا کر۔'' اور پھر ساری توانائی اکٹھی کر کے جیسے ٹانگیں گھسیٹتی ہوئی باہر کی طرف بڑھی۔

''ربی! یار کہاں چھپ گئی ہو۔'' اسے پکارتے ہوئے ثنا نے اندر قدم رکھا تو اس نے زبردستی ہونٹوں کو پھیلایا اور اس کے گلے لگ گئی۔

''کیا تم کچھ بیمار ہو ربی؟'' اسے الگ کرتے ہوئے ثنا نے غور سے اسے دیکھا۔

''نہیں تو۔''

''پھر اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو ڈیئر۔''

وہ اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ احمد علی باہر ہی رہ گیا تھا۔

''تو بالآخر ٹرانسفر کا مسئلہ بھی حل ہوا اور اس کے لیے حقیقت میں دانی بھائی نے بہت کوشش کی ہے۔'' ثنا نے اطمنان سے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

مگر وہ سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کیوٹکس کھرچ رہی تھی۔

''اور سناؤ وہاں گھر میں تو سب لوگ خیریت سے ہیں نا۔ پچھلے دنوں دانی بھائی ملے تھے۔ کہہ رہے تھے، ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اب کیسے ہیں وہ؟ اور وہ تمہاری چھوٹی بھابھی دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے والی تھیں کچھ خبر۔''

مگر اس کا دھیان جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ ایک اذیت ناک فیصلے کی صلیب

اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ ثنا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''اے...... سنو کہاں ہو تم۔''

''کہیں نہیں۔''

''یہاں تو نہیں ہو۔''

''یہیں تو ہوں تمہارے سامنے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

''اے ربو! ادھر دیکھو میری آنکھوں میں۔ جھوٹ نہیں چلے گا۔ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''نہیں، تم کچھ پریشان ہو۔'' ثنا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور نرمی سے کہا۔ ''مجھے بھی نہیں بتاؤ گی ربی۔''

اس کے لہجے میں وہی دردمندی رچی تھی کیسی ہمدردی تھی کہ اسے لگا، جیسے کسی نے بھرے ہوئے چھالے پر نشتر رکھ دیا ہو اور ابھی یہ چھالا پھوٹ بہے گا۔ اس کی کھنچی ہوئی آنکھوں میں نرمی اتر آئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور اس کے گلے لگ کر چیخیں مار مار کر روئے۔

''ہاں میں پریشان ہوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہوں اور میرے وجود کو جیسے نوک دار بھالوں سے چھیدا جا رہا ہے۔'' اس کا جی چاہا وہ اپنی اس اکلوتی دوست کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے مگر یہ کیسی دوست ہے۔ ہمدرد لہجہ، میٹھے لفظ لیکن اندر سے میری ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی۔ میری انا کو مجروح کرنے والی۔'' اس نے ایک نظر ثنا کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی اور عین وقت پر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''نہیں تو بھلا، مجھے کیا پریشانی ہو گی۔''

''نہیں، کچھ تو ہے ربی، تم کچھ چھپا رہی ہو۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولی اور دل میں خود کلامی کی۔ ''اور بھلا میں تم سے کیا چھپاؤں گی ابھی تمہیں سب کچھ پتا چل جائے گا تم خود ہی جان جاؤ گی کہ میں تلوار کی دھار پر اپنا وجود رکھے بیٹھی ہوں۔'' پھر اٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''چلو تم جا کر آرام کر لو میں چائے لگواتی ہوں۔ سفر کی تھکاوٹ ہو گی۔''

''بھئی سفر ہی کتنا تھا۔ ایک گھنٹہ تو سارا لگا میں صرف منہ ہاتھ دھوؤں گی اور پھر

ادھر ہی آرہی ہوں۔تمہارے پاس کچن میں۔"

"نہیں تم یہیں بیٹھو علی آتے ہوں گے گپ شپ لگاؤ۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی مگر برآمدے سے گزرتے ہوئے احمد علی نے اسے روک لیا

"سنو ربی یہ سامان کیسا بیڈروم میں پڑا ہے۔تم کہیں جارہی ہو۔"

وہ ٹھٹکی۔"ہاں میں کچھ دنوں کے لیے پنڈی جارہی ہوں۔"

"مگر......" احمد علی کچھ پریشان ہوگیا۔"اس وقت؟"

"نہیں صبح جاؤں گی۔"

"مگر ربیعہ ثنا آئی ہوئی ہے۔تم چند دن بعد چلی جانا۔"

"چند دن بعد......کیا چند دن بعد ثنا چلی جائے گی اس نے تو اب یہیں رہنا ہے۔"

"اگر تمہیں جانا ہی تھا تو پہلے بتا دیتیں۔ثنا کچھ دن بعد آجاتی۔"

"میں کوئی ثنا کو جانے کے لیے تو نہیں کہہ رہی۔وہ یہاں رہے یہ اس کا اپنا گھر ہے۔شرفو بھی کل تک آجائے گا۔کھانا پکا دیا کرے گا۔"

"لیکن وہ یہاں تنہا کیسے رہ سکتی ہے۔"

"کیوں؟ کیا آپ اس کے بھائی نہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"ربیعہ! پلیز کیا تم اپنا پروگرام کچھ دنوں کے لیے ملتوی نہیں کرسکتیں؟" احمد علی نے التجا کی۔

"نہیں۔" اس نے کہا اور کچن کی طرف چل دی۔احمد علی وہیں الجھا الجھا کھڑا تھا۔

"اب تو صرف لمحوں کی بات ہے اور پھر تم خود ہی جان جاؤ گے احمد علی کہ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔اور ثنا ملک تم بھی...... جب تمہارے اس اونچے شملے والے باپ کو پتا چلے گا کہ تم ایک باری کے بیٹے سے محبت کرتی ہو تو پھر برادری میں اس کی کیا عزت رہ جائے گی؟ جس عزت کی خاطر تم نے مجھے اپنی بے حد عزیز دوست کو قربان کردیا وہ عزت تو میری ایک ہی بات سے لمحوں میں ختم ہو جائے گی۔" ربیعہ سوچتی اور کام کرتی رہی۔

ٹرالی میں چائے کا سامان لگا کر وہ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔احمد علی خاموش بیٹھا تھا اور بچے ثنا کی گود میں گھسے جارہے تھے۔

"آنٹی آپ کون سی کہانی سنائیں گی؟"

وہ گدھے اور شیر والی نا۔"

"نہیں،شہزادی گل رخ والی۔"

"آنٹی کو تنگ مت کرو۔" ربیعہ نے انہیں ڈانٹ دیا اور پلیٹ ثنا کی طرف بڑھائی۔"لو ثنا کچھ لے لو۔"

اس وقت وہ غیر معمولی طور پر پرسکون نظر آرہی تھی۔ربیعہ نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا نمکو ڈالا، خاموش بیٹی ثنا اور احمد علی کی طرف دیکھا اور ثنا کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایک ایک دانہ ٹونگنے لگی۔کئی بار اس نے اپنی ہمتوں کو یکجا کیا کئی بار اپنے حوصلوں کو آواز دی۔لیکن ہر بار حوصلے کی طنابیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔مناسب الفاظ اس کی گرفت میں نہیں آرہے تھے۔وہ کیسے بات شروع کرے کسی طرح مدعا بیان کرے۔

"اب میں مزید برداشت نہیں کرسکتی۔" چائے بناتے ہوئے اس نے سوچا۔"مسلسل تین دن سے برداشت کرتے کرتے میرا ذہن چٹخنے لگا ہے اور اگر میں اب بھی خاموش رہی تو میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

اب بچے احمد علی کے گلے میں بانہیں ڈالے کوئی فرمائش کر رہے تھے اور احمد علی ہنس رہا تھا۔ان سے لاڈ کر رہا تھا۔

اس کے دل میں کانٹا سا چبھا"کیا مجھے اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ میں ان بچوں کو باپ کی شفقت سے محروم کردوں، لیکن میرے پاس کوئی متبادل راستہ بھی تو نہیں ہے۔اس طرح بٹ کر رہنا بھی تو ممکن نہیں۔جو فیصلہ ہو چکا ہے"وہ صحیح ہے۔" دکھ تو دونوں ہی راستوں پر اس کا گھیراؤ کیے کھڑے تھے۔یہ یا وہ، دونوں طرف صلیبیں تھیں اور کسی ایک صلیب پر تو اسے چڑھنا ہی تھا۔پھر وہ اپنا من پسند راستہ کیوں نہ اختیار کرتی۔اس طرح کم از کم اس کی زخمی انا کو تسکین کو ملتی۔

اس نے چائے بنا کر ثنا کی طرف کھسکا دی اور مناسب لفظوں کی تلاش میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

وہی خوب صورت دلفریب چہرہ، آج سے دس سال پہلے والا وہی مغل شہزادیوں والا وقار، وہی قاتل ساحر آنکھیں لیکن ان آنکھوں کی چمک بجھی بجھی سی تھی۔ایک گہری اداسی ان آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔آنکھوں کے گرد باریک باریک لکیریں پڑی تھیں۔یہ اداسی

یہ انجانا سا کرب، یہ سب کیا ہے۔ شاید پہلی بار وہ اسے اتنے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ یونہی دیکھتے دیکھتے وہ اپنا اور اس کا موازنہ کرنے لگی۔

دونوں ہی خالی ہاتھ تھیں۔

کیا ملا تھا اسے اور خود اس نے کیا پایا تھا۔

وہ احمد علی کی بیوی تھی۔ اس کے بچوں کی ماں تھی۔ اس کا نام اس کے نام کے ساتھ لگا تھا۔ وہ اس کی ہر چیز کی مالک تھی سوائے اس چھوٹے سے گوشت کے لوتھڑے کے جسے دنیا دل کہتی ہے۔

اور ثنا، اس کے پاس صرف اس کی محبتیں تھیں چاہتیں تھیں، جذبے تھے اور علی کا وہ دل جو اسی کی محبتوں سے سرشار تھا۔ معلوم نہیں دونوں میں کون خوش قسمت تھا اگر زندگی کے دس برس اس شخص کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی وہ تشنہ لب تھی تو پیاسی ثنا بھی تھی۔

بھرے سمندر کے کنارے وہ خشک ہونٹ لیے کھڑی تھی اور یہ کتنا بڑا عذاب تھا۔

کبھی ثنا کا پلڑا آسمان سے جا لگتا اور کبھی اس کا۔

شاید وہ دونوں ہی گھاٹے میں تھیں۔

ربیعہ نے دکھی دل سے یہ سب سوچا اور مڑ کر احمد علی کی طرف دیکھا۔ جو ہنس رہا تھا مگر اس ہنسی کے باوجود وہ سوگوار تھا اور سوگواری کا یہ غبار اس کے سارے وجود کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھے۔

ڈائری کے ورق اس کی آنکھوں کے سامنے پھڑپھڑانے لگے۔ ”میں اسے پا نہیں سکتا پھر بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔ میں نے دل کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ ثنا ملک، تمہارے لیے نہیں ہے تم اس کے لیے نہیں ہو پھر بھی، پھر بھی یہ دل اس کے لیے مچلتا ہے اور وہ کہتی ہے میں بزدل نہیں ہوں۔ پھر بھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی کہ مجھے اپنے ماں باپ کی عزت بھی بڑی پیاری ہے اور شاید یہ اس کی عظمت ہے۔ میں تو پاگل ہوں جو اسے انہونی باتوں پر اکساتا ہوں۔ آدمی محبت میں کتنا بے اختیار ہوتا ہے۔“

ربیعہ نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ اسے یاد آیا احمد علی نے لکھا تھا۔

”اور جب وہ آتی ہے تو ایک ننھی سی خوشی، ایک چھوٹی سی مسرت کی کونپل میرے دل کی بنجر زمین سے اپنا سر اٹھا لیتی ہے۔ میں اسے چھو نہیں سکتا، پا نہیں سکتا، مگر دیکھ سکتا ہوں

اور کبھی کبھی یہ مجھے نئے سرے سے زندہ کر دیتی ہے میں پھر سے جی اٹھتا ہوں۔“

نہ جانے کیوں، کیسے، ربیعہ کی سوچ کا دھارا مڑ گیا۔

”کیا لیتے ہیں وہ دونوں میرا؟ بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہی تو ہیں۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔ اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ نارسائی کے کرب میں دونوں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ ہوا میں جھولتے ترازو کے پلڑے برابر ہو گئے۔ اسے یوں لگا جیسے فیصلے کی دیوار میں دراڑیں سی پڑ گئی ہوں۔ اس کا سدا سے ہمدرد اور مہربان دل اس کے لیے اور احمد علی کے لیے نرم پڑ گیا۔

”سنو ربی۔“ ثنا نے خالی پیالی ٹرالی میں رکھی۔ ”یار تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ تمہارا دل چاہ رہا ہے نا میکے جانے کو تو آرام سے جاؤ۔ میں کچھ دنوں کے لیے ہوسٹل شفٹ ہو جاؤں گی۔“

شاید احمد علی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ جا رہی ہے۔

”مگر تم یہاں کیوں نہیں رہتیں؟ آخر یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی آ گئی۔

”یہ مناسب نہیں ہے ربی۔ تمہاری عدم موجودگی میں یہاں رہنا! تمہیں ہمارے رشتے داروں کا نہیں پتا۔“ ثنا نے نگاہیں جھکا لیں۔

دونوں کس قدر مجبور تھیں۔

ربیعہ کا دل تڑپ اٹھا اور اس کا مضبوط فیصلہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ اس نے سوچا ”میں یہ ننھی سی خوشی ان سے نہیں چھین سکتی۔ میں تو ہمیشہ سے ہی بہت کمزور ہوں اور کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔“

پھر اس کے غنی دل نے فیصلہ سنا دیا۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے اور لہریں کناروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔

”کہاں چلی ربی؟“ ثنا نے پوچھا۔

”سامان کھولنے۔“ اس نے یک دم اپنا رخ موڑ لیا۔

”مگر کیوں ربی میری فکر نہ کرو۔“

”بس میں نہیں جا رہی۔ چھٹیوں میں جائیں گے اکٹھے۔“ اس نے مڑ کر ان کے

چہرے پر پھیلتے خوشی کے رنگوں کو نہیں دیکھا۔ سیلاب اب کناروں سے باہر آنے کو تھا۔

وہ تیزی سے باہر نکلی اور باتھ روم میں گھس گئی پھر آنسوؤں کا سیلاب سارے بند توڑ کر آنکھوں کی راہ بہہ نکلا، تین روز میں وہ روئی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ بلکہ اس کا سارا وجود ہی جل رہا تھا۔ تپ رہا تھا اور اب تیزی سے بہتے آنسو اس جلن کو کم کر رہے تھے۔

''کاش میں بے خبر رہتی ساری زندگی، آخری لمحے تک لیکن اب یہ آگہی کا عذاب اسے جھیلنا تھا تنہا، اکیلے ساری عمر۔''

''میرے اللہ مجھے حوصلہ عطا کرنا اور میں نے تمہیں اپنا خون بہا معاف کیا ثنا ملک اور احمد علی۔ اپنا قصاص واپس لیا اور اپنے حقوق بخش دیے۔'' اس نے جلدی جلدی پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ لیکن آنسو اسی تواتر سے بہتے جا رہے تھے۔ اور وہ نفرت جو تین روز سے ہی اس کے سارے وجود میں زہر کی طرح پھیل گئی تھی، ڈھل رہی تھی، ختم ہو رہی تھی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی اور اسے ترس آ رہا تھا۔ خود پر، ثنا پر اور احمد علی پر کہ وہ تو ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ صدا کی احمق اور بیوقوف لڑکی۔
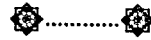
میرے نجم میرے خواب کے روبرو

''تمہیں کیا دکھ ہے عاشی؟''

''مجھے!'' عائشہ نے چونک کر سر اٹھایا اور ہنسی۔ ''مجھے بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے۔''

لیکن اپنی ہنسی کا کھوکھلا پن خود اس سے چھپا نہ رہ سکا اور اس نے کن اکھیوں سے رومانہ کو دیکھا جس نے اپنے دونوں بازو اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹ رکھے تھے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹیکے نہایت غور سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے ٹپٹا کر نظریں جھکا لیں۔ تو کیا۔ تو کیا میری پریشانیوں کا عکس میرے چہرے سے جھلکنے لگا ہے جو۔

''ہاں یہی تو سوچنے والی بات ہے نا عاشو! کہ تمہیں بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو۔''

''مجھے کوئی دکھ نہیں ہے روما!'' اب کے اس نے قدرے اعتماد سے کہا اور مسکرا دی۔ ''تمہارا وہم ہے۔''

''نہیں عاشی کوئی بات ہے ضرور جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ تم نے کبھی غور کیا ان پچھلے چند ماہ میں تم کتنی کمزور ہو گئی ہو۔ ذرا آئینہ تو دیکھو کتنی زرد ہو رہی ہو۔ تمہیں کیا ہے عاشو تم اتنی چپ چپ اتنی خاموش اور سنجیدہ کیوں رہنے لگی ہو۔ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے، پلیز کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں روما! بس ایسے ہی شاید عمر کا تقاضا ہے۔''

''نہیں میں نہیں مان سکتی۔''

رومانہ نے حتمی انداز میں کہا۔

اب۔اب وہ!...... کیا بتائے کہ اس کی عمر بھر کی ریاضت رائیگاں جا رہی ہے۔اور وہ۔

اس نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

''عاشی۔آئی۔ایم۔یور فرینڈ۔'' رومانہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

''I know (میں جانتی ہوں۔)''

اس نے نچلے ہونٹ کو بیدردی سے دانتوں تلے کچل ڈالا۔

''مگر کوئی مسئلہ ہو تو نا۔''

''پھر، پھر آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔کیا کالج کا کوئی پرابلم ہے۔کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہے۔''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

اس نے پلکیں جھپک کر بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو روکا اور اس کا دل چاہا وہ اپنی اس بے حد مخلص دوستوں جیسی کزن کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے اور اس سے پوچھے کہ یہ سب کیا ہے اور وہ مگر نہیں، اس نے خود کو سنبھالا کیا کہے گی وہ کیا سوچے گی وہ کہ۔

''عاشو!''

رومانہ نے اس کی بے حد دلکش آنکھوں میں تیرتی نمی کو دیکھا اور بڑی نرمی سے اسکا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا ممی کی یاد یا بھابھی کی کوئی بات؟''

''اوہ نہیں روما۔کچھ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔بس پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔مجھے خود بھی نہیں پتا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔''

ضبط کی لگام اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور آنسو اس کی لمبی گھنی پلکوں پر آ کر اٹک گئے۔

رومانہ نے بہت غور سے اسے دیکھا ان چند ماہ میں وہ بہت کمزور ہو گئی تھی اس کی گلابی رنگت میں زردیاں گھل گئی تھیں۔اور اس کی خوبصورت آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی اور وہ راتوں کو دیر تک جاگتی

تھی۔حالانکہ پہلے تو وہ ایسی نہ تھی۔بہت ہنس مکھ شوخ طبع، کالج سے آ کر کبھی کچن میں گھسی کوئی مزیدار ڈش بنا رہی ہے اور کبھی چھوٹے بچوں کو اکٹھا کیے قہقہے لگا رہی ہے۔اور کبھی بڑے سے کچے صحن میں وکٹیں لگائی جا رہی ہیں اور کبھی چندا اور ببلو کے ساتھ بیڈمنٹن کے مقابلے ہو رہے ہیں مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ چپ چپ رہنے لگی کالج سے آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی کئی بار رومانہ نے جھانک کر دیکھا تھا۔وہ آنکھیں موندے جانے کیا سوچ رہی ہوتی، شاید وہ ایک ہی طرح کی روٹین لائف سے تھک گئی ہے۔

رومانہ نے بڑے خلوص سے سوچا۔

''ایسا کرو عاشی! کالج سے چند دنوں کی چھٹی لے کر پھپھو کے ہاں ایبٹ آباد چلی جاؤ۔ماحول کی تبدیلی سے یہ خواہ مخواہ کی اداسی ختم ہو جائے گی۔''

''خواہ مخواہ کی اداسی؟''

اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور سوچا۔

''تمہیں کیا پتا رومانہ نصیر کہ میں کن عذابوں سے گزر رہی ہوں۔اور مجھے اس پل سراط سے تنہا ہی گزرنا ہے۔اور میں تمہیں اپنی بے حد عزیز اور پیاری سی دوست کو کبھی نہیں بتا سکتی کہ۔

''تو پھر ٹھیک ہے نا کل پرنسپل سے چھٹی منظور کرا لینا۔دونوں چلیں گے مزا آئے گا۔''

''نہیں روما میرا دل نہیں چاہتا۔تم جانا چاہو تو چلی جاؤ۔

''کیوں؟'

''بس ایسے ہی رومی میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔''

''عاشی!'' رومانہ نے بغور اسے دیکھا اور پھر یکایک وہ لرز گئی۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔اس کی اتنی پیاری جان سے عزیز کزن کو ایسی خوفناک بیماری پچھلے دنوں پڑوس میں عزیز صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔بظاہر انہیں کوئی بیماری نہ تھی بس کمزور ہوتے جا رہے تھے اور پھر اچانک ہی پتا چلا کہ انہیں بلڈ کینسر ہے اور۔

''ایسا کرو عاشی! کسی اچھے سے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرا لو۔''

''مگر کیوں؟'' عائشہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ اپنی آنکھوں کے حلقے اور یہ زرد رنگت دیکھی ہے۔"

"یہ حلقے تو اس لیے پڑ گئے ہیں کہ مجھے نیند نہیں آتی، بہت دیر تک جاگتی رہتی ہوں۔"

"نیند نہ آنا بھی تو ایک بیماری ہے ناڈیئر! ایسا کرتے ہیں کل ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، کچھ نہ بھی ہوا تمہیں تو تین چار ٹانک لکھوالینا۔"

"اچھا۔" وہ ہنس دی۔

"مگر یہ ٹانک کس خوشی میں؟"

"سچی میں تمہاری صحت کی طرف سے بہت فکرمند ہوں۔"

"پاگل ہو تم، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ہاں وہ تو نظر آرہا ہے۔"

رومانہ نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا اور بڑے تاسف سے سوچا۔

"یہ میں بھی کس قدر احمق ہوں کہ اس سے پہلے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ اتنی تیزی سے اس کی صحت گر رہی ہے۔لعنت ہو مجھ پر۔" وہ بڑبڑائی۔

"کیا؟" عائشہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا بس۔"

عائشہ لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔

"آل رائیٹ!" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"اگر تمہاری تسلی اس طرح ہوتی ہے تو ٹھیک ہے چلے چلیں گے ڈاکٹر نیلوفر کے پاس لیکن رومی مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں ڈاکٹر کا کام ہے۔"

رومانہ نے جیسے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"صبح کالج سے سیدھی ڈاکٹر نیلوفر کے کلینک آجانا میں وہیں پر ہوں گی۔"

"بہتر!" اس نے آہستگی سے کہا اور اپنے سامنے پڑا میگزین اٹھا لیا، اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔اسے نہایت انہماک سے میگزین پڑھتے دیکھ کر رومانہ نے ٹیبل پر سے فیشن میگزین اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔رات کے کھانے پر کچھ لوگ آرہے ہیں۔ممی نے کہا تھا کہ کچن میں ان کی ہیلپ کراؤں۔"

عائشہ نے سر ہلا دیا اور یونہی بے مقصد ورق الٹتی رہی۔مگر کچھ پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

اسے مطالعے کا کتنا شوق تھا اور رات تک جب تک وہ کچھ پڑھ نہ لیتی اسے نیند نہ آتی تھی مگر اب کتنا عرصہ ہوگیا تھا اسے کچھ پڑھے ہوئے کتاب سامنے کھلی رہتی تھی اور وہ۔

"اوہ میرے خدا!"

اس نے میگزین ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

آخر تم میں کیا بات ہے ڈاکٹر یاور حیات کہ تم میرے ذہن سے نکلتے ہی نہیں ہو اور میں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت تمہارے متعلق سوچتی رہی ہوں اور تم تمہیں شاید علم بھی نہ ہو خبر بھی نہ ہو کہ وہ ایک لڑکی جس کے ساتھ تم بڑی نرمی، ملائمت اور احترام سے بات کرتے تھے وہ پاگل، احمق لڑکی پتا نہیں کیوں ہر وقت تمہارے متعلق سوچتی رہتی ہے اور تمہارا خیال اس کے دل سے جاتا ہی نہیں ہے اور۔اور شاید یہ محبت ہے۔اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا پھر خود ہی ساری جان سے لرز گئی۔یہ عمر کے اس دور میں آکر میں کیوں بھٹک رہی ہوں۔

"ربا!"

اس نے آنکھیں موند کر بڑے خلوص سے دعا کی۔

"ربا! اس کا خیال میرے دل سے نکال دے یوں کہ وہ مجھے کبھی یاد نہ آئے کبھی نہیں۔"

اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہوگئی اور وہ یونہی آنکھیں موندے بہت دیر تک دعا گو رہی، لیکن پھر بھی سکون کہیں نہ تھا۔عجیب سی بے کلی اور بے چینی تھی۔

اے کاش اس روز وہ ہاسپٹل نہ گئی ہوتی اور اگر گئی ہی تھی تو اسے ڈاکٹر یاور حیات نہ ملا ہوتا اور اگر ملا بھی تھا تو یوں اس کے دل و دماغ پر نہ چھایا ہوتا اسے یوں بے بس نہ کیا ہوتا۔

زندگی کیسے مزے میں گزر رہی تھی۔

صبح صبح وہ تیار ہو کر کالج جاتی لیکچر دیتے ہوئے لڑکیوں سے ہلکا پھلکا مذاق کرتی، کولیگز سے گپ شپ لگاتی اور پھر گھر آکر ممی، بھابی اور بچوں کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی

نہ چلتا تھا۔ زندگی میں کہیں کوئی اٹکاؤ یا الجھاؤ نہیں تھا۔

وہ اور حسیب احسن علی کے دو ہی بچے تھے۔ حسیب اس سے بڑے تھے، اور وہ اس نے تو بچپن میں ہی یہ طے کر لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور ممی اور ڈیڈی کی خدمت کرے گی دراصل تایا ابا کے دونوں بیٹے جب شادی کے بعد انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے تو اسے بہت دکھ ہوا تھا اور پھر رومانہ کی شادی کے بعد تو تایا ابا اور آنٹی بالکل اکیلے رہ گئے تھے اور ایسے میں کبھی وہ بیمار پڑ جاتے تو اسے بہت دکھ ہوتا، وہ سوچتی اگر رومی یہاں ہوتی تو ان کی خدمت کرتی یا پھر سلیم اور نعیم بھائی ہی نہ گئے ہوتے تو۔ اور پھر وہ دل ہی دل میں اپنے عہد کو دہراتی کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔ اور پھر یہی ہوا کہ جب کبھی گھر میں اس کی شادی کی بات ہوتی وہ رو رو کر برا حال کر لیتی، ممی اس کی اس حرکت پر بہت چڑتی تھیں۔

"دنیا میں سبھی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، کیا تم سب سے نرالی ہو۔"

مگر اس کی ایک ہی ضد تھی، نہ تو وجاہت حسن کی وجاہت نے اسے متاثر کیا اور نہ ہی نصیر کی بے شمار ڈگریوں نے تب ہار کر سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ حسیب کی شادی ہو گئی۔ شمع بھابھی اچھی بہو اور اچھی بھابھی ثابت ہوئیں۔ حسیب بھائی نے کبھی ممی پپا کو چھوڑ کر جانے کا نہ کہا۔ مگر اس کے ارادوں کی دیوار میں کہیں کوئی دراڑ نہ پڑی۔ کیا پتا۔

وہ سوچتی۔

کیا پتا کب شمع بھابھی حسیب بھائی کو لے کر چلتی بنیں۔ آخر یہی تو ہوتا ہے اور پھر ممی ڈیڈی اکیلے رہ جائیں وہ بیمار ہو تو کوئی ان کی تیمارداری کرنے والا نہ ہو۔ اکیلے ہوں تو کوئی ان کے پاس بیٹھنے والا نہ ہو سو اس نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالج میں سروس کر لی تھی سب ہی اسے سمجھا سمجھا کر ہار گئے تھے اور وہ اپنی زندگی سے بالکل مطمئن اور خوش تھی، پر چندا اور ببلو کی وجہ سے تو اس کا دل بہت لگا رہتا تھا۔ ہر وقت ہنسنا ہنسانا، خوش رہنا، بس کبھی کبھی ممی کا موڈ خراب ہوتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتیں گھنٹوں پاس بٹھا کر سمجھاتیں لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی۔

"تو پچھتائے گی عاشو! ماں باپ سدا ساتھ نہیں دیتے کل کو ہم نہ ہوئے تو کیسے رہے گی اکیلی۔"

"چھوڑیں بھی مما! اب اس عمر میں شادی کرتی اچھی لگوں گی۔"

"کیوں بوڑھی ہو گئی ہے کیا؟"

"تو اور کیا۔" وہ ہنسی۔

"آپ کے خیال میں لڑکی تینتیس چونتیس سال کی عمر میں ینگ ہوتی ہے کیا۔"

اور ممی حیرت سے دانتوں میں انگلی داب اسے دیکھتیں وہ چوبیس پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی اور اگر وہ کسی کو کہتی کہ اس کی عمر بائیس یا تیئیس سال ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا۔ اس کے لانبے سیاہ چمکتے بالوں میں کہیں ایک بال بھی سفید نہ تھا۔ رخساروں پر صحت کی چمک اور سرخی تھی اور چھوٹے چھوٹے دانت جب وہ ہنستی تو بہت خوبصورت لگتے اور وہ بڑی بڑی دلکش آنکھیں جو ہر وقت ہنستی رہتی تھیں، چمکیلی سیاہ آنکھیں، انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ عمر کی اتنی منزلیں پھلانگ آئی ہے، وہ تو انہیں اب بھی بچی ہی لگتی تھی، ضدی سی اپنی بات منوانے والی۔ انہیں وجاہت کتنا پسند تھا اور کیسے کیسے زور نہیں لگائے تھے انہوں نے کہ وہ مان جائے گی مگر اس نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد دوسرے دن ہی طلاق لے کر گھر واپس آ جائے گی اور تب وہ اس کی ضد کے سامنے ہار گئی تھیں۔

"یقیناً وجاہت ایک اچھا شریک سفر ثابت ہوتا۔"

اس نے بھی دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

مسئلہ تو یہ تھا کہ اسے شادی نہیں کرنا تھی۔

زندگی میں کہیں کوئی غم یا دکھ نہ تھا۔ ایک روز چندا کے ساتھ ٹینس کھیلتے ہوئے وہ گر گئی تھی۔ بظاہر تو اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن اگلی صبح جب ہاتھ سوج گیا تو پتا چلا کہ ایک انگلی میں معمولی سا فریکچر ہو گیا ہے اور وہ ببلو کو ساتھ لے کر ڈاکٹر نیلوفر کے پاس گئی تو پتا چلا کہ وہ گاؤں گئی ہوئی ہیں۔ ان کے خاوند نے کہا۔

"آپ ڈاکٹر یاور کو دکھا لیں، یہ قریب ہی ان کا کلینک ہے۔ میرا نام لیجیے گا۔"

اور جب وہ یاور کلینک میں داخل ہوئی تو وہ اس وقت آپریشن تھیٹر سے باہر نکل رہا تھا۔

"ایکسکیوزمی سر! ڈاکٹر یاور کہاں ملیں گے۔"

"فرمائیے میں ہی ڈاکٹر یاور ہوں۔"

تو نہ جانے کیوں وہ لمحہ بھر کو گھبرا سی گئی۔

"جی۔ وہ مجھے حامد صاحب نے بھیجا ہے۔"

"اچھا آپ چلیں میں ابھی آتا ہوں۔"

اور پھر اس نے بڑی توجہ سے اس کا ہاتھ دیکھا۔

"آپ کی عمر؟" نسخہ لکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پچیس سال۔"

"جی!" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہنس دیا۔

"کمال ہے لڑکیاں اپنی عمر چار پانچ سال گھٹا کر بتاتی ہیں اور آپ بڑھا کر بتا رہی ہیں۔"

"جی نہیں۔ آئی ایم تھرٹی فائیو ایئرز اولڈ۔" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"آپ پڑھتی ہیں۔"

"نہیں۔" وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

"پڑھاتی ہوں میں لیکچرار ہوں۔"

اس کے ہنسنے پر وہ بھی مسکرایا۔

"مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں آیا۔"

"نہ سہی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "میرے خیال میں عمر کے صحیح یا غلط ہونے کا نسخہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔"

"نہیں۔" وہ پھر ہنسا۔

"اچھا آپ کیا پڑھاتی ہیں؟"

"انگریزی۔"

اس نے اس کی بات کا جواب دے کر اپنی انگلی کو دیکھا۔

"کیا پلاسٹر چڑھانا پڑے گا۔"

"نہیں، میرے خیال میں ضروری نہیں۔"

اس نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر الٹا کیا تو یک دم اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکا اور اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"آئی۔ ایم۔ آ۔ ڈاکٹر۔"

"جی۔" وہ جھینپ سی گئی۔

"اچھا ابھی اس پر پٹی بندھوا لیں۔ کل دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔ ذرا سوجن کم ہو جائے۔"

اور پھر اسے کئی بار ڈاکٹر یاور کے پاس جانا پڑا کہ انگلی ٹھیک ہونے کے بجائے مزید بگڑ گئی تھی اور تکلیف شدید تھی۔ اور ان کئی بار کی ملاقاتوں میں وہ خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس نے نیا نیا کلینک کھولا تھا اس لیے زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ بالکل اکیلا ہوتا اور ایسے میں اسے اور ببلو کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتا...... خوبصورت گفتگو کرتا تھا اور بہت اچھے ذوق کا مالک تھا۔ سو خود بخود ہی بے تکلفی ہو گئی تھی اور اسے پتا چل گیا تھا کہ یاور حیات کے والد تین چار سال قبل انتقال کر گئے تھے۔ وہ اکلوتا تھا۔ اور گھر میں اب صرف اس کی والدہ ہیں اور وہ۔ دو سال قبل اس نے ہاؤس جاب مکمل کیا تھا اور کچھ عرصہ سروس کرنے کے بعد اس نے اپنا کلینک بنایا تھا۔

اسے باتیں کرنے کا شوق تھا اس لیے اس کے بارے میں تمام تفصیلات اسے معلوم ہو گئی تھیں۔ خود اسے بھی اس سے باتیں کرنا اچھا لگا تھا۔ بات کرنے والا۔ ہم ذوق ہو بات سمجھتا ہو تو پھر بات کرنے کا مزہ آتا تھا اور جس روز وہ آخری بار اس کے کلینک میں گئی تھی اور اس نے کہا تھا۔

"لیجیے مس چھٹی ہوئی۔ اب آپ کا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے۔ بس کبھی فارغ ہوں تو مٹھی کھولتی اور بند کرتی رہیں۔"

تو وہ ایک دم افسردہ ہو گئی تھی۔

"تھینک یو ڈاکٹر! آپ نے بڑے خلوص سے میرا علاج کیا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"آج آپ کے ہاتھ ٹھیک ہونے کی خوشی میں ایک کپ چائے نہ پی لیں۔"

"لیکن۔"

"پلیز۔" جانے اس کی نظروں میں کیا تھا کہ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بیٹھ گئی اور پھر باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ وہ تو جب ببلو نے اس کا آنچل پکڑ کر کھینچا تو وہ چونکی۔

"آنٹی! اب چلیں بھی نا! مجھے کھیلنا بھی تھا۔"

"ہاں چلتے ہیں۔" اس نے باہر دیکھا کچھ مریض آرہے تھے۔

"آپ کے مریض بھی آگئے۔"

وہ کھڑی ہوگئی۔

"کاش نہ آتے۔"

اس نے زیرلب کہا لیکن عائشہ نے سن لیا اور اس کا دل یک دم زور سے دھڑکا اور کن اکھیوں سے اس نے ڈاکٹر یاور کو دیکھا جو بڑی پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"شکریہ، آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت کٹا۔ اگر آپ میری دعوت قبول نہ کرتیں تو مجھے دکھ ہوتا آپ بہت اچھی ہیں مس عائشہ آپ کی اسٹوڈنٹس تو آپ کو بہت پسند کرتی ہوں گی نا۔"

جی پتا نہیں۔" اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ مس اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ آپ یہاں آتی رہا کریں کہ ظاہر ہے میں ڈاکٹر ہوں۔ اور خدا نہ کرے کہ آپ مریض بن کر آئیں۔ ہاں کبھی گھر تشریف لائیں نا اپنی والدہ سے آپ کو ملواؤں گا۔ وہ یقیناً آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"جی کوشش کروں گی، وعدہ نہیں کرتی۔"

"یہ کلینک کے بالکل ساتھ ہمارا گھر ہے۔"

اور پھر کتنی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے گھر جائے دور کہیں راستے میں اسے مل جائے اور پھر اپنی سوچ پر وہ خود ہی شرمندہ ہوگئی یہ میں بھلا اس کے بارے میں اتنا کیوں سوچتی ہوں اور یہ کس قدر غلط بات ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بار بار تنبیہ کی، اپنے آپ کو بلو اور چندا کے ساتھ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی، رومانہ سے جو اتفاق سے ان دنوں یہاں ہی تھی اس کے میاں ایک سال کے لیے کوئی کورس کرنے باہر چلے گئے تھے اور وہ تائی اماں کے پاس ہی آگئی تھی۔ ایک دیوار ہی تو بیچ میں تھی کالج سے آتی تو رومانہ آجاتی، وہ کتنا ہی خود کو مصروف رکھتی لیکن اس کا تصور اس کے ساتھ رہتا ہولے ہولے باتیں کرتا دھیمے دھیمے مسکراتا اور گہری گہری نظروں سے اسے تکتا اور یہ نظریں ہی تو اس کے دل میں کھب گئی تھیں

یوں بھلا کب کسی نے اسے دیکھا تھا۔ یا پھر کبھی اس نے دھیان ہی نہ دیا ہو۔

"یا اللہ! میں کیا کروں۔"

وہ خود کو سمجھا سمجھا کر ہار گئی تھی تھک گئی تھی۔ یہ کیسا بے بسی کا موڑ تھا کہ عمر کے اس دور میں وہ اپنے سے کم از کم چھ سات سال چھوٹے ڈاکٹر یاور حیات کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اور محبت بھی کیسی جس نے اسے ایک احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔

"ربا! ایسا کیوں ہوا۔ یہ شخص کیوں اس طرح میرے دل پر قابض ہوگیا ہے کہ اس کے سوا مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ کیا ہے آخر اس میں، بے حد عام سا بندہ ہے۔ اس جیسے نہ جانے کتنے ہی ملے ہوں گے مگر وہ کسی سے متاثر نہ ہوئی تھی اور وجاہت تو اتنی زبردست شخصیت کا مالک تھا کہ خاندان بھر کی لڑکیاں اس کے خواب دیکھتی تھیں لیکن وہ اس سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی تھی اور اب اس سے، ڈاکٹر یاور حیات سے۔

"اوہ میرے خدا! اس شخص کا خیال میرے دل سے نکال دے۔"

وہ آنکھیں موندے دعا مانگتی اور اس کی پلکیں گیلی ہو جاتیں۔ اس سے ملے اسے دیکھے پورے چھ ماہ گزر گئے تھے۔ مگر اس کا خیال اس کے دل سے جاتا ہی نہ تھا۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہوگئی تھی۔ احساس ندامت اور شرمندگی اسے مارے ڈالتی۔

اندر ہی اندر وہ کڑھتی رہتی جلتی رہتی۔ اپنے آپ کو ڈانٹتی غصہ ہوتی، خفا ہوتی مگر سب کچھ بے فائدہ تھا۔ سوچ سوچ کر اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ گالوں کے گلاب مرجھا گئے تھے اور آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔

کبھی تو کبھی تو وہ اس کا خیال ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

وہ اپنے آپ کو ڈھارس دیتی۔

اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور وہ پہلے جیسی عائشہ بن جائے گی ہنستی مسکراتی لاپروا اور خوش باش مگر شاید اس میں کچھ وقت لگے۔ لیکن نہیں اسے ابھی ہی سنبھل جانا چاہیے۔ پپا یا حسیب بھائی نے اگر یہی بات پوچھ لی تو کیا کہوں گی میں وہ یہی سمجھیں گے کہ شاید میں پچھتا رہی ہوں اور شاید میں۔ اوہ نہیں، پلیز ڈاکٹر یاور۔ اس طرح مت ڈگمگاؤ مجھے۔

اس کی پلکوں پر آنسو تھرتھرانے لگے اور اس نے ان آنسوؤں کو بہنے دیا، تھوڑی دیر تک وہ یونہی روتی رہی مگر دل کا بوجھ کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔ تب منہ ہاتھ دھو کر وہ

کمرے سے باہر نکل آئی تا کہ چندا اور ببلو کے ساتھ دل بہلا سکے۔

ڈاکٹر نیلوفر کے کلینک کی طرف جاتے ہوئے لمحہ بھر کو وہ رک سی گئی۔ قریب ہی ڈاکٹر یاور کا کلینک تھا۔ یک دم بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ ڈاکٹر نیلوفر کے پاس جانے کے بجائے اس کی طرف چلی جائے۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ رومی ڈاکٹر نیلوفر کے پاس اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس نے کالج فون کر کے بھی اسے یاد دہانی کرائی تھی۔ اور۔ اور ان راستوں پر چلنے کا کیا فائدہ جو منزل تک نہ لے جاتے ہوں۔ اور پھر میرا ڈاکٹر یاور سے رشتہ ہی کیا ہے محض چند دن کے لیے میں اس کی مریض رہی ہوں اور۔ اور اسے تو شاید یاد بھی نہ رہا ہوگا۔ ایک دن میں نہ جانے کتنے مریض آتے ہیں اور ڈاکٹر نیلوفر کے کلینک میں داخل ہوگئی۔ نگاہیں جھکائے وہ ہولے ہولے قدم اٹھا رہی تھی۔

''ارے آپ مس عائشہ۔''

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

بالکل سامنے ڈاکٹر یاور حیات کھڑا تھا۔ خوشی سے دمکتا چہرہ مسکراتی آنکھیں، اسے اپنی سماعت اور اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

کہیں یہ میرا تصور ہی نہ ہو۔

''مس کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔''

اس کا دمکتا رنگ ماند سا پڑ گیا۔

''میں ڈاکٹر یاور ہوں۔''

''جی۔ کیسے ہیں آپ؟''

''فائن۔'' اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''مگر آپ کیا کچھ بیمار رہی ہیں۔''

''نہیں۔ نہیں تو۔'' وہ گھبرا گئی۔

''پھر آپ اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہیں۔''

''بس یونہی''

''آپ کا ہاتھ تو اب ٹھیک ہے نا۔''

''جی۔''

''آپ کہاں کھو گئی تھیں مس میں نے آپ کو اکثر یاد کیا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

دھک دھک اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

تو کیا وہ بھی، وہ بھی اسے یاد کرتا رہا تھا۔

''ان چھ ماہ میں، میں نے اس امید پر ڈاکٹر نیلو کے کلینک کے کئی چکر لگائے کہ شاید کہیں کسی دن آپ۔''

وہ بات کرتے کرتے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

''مگر کیوں؟'' بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

''کیوں؟'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''پتا نہیں اس کیوں کا مطلب تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا لیکن کچھ باتیں۔ سمجھائی نہیں جا سکتیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں۔''

یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ ڈاکٹر یاور کیا کہہ رہا ہے۔ وہ جو اپنی سوچ اور اپنے حالات پر شرمندہ تھی اپنے آپ کو ڈانٹتی اور خفا ہوتی رہتی تھی اور یہ ڈاکٹر یاور ذرا بھی شرمندہ نہیں اور کیسے بے باکی سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔

''پتا ہے مس عاشی! میں نے ماں جی سے کہا تھا کہ کسی دن آپ آئیں گی۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا کہ آپ کسی دن ضرور آئیں گی مگر آپ نہ آئیں۔ آپ کیوں نہ آئیں مس۔''

وہ پوچھ رہا تھا۔

لیکن وہ چپ کھڑی تھی۔

''بتائیں نا۔''

''آپ۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈاکٹر۔''

''تو کیا آپ میری باتوں سے ناراض ہو گئی ہیں۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''چلیں میں سوری کر لیتا ہوں۔''

''وہ رومی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''اچھا وہ خاتون جو اندر ڈاکٹر نیلوفر کے پاس بیٹھی ہیں اور اپنی کزن کی صحت کے متعلق انتہائی فکر مند ہو رہی ہیں۔ کہیں وہ کزن آپ تو نہیں۔''

''ہاں شاید وہ رومی ہی ہو گی۔ بس وہ یونہی میری صحت کے لیے پریشان ہو رہی ہے۔''

''لیکن آپ کو ہوا کیا ہے مس! اس وقت تو آپ بالکل صحت مند تھیں۔''

''پتا نہیں۔''

''آپ کو کسی بات کا پتا بھی ہے۔''

وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ تمہیں کیا پتا، ڈاکٹر یاور حیات کہ اس کا سبب تم ہی ہو۔ تم ہی نے تو میری زندگی میں ہلچل مچا دی ہے۔ مجھے ایک مسلسل عذاب میں ایک احساس جرم میں مبتلا کر دیا ہے، پھر بھی تم سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے، دل چاہتا ہے کہ وقت یہیں کہیں تھم جائے اور تم یونہی کھڑے مجھ سے باتیں کرتے رہو۔ اپنی اس سوچ پر وہ اندر ہی اندر نادم ہو گئی اور اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

''اچھا خدا حافظ۔''

''خدا حافظ لیکن۔'' ڈاکٹر یاور حیات نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''خدا حافظ کہنے سے پہلے ایک بات، میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ آئیں گی ناں کسی دن۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا۔ پتا نہیں کیوں۔ اکثر آپ مجھے یاد آئیں اور میرا دل بے اختیار آپ سے ملنے آپ سے باتیں کرنے کو چاہا۔ مگر آپ کا کوئی پتا نشان بھی نہیں تھا میرے پاس ورنہ شاید میں خود ہی چلا آتا۔ آپ آئیں گی نا۔''

''کوشش کروں گی۔''

اس نے آہستگی سے کہا۔

''نہیں کوشش نہیں، وعدہ کریں پلیز۔''

اور وہ نظریں اٹھا کر رہ گئی۔

''خدا حافظ۔''

وہ ایک بار پھر خدا حافظ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے عجب سی بے چینی اور بے کلی تھی جو اسے مضطرب رکھتی تھی تپتی دوپہر میں وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر چکراتی پھرتی۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ایک بار اس کے کلینک چلی جائے وہ اس کا منتظر ہوگا مگر ہر بار وہ اپنے آپ کو روک لیتی نہیں عاشی ابھی سے اپنے آپ کو روک لو۔ ورنہ جو کشتیاں اپنی نہ ہوں ان پر سفر کرنے کا کیا فائدہ۔ مگر اپنے آپ کو اتنا سمجھانے کے باوجود ایک روز بالکل غیر ارادی طور پر اس کی انگلیاں ڈائل پر گھوم گئیں۔

''ہیلو ڈاکٹر یاور ہیں۔''

''جی۔''

''سوری ڈاکٹر میں وعدے کے باوجود نہیں آ سکی۔''

''اوہ آپ مس عائشہ ہیں نا۔ تھینک گاڈ۔ اس وقت میں خدا سے کچھ اور مانگتا تو وہ بھی مل جاتا۔''

خوشی ایک دم اس کے لہجے سے ٹپکنے لگی تھی۔

''آپ یقین کریں گی کہ میں اس وقت آپ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔''

''کیوں؟''

''آپ اس کی وجہ جاننے پر آخر بضد کیوں ہیں؟'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''کچھ باتوں کا کوئی جواز نہیں ہوتا ہمارے پاس۔ ہم خود بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کیوں ہے آپ جانتی ہیں بعض اوقات انسان مہینوں سالوں کسی سے ملتا رہتا ہے مگر اجنبی رہتا ہے۔ مگر بعض اوقات چند لمحوں کی ملاقات میں برسوں کی شناسائی ہو جاتی ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ آپ کیا میری دوست نہیں بن سکتیں مس۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح کبھی مل نہیں سکتے کیا؟''

''وہ دراصل میں نے۔'' وہ ذرا سا گھبرائی۔

''مگر کیوں، پلیز مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ کچھ غلط کہہ دیا ہے میں نے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس وہ۔''

''دیکھیں مس عائشی! میرے ذہن میں کوئی غلط خیال یا بات ہرگز نہیں تھی، میں آپ کے شہر میں اجنبی ہوں، آپ سے باتیں کرنا اچھا لگا، اس لیے آپ سے دوستی کا خواہاں

تھا۔لیکن اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو سوری۔"

اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ تو خود اس سے بچنا چاہتی ہے۔فرار چاہتی ہے۔اسے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ان راستوں پر اس کے قدم بہک نہ جائیں۔

"باتیں کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے ناں مس۔مجھے اجازت دیں کہ کبھی کبھی میں آپ کو فون کر لیا کروں۔اس شہر میں میرا کوئی دوست نہیں ہے اور پتا نہیں کیوں آپ۔"

وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔

"کیا میں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔آپ بتائیں نا کیا فون کر لیا کروں آپ کو؟"

"اچھا کر لیا کریں۔"

اس نے نمبر لکھوا دیا۔

"اوہ تھینک یو مس!"

اور پھر بہت سارے دن گزر گئے کبھی کبھی ڈاکٹر یاور کا فون آ جاتا۔اور وہ مختلف باتوں پر ڈسکس کرتے۔کبھی چندا اور ببلو کی باتیں کبھی یاور اسے اپنے بارے میں اور اپنی والدہ کے بارے میں بتاتے انہیں اپنی والدہ سے بے حد محبت تھی اور کبھی یوں ہی ملکی معاملات زیر بحث آ جاتے۔بالکل عام سی باتیں ہوتیں، اور کبھی جو بہت سارے دن گزر جاتے اور ڈاکٹر یاور کا فون نہ آتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔مضطرب سی ہو کر ادھر ادھر پھرتی۔

"اللہ! یہ کیا ہے۔یہ بے چینی، یہ اضطراب آخر میں کیوں اسے اتنا زیادہ یاد کرتی ہوں۔"

پھر وہ خود ہی جواز ڈھونڈ لیتی۔

شاید اس لیے کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے، اور رومانہ چلی گئی ہے اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ عمر کے اتنے سارے سال میں نے گزار دیے اور کوئی دوست ہی بنا نہ پائی اور جن سے کالج کے زمانے میں تھوڑی بہت دوستی تھی بھی، ان سب کی شادیاں ہو گئی تھیں، اور شادی کے بعد یہ تھوڑی بہت دوستی خود بخود ہی ختم ہو گئی تھی اور کولیگز میں بھی زیادہ تر شادی شدہ تھیں ان کے اپنے مسائل تھے اور اپنی دلچسپیاں بچوں کی باتیں، شوہروں کے قصے، ساس نندوں

سے گلے، شکوے، وہ بہت جلد ان کی محفل میں اوب جاتی تھی۔شاید اسی لیے ڈاکٹر یاور سے باتیں کرنا اسے اچھا لگتا تھا، جیسے ایک دم بند کمرے سے کھلی فضا میں آ گئی ہو، عجیب سی فرحت اور کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔یاور اس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتا وہ اپنے بچپن کے شوق، کالج اور اسکول کی باتیں اس سے کرتی اور تب وہ خود ہی اسے فون کر لیتی۔وہ بہت خوش ہوتا۔

"پتا ہے میں دیکھ رہا تھا کہ آپ مجھے مس کرتی ہیں یا نہیں۔"

"اور اگر میں فون نہ کرتی تو۔"

"تو میں سمجھتا کہ آپ میری دوست نہیں ہیں۔"

"اور اب!"

"اب میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس اجنبی شہر میں میری ایک اچھی اور مخلص دوست ہے، یہ دوستی کا جذبہ بھی عجیب ہوتا ہے، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ زندگی میں بہت لوگ ملے، کلاس فیلوز، کزنز، کولیگز، دوست بھی بہت بنے، لیکن پتا نہیں کیوں میں آپ سے جو جو باتیں کرتا ہوں اور جس طرح آپ مجھے بہت اپنی اپنی لگتی ہیں، ایسا کبھی نہیں لگا۔" اور پھر وہ باتیں کیے جاتے۔

وہی ہمیشہ والی باتیں۔

اب وہ خاصی مطمئن رہنے لگی تھی اسے یقین ہو گیا تھا کہ بس وہ اچھے دوست ہیں اور یہ کہ کبھی کبھی جب کوئی اپنا ہم ذوق مل جائے جو ہماری باتوں کو سمجھ سکے تو اس سے باتیں کرنے اور ملنے کو دل چاہتا ہے بس۔اور یہ محبت نہیں۔

یہ تو محض میرے اندر کی تنہائی تھی جو دوسراہٹ چاہتی تھی اور وہ بغیر کسی خوف، ندامت اور شرمندگی کے کبھی کبھی ڈاکٹر یاور کے گھر بھی جانے لگی، ڈاکٹر یاور کی والدہ بہت نرم خو اور اچھے مزاج کی تھیں، نرمی اور محبت سے بات کرتی تھیں، اس کے بے حد اصرار پر دو ایک بار وہ اس کے گھر بھی آئی تھیں، ڈاکٹر یاور بھی ساتھ تھے بھابھی اور ممی سے بھی ملے تھے۔

تو میرے سارے خوف بے معنی تھے اور سارے وہم غلط۔

اس کی صحت پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔

وہی ہنستی چمکتی آنکھیں۔

وہی صحت کی چمک سے دمکتے گلابی رخسار۔

"اللہ عاشی تو۔ تو روز بروز کم عمر ہوتی جا رہی ہے لگتا ہے وقت تجھے بغیر چھوئے گزر رہا ہے۔"

کبھی کبھی بھابھی رشک سے کہتیں۔

"سچی اب بھی وقت ہے عاشو! اپنا فیصلہ بدل ڈال، زندگی کا سفر اکیلے کاٹنا بہت مشکل ہو جائے گا، ممی ڈیڈی کب تک ساتھ دیں گے، پگلی، آج نہیں تو کل یہ تنہائی تجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔"

"ارے نہیں بھابھی جان! ہمارے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور سچی میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں اپنی زندگی سے کتنی مطمئن اور کتنی خوش ہوں، کوئی پچھتاوا، کوئی افسوس نہیں مجھے۔"

"آج نہیں تو کل تو ضرور پچھتائے گی چندا۔ میری بات پر غور کرنا۔"

مگر وہ سمجھتی تھی کہ بھابھی کی سوچ غلط ہے، اسے بھلا کیا غم ہے، اتنی اچھی بھابھی ہیں اتنے محبت کرنے والے بھائی ہیں، اور ممی ڈیڈی ہیں جو اس کی بے جا ضدوں کو بھی مان لیتے ہیں اور پھر ڈاکٹر یاور جیسا دوست ہے مخلص اور ہمدرد اور کیا چاہیے۔

زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ ایک روز ڈاکٹر یاور نے اس پرسکون پانی میں پتھر پھینک کر ہلچل مچا دی۔

"آپ کو پتا ہے، ماں جی بیمار رہتی ہیں۔"

"ہاں!"

"اور وہ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہاں انہوں نے بتایا تو تھا کہ وہ آپ کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں، بلکہ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتاؤں، میں نے بھابھی سے کہا تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکی ہے ان کی نظر میں بہت اچھی۔"

"اوہ!" وہ جھنجلا گیا۔

"میں نے آپ سے یہ تفصیل نہیں پوچھی ان چند ماہ میں ماجی جی مجھے کم از کم پچاس لڑکیوں کے بارے میں تو بتا چکی ہوں گی۔"

"پھر؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ان پچاس لڑکیوں میں سے ایک بھی آپ کو پسند نہیں آئی۔"

"ہاں!" اس نے بے بسی سے کہا۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں شاید۔"

وہ کھڑا ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

"شاید۔" ٹہلتے ٹہلتے رک کر اس نے اسے دیکھا۔

"میں ہر لڑکی میں وہ خوبیاں تلاش کرتا ہوں جو آپ میں ہیں۔"

"مجھ میں۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

"مجھ میں بھلا کیا خوبیاں ہیں، میں تو ایک بہت عام سی لڑکی سادہ سی لڑکی ہوں۔"

"آدمی کو خود اپنی خوبیوں کا ادراک نہیں ہوتا۔"

"اچھا!"

وہ خواہ مخواہ ہی ہنس دی مگر وہ سنجیدہ تھا۔

"میں نے، میں نے بہت غور کیا ہے۔ بہت سوچا ہے اور بالآخر مجھے ادراک ہوا ہے کہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔"

اس نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"مجھ پر اچانک ہی یہ انکشاف ہوا ہے کہ آپ کی رفاقت مجھے جو خوشی دے سکتی ہے، وہ کسی اور لڑکی کی رفاقت نہیں، آپ کیا۔ میں آپ کو پرپوز کر سکتا ہوں۔"

وہ ساکت بیٹھی ہاتھ گود میں دھرے اپنے ناخنوں کو گھورتی رہی۔

"آپ ناراض ہو گئی ہیں؟"

کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

مگر وہ چپ ہی رہی۔

"مجھے ڈر تھا میں خوفزدہ تھا کہ آپ ناراض ہو جائیں گی مگر میں کیا کرتا۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کرتا مس عاشی میں بہت سچا اور کھرا آدمی ہوں اور میں نے پوری سچائی کے ساتھ جو کچھ محسوس کیا ہے آپ سے کہہ دیا ہے میں کسی اور لڑکی کو رفیق بنا کر دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میں پوری سچائی اور یقین کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر رہا ہوں کہ میں شاید آپ

سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

اور شاید کسی نے صحیح ہی کہا تھا۔

اس نے گود میں ہاتھ دھرے دھرے سوچا۔

کہ محبت اندھی ہوتی ہے نہ بچپنا۔ دیکھتی ہے نہ بڑھاپا نہ عمروں کا حساب کتاب کرتی ہے اور نہ۔

"پلیز، آپ کچھ تو کہیں کچھ تو بولیں اس طرح خاموش رہ کر مجھے سزا نہ دیں۔"

"آپ۔"

اسے لگ رہا تھا جیسے اسکی گویائی ختم ہو گئی ہو۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ مجھ سے پورے سات برس چھوٹے ہیں۔"

"جانتا ہوں۔"

اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا جب فریکوئینسی یکساں ہو تو روحوں کا باہمی ابلاغ بڑا موثر ہوتا ہے اور میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ جتنا آپ مجھے اور میں آپ کو سمجھتا ہوں شاید کوئی اور ہمیں اتنا نہ سمجھ سکے۔ آپ یقین کریں ہم بہت خوش رہیں گے۔ بہت مثالی زندگی ہوگی ہماری اور ماں جی کو بھی کوئی اعتراض نہیں، وہ تو میری خوشیوں میں خوش ہیں۔"

"نہیں آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی، آپ کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"

ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

"پلیز، آپ روئیں نہیں میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔"

"میں نے جو کچھ آپ سے کہا ہے میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں، ہاں مجھے اس پر ندامت ہے کہ میری بات سے آپ کو دکھ پہنچا۔ لیکن عاشی تم تم پلیز میری بات پر غور کرنا۔ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرنا، مجھے یقین ہے کہ تم سوری آپ کا فیصلہ مجھ سے مختلف نہیں ہوگا۔ آپ کو "تم" کہہ کر بلانے کا حق ابھی محفوظ رکھتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"آپ پلیز ایسا مت سوچیں۔ یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے۔"

اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"میں آپ کو کئی مثالیں بتا سکتا ہوں اور یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ ان کی زندگی بڑی خوشگوار اور ٹھیک ٹھاک گزر رہی ہے۔ یہ ڈاکٹر نیلوفر کو ہی لے لیں آپ کو پتا ہے حامد صاحب ان سے پورے نو برس چھوٹے ہیں میرا اور آپ کا تو پھر سات برس کا فرق ہے اور وہ بھی پتا نہیں چلتا۔ آپ مجھ سے دو برس چھوٹی ہی لگتی ہیں۔"

"وہ مجبوری کے سودے ہوتے ہیں ڈاکٹر خاندان میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر نیلوفر کے بھائی بھی تو حامد صاحب کی بہن سے چھوٹے ہیں ادنے بدلے کی شادی ہے اور ہمیں تو ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

"ہماری مجبوری محبت نہیں ہے کیا۔"

اس نے معصومیت سے پوچھا تو باوجود پریشانی کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"آپ بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں ڈاکٹر!"

"یہ بچوں جیسی باتیں نہیں ہیں آپ بچوں جیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آخر آپ کسی سے تو شادی کریں گی ہی نا تو پھر مجھ میں کیا برائی ہے۔"

"کوئی برائی نہیں ہے مگر آپ۔ آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اور یہ بات ناممکن ہے اور مجھے تو شادی کرنا ہی نہیں میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔"

"ہاں!" اس نے چٹکی بجائی۔

"آپ کو تو شادی کرنا ہی نہیں تھی اور آپ بہت نرم دل کی حساس سی خاتون ہیں تو مجھ بے چارے پر رحم کھا کر۔"

"پلیز مذاق نہ کریں۔"

وہ کھڑی ہو گئی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"پلیز آپ میری بات پر غور کریں بے شک جتنے دن مرضی ہے سوچ لیں۔ لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بات کا یقین رکھیے گا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ آپ کی رفاقت کا خواہاں ہوں اور یہ بھی یاد رکھنا کہ محبت

کرنے والے کبھی کبھی ملتے ہیں اور انہیں کھونا نہیں چاہیے محبت سے انکار ظلم ہے۔"

اور وہ چلی گئی۔

تو وہی ہوا......جس کا ڈر تھا۔

وہ دنوں، ہفتوں سوچتی رہی۔ ایک بار پھر اس کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی وہی بے چینی وہی اضطراب اور بے قرار اسے ڈاکٹر یاور پر غصہ آنے لگتا کہ اس نے ایسی بات کہہ کر اسے بے سکون کر دیا تھا۔ لیکن پھر وہ خود ہی ڈاکٹر یاور کو معاف کر دیتی۔

"اور غلطی تو میری ہے۔"

وہ اعتراف کرتی۔

ڈاکٹر یاور کا کیا قصور ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس طرح ملنا باتیں کرنا ہرگز مناسب نہ تھا۔

مگر۔

کوئی اس کے اندر ہولے سے سرگوش کرتا۔

"تمہیں بھی تو، تمہیں بھی تو اس کی کمپنی اچھی لگتی تھی۔"

"ہاں۔"

وہ شرمندہ ہو جاتی اور پھر ایسے ہی لمحوں میں ایک روز اس پر انکشاف ہوا کہ وہ، وہ بھی ڈاکٹر یاور سے محبت کرنے لگی ہے اور۔ اور یہ کہ اس کے بغیر زندگی کا سفر بڑا کٹھن ہو جائے گا۔ "نہیں۔" کتنی دیر تک وہ ساکت کھڑی رہی۔ لیکن خود آگاہی کا یہ لمحہ تو اسے اور بھی دکھی کر گیا۔ وہ جس کرب سے آشنا ہوئی اس سے پہلے ایسا کرب اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

لوگ کیا کہیں گے؟

وہ پانی پانی ہوگئی۔

اور میں مر کیوں نہ گئی، جب یہ انکشاف مجھ پراہوا تھا۔"

اور اس انکشاف سے اس کے وجود کی عمارت میں اتنے زلزلے آئے کہ شدید بیمار پڑ گئی۔ کسی کو اس کی بیماری سمجھ نہیں آ رہی تھی بس وہ خود ہی جانتی تھی کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے، دل کہتا ڈاکٹر یاور کی بات مان لے۔ زندگی میں اچھے لوگ روز روز نہیں ملتے۔ مگر وہ

فوراً ہی دل کی بات جھٹلا دیتی۔

کتنے سارے دن گزر گئے، وہ بظاہر ٹھیک بھی ہوگئی مگر اندر ہی اندر اس کا وجود گھلتا جا رہا تھا۔ تب ایک دن اچانک ہی ڈاکٹر یاور کا فون آ گیا۔

"میرے خیال میں دو ماہ دس دن فیصلہ کرنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر اتنے سارے دن آپ کو فون نہیں کیا تھا تاکہ آپ اطمینان سے فیصلہ کر سکیں۔ تو آپ نے کیا فیصلہ کیا عاشی۔"

"آپ۔ تم ڈاکٹر۔ یہ ناممکن ہے۔"

"کیسے ناممکن ہے، کیا آپ کے والدین۔"

"نہیں، میں خود سمجھتی ہوں کہ یہ مناسب نہیں آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں ڈاکٹر۔"

"اوہ ہو یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔"

"نہیں پلیز ڈاکٹر نہیں۔"

"آپ محبت کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتیں۔" وہ چپ ہی رہی۔

"آپ کو اتنا پتھر دل نہیں سمجھتا تھا۔"

اس نے بڑی مایوسی سے کہا۔

اور تمہیں کیا پتا ڈاکٹر یاور حیات کہ یہ پتھر کیسے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے اور اس انکشاف کے بعد زندگی میرے لیے کتنی کٹھن ہو جائے گی۔ مگر میں تو خود اپنے آپ سے نظر نہیں ملا پا رہی ہوں۔"

"عاشی!" اس نے التجا کی۔

"پلیز، اتنی ظالم مت بنیں دیکھیں آپ میرے ساتھ ساتھ اپنے اوپر بھی ظلم کر رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ عاشی کہ آپ۔ آپ بھی مجھے چاہتی ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے اپنی سسکی کو اپنے ہونٹوں تلے دبا لیا۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

اس نے بڑے یقین سے کہا۔

"دھوکا دے رہی ہیں اپنے آپ کو۔ آپ صرف زمانے سے اور دنیا سے ڈرتی

ہیں۔مگر عاشی میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ دنیا کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے معاملات پر غور کرتی پھرے۔ یہ دنیا یہ زمانہ آپ کے آنسو پونچھنے نہیں آئے گا عاشی۔آپ۔ آپ مجھے نہیں بھول پائیں گی میں آپ کو ہر قدم پر ہر لمحہ یاد آؤں گا۔آپ ایک بار اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔"

لیکن وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کرنا چاہتی تھی وہ جانتی تھی وہ صحیح کہہ رہا ہے پھر بھی۔پھر بھی نہیں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔

اسے لگا جیسے اس کا دل بھی ڈوب گیا ہو اور اب شاید کبھی نہ ابھر سکے۔

لیکن آدمی کو کبھی کبھی اپنی مرضی اور دل کے خلاف بھی تو فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔وہ لوگوں سے زیادہ اپنے آپ سے ڈرتی تھی اپنے آپ سے نادم تھی، شرمندہ تھی۔

تو عمر بھر کی ریاضتوں کا یہ صلہ ملا۔

کہ عمر کے اس دور میں آ کر وہ اپنے سے سات برس چھوٹے ڈاکٹر یاور کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور یہ احساس اسے اندر ہی اندر پانی پانی کر دیتا نہ کالج میں دل لگتا نہ گھر میں، وہ بولائی بولائی رہتی، رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو آنسو خود بخود اس کی بند آنکھوں میں چلے آتے اور تکیہ بھیگتا رہتا۔یا اللہ! میں کیا کروں۔

اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔

ربا! اس کا خیال میرے دل سے نکال دے۔

مگر کوئی بھی دعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اور شدت سے یاد آتا۔

اس کی باتیں اس کی ہنسی، اس کا دیکھنا، اس کی التجائیں۔

"عاشی!" ایک شام پھر اس کا فون آ گیا۔

"ظالم لڑکی تم نے میرے دل کو کرچی کرچی کر دیا ہے اب شاید میں ساری زندگی خوش نہ ہو پاؤں۔کبھی سچی ہنسی ہنس نہ سکوں تمہاری محبت تو میرے لہو میں گردش کرنے لگی ہے اس سے تو اچھا تھا کہ ہم یونہی ساری زندگی ملتے رہتے یہ جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کاش میں تم سے وہ سب کچھ نہ کہتا۔"

وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہتی۔

"محبت کا ایک بول آدمی کو پگھلا دیتا ہے۔عاشی تم کیسی لڑکی ہو کہ تمہارا دل نہیں پگھلتا۔"

اور تم کیا جانو ڈاکٹر یاور حیات کہ میرا دل تو پگھل پگھل کر پانی ہو گیا ہے۔مگر بہت سارے خوف بہت سے وسوسے، بہت سی ندامتیں میرے دل سے لپٹی ہوئی ہیں۔بخدا اگر تم مجھ سے عمر میں اتنے چھوٹے نہ ہوتے تو شاید۔

"عاشی پلیز بولو نا کچھ تو کہو۔"

اس نے التجا کی۔

"نہیں ڈاکٹر آپ کسی بہت ہی اچھی لڑکی سے جسے ماں جی نے پسند کیا ہے شادی کر لیں۔"

"کیا ایسی شادی مجھے خوشی دے سکتی ہے۔"

"ہولے ہولے سب ٹھیک ہو جاتا ہے ڈاکٹر۔"

"نہیں، وہ اور لوگ ہوتے ہوں گے عاشی جن کے راستے بدلتے رہتے ہیں ہم ان لوگوں میں سے ہیں کہ ع

ایں درگرفتہ است و خوب گرفتہ است"

"آپ تم۔" اس نے گہری سانس لی اور نرمی سے سمجھایا۔

"یہ بات ممکن نہیں ہے اور آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ۔"

"میری بہتری کس میں ہے اسے میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔مگر پلیز ایک بار صرف ایک بار مجھے بتا دیں کہ کیا آپ بھی۔"

اور اس کا دل چاہا وہ اعتراف کر لے۔

"ہاں ڈاکٹر یاور! تم نے بھی میرے دل پر شب خون مارا ہے۔میرے پتھر کو ریزہ ریزہ کیا ہے اور میرے دل کو اپنی محبت کے سحر میں گرفتار کر لیا ہے۔شاید اسی دن سے تم میرے دل پر قبضہ جمائے بیٹھے ہو جس دن پہلی بار ہم ملے تھے۔"

"مگر نہیں۔" اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔

اپنی نظروں میں تو وہ گر ہی گئی تھی اور یہ اعتراف تو اسے اس کی نظروں میں بھی گرا

دے گا۔

"مگر نہیں، وہ تو خود بھی۔"

دل نے سرگوشی کی۔

"ہاں مگر نہیں یہ اعتراف شاید اس کی زندگی کو مزید کٹھن بنا دے یہ احساس کہ میں بھی اس سے اتنی ہی شدید محبت کرتی ہوں کہیں زندگی کو اس کے لیے "اوکھا" نہ کر دے۔ ابھی تو یہ امکان ہے کہ کسی دن اس کے دل سے میرا خیال نکل جائے اور وہ اسے محض جذباتی حماقت سمجھ کر بھلا دے اور جنہیں چاہا جائے جن سے محبت کی جائے ان کے لیے زندگی کو کٹھن نہیں سہل بنایا جاتا ہے۔

"آپ بولتی کیوں نہیں بولیں نا پلیز یوں تو میں جانتا ہوں محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی، اس میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی محبت خود اپنے آپ کو منوا لیتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو اتنی شدت سے چاہوں اور آپ مجھے نہ چاہئیں۔"

"محبت ایک الگ بات ہے ڈاکٹر۔ محبت تو ہم بہت سے لوگوں سے کرتے ہیں ماں باپ، بہن بھائی دوست احباب سب سے لیکن میں ایسا نہیں سوچتی جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔"

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے کہا۔

"آپ اپنے آپ کو بہلا رہی ہیں۔"

اس کی آواز گر سی گئی۔ عجیب سی شکستگی اور تھکن تھی اس کی آواز میں۔

"میں آپ کے سچ کا منتظر رہوں گا اور مجھے یقین ہے، کہ آپ اپنے آپ سے زیادہ دیر تک جھوٹ نہیں بول پائیں گی جینا مشکل ہو جائے گا میرے بغیر۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"شاید۔ شاید تم سچ کہتے ہو ڈاکٹر یاور حیات۔"

اس نے نڈھال ہو کر کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔

لیکن یہ سچ بولنا کتنا مشکل ہے، شاید تمہیں اس کا ادراک نہیں ہے، مگر میں یہ جنگ نہیں ہاروں گی۔ اور پھر کئی دن یوں ہی گزر گئے اپنے آپ سے لڑتے جنگ کرتے کبھی دل

چاہتا اپنا خالی دامن ڈاکٹر یاور کی بے تحاشا محبتوں سے بھر لے اور کبھی لوگوں کی ہنستی، تمسخر اڑاتی نظریں اس کے وجود میں دراڑیں ڈالنے لگتیں۔

نہیں میں بھلا ایسے لوگوں کی نظریں برداشت کر پاؤں گی۔ اس روز وہ یونہی گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔ بھابھی بڑبڑا رہی تھیں۔ اور ممی ہولے ہولے سر ہلا رہی تھیں۔

"کیا ہے بھابھی؟" وہ ان کے قریب ہی آ بیٹھی۔

"کچھ نہیں لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے نہ کچھ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں منہ اٹھائے چلے آتے ہیں، میں تو خالہ امی کی عمر کا لحاظ کر گئی ورنہ دل چاہتا تھا کہ بے لفظ سناؤں کہ پھر ادھر کا رخ نہ کریں۔"

"مگر کیا ہوا بھابھی؟"

"کیا ہونا تھا بھئی؟"

وہ بدستور غصے میں تھیں۔

"وہ خالہ نور فاطمہ ہیں نا چلی آئیں اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر چار بچوں کا باپ بھئی بیوی مر گئی ہے، بچوں کو سنبھالنے والا نہیں تو کسی بیوہ عورت کو دیکھو، یہ کیا بچوں کو سنبھالنے کے لیے ہماری عاشی ہی نظر آئی انہیں، اور یہی نہیں بی بی۔ اس روز ہی کوئی ہفتہ بھر پہلے بٹ صاحب ملے تھے مجھے۔ کہنے لگے اپنی نند سے میرے دوست بیگ کی شادی کرا دیں۔ بے چارے نے ساری زندگی یونہی گزار دی اب اس عمر میں تنہا نہیں رہا جاتا۔ بڈھے کھوسٹ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور اب شادی کی پڑی ہے میں نے تو خوب سنائیں۔ یاد رکھا تو پھر کسی سے ایسی بات نہ کریں گے بہت ہمدرد بنے پھرتے ہیں اپنے دوست کے۔"

"بھابھی!" اس نے بڑی نرمی سے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"اس عمر میں اب ایسے ہی رشتے آئیں گے آپ یونہی اپنا خون جلا رہی ہیں۔"

"ہاں ہاں بوڑھی ہو گئی ہے نا تو۔"

"اور وہ۔ وہ تمہاری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر یاور حیات!"

اس کے دل نے سرگوشی کی۔

"بندہ سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے اب وہ۔ وہ نادر خان تمہارے قابل ہے۔ نہ تعلیم نہ عمر۔"

پتا نہیں کون کس کے قابل ہے۔
اس نے دلگرفتگی سے سوچا۔
میرے نجم خواب کے روبرو کوئی شے نہیں میرے ڈھنگ کی اور ڈاکٹر یاور۔
جو اس کے سچ کا منتظر ہے۔ اور اگر اس کا انتظار ختم ہو جائے تو شاید وہ درد کی اس صلیب سے اتر جائے۔
"بیگ صاحب اور پھر نادر خان۔"
"یہ تمہارے قابل ہیں۔" بھابھی کی آواز اس کی سماعت میں گونجی۔
کوئی شے نہیں میرے ڈھنگ کی۔
اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹے۔
یہ فلک ہے کشت غبار سا یہ زمیں ہے پانی کے رنگ کی
تو کیا میں اسے انتظار کی اس صلیب سے اتار لوں۔
ہاں اور یہی بہتر ہے۔
اور وہ مجھے چاہتا ہے، اتنا بے حساب اور بھلا کوئی میرے جیسا بھی ہوگا جو اس طرح محبتوں سے دامن چھڑاتا ہے کسی شام میرے جلو میں تھا کوئی خواب وسعت شہر کا۔ کسی صبح میرے وجود پر۔
اور اس طرح اپنے خوابوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑنا۔
اور اپنی محبتوں کو۔
کسی صبح میرے وجود پر۔
اس نے بمشکل پلکیں اٹھا کر بھابھی کی طرف دیکھا۔
"بھابھی آپ۔" بیدردی سے اس نے اپنے لبوں کو کچل ڈالا۔
"خالہ نور فاطمہ کو کہہ دیں کہ۔"
"ارے میں خود ہی کہہ دوں گی ان سے، تمہیں کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"
بھابھی نے اس کی بات کاٹ دی۔
"وہ تو آج نہ جانے کیوں میں لحاظ کر گئی۔ کل ہی ننو کے ہاتھ کہلوا بھیجوں گی کہ آئندہ اس خیال سے ادھر کا رخ نہ کریں۔"

"نہیں بھابھی! آپ، آپ انہیں مایوس نہ کریں۔ ہاں کہہ دیں۔"
"عاشو!" ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
اس کی پلکیں جھک گئیں اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل اس کے سینے سے نوچ کر باہر پھینک دیا ہو، اور زندگی اس کے اندر مر گئی ہو گی۔
"تو کیا کہہ رہی ہے، اتنے اچھے اچھے رشتے آئے وہ وجاہت اور وہ نصیر ممی کو کتنے پسند تھے لیکن تو نے ہاں نہ کی اور اب۔"
شاید یہ اسی کی سزا ہے۔ یہ خلاف فطرت بیوقوفانہ فیصلے اس نے سوچا۔
اور اگر اس وقت وہ وجاہت سے شادی کر لیتی تو شاید اس طرح ڈاکٹر یاور یوں اس عمر میں اس کے دل پر سیندھ نہ لگاتا اور وہ اس طرح خود اپنی نظروں میں نہ گرتی۔ اور اب یہ جو پچھلی عمر کے زخم ہیں۔ یہ بھلا کہاں جینے دیں گے اور اس نے کہا تھا۔
"میرے بنا جینا مشکل ہو جائے گا۔"
مگر وہ زندہ ہی کب ہے، ابھی ابھی تو زندگی اس کے اندر مر گئی ہے۔
بھابھی اب بھی اسی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھیں۔
"تجھے پتا ہے نادر چار بچوں کا باپ ہے اپنی آدھی زندگی گزار چکا ہے۔ پچاس سال سے کم کیا ہوگا۔"
"میری عمر بھی تو کوئی کم نہیں ہے بھابھی۔"
اس نے آہستگی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی لیکن وہ مضبوطی سے ایک ایک قدم اٹھا رہی تھی۔
ربا! مجھے حوصلہ دینا۔
اور مجھے اپنے فیصلے پر قائم رکھنا۔
اور مجھے استقامت دینا۔
کہ یہی بہتر بھی ہے اور مناسب بھی۔
اور آنسو اس کے اندر گر رہے تھے۔ ایک ایک کر کے اور شاید اب وہ کبھی کھل کر رو بھی نہ سکے گی اور آنسو یوں ہی اس کے اندر گرتے رہیں گے قطرہ قطرہ کر کے۔
اور ڈاکٹر یاور! تم مجھے معاف کر دینا۔

اور شاید تم کبھی بھی نہ جان سکو کہ میں نے عائشہ احسن علی نے تمہیں کتنا بے حساب چاہا اور کتنی شدتوں کے ساتھ۔

وہ ذرا سی لڑکھڑائی مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ کہ آگے زندگی کا ایک طویل سفر تھا۔

جو اس نے یونہی طے کرنا تھا ڈاکٹر یاور کی رفاقت کے بغیر جو نہ جانے کتنا کٹھن تھا۔ مگر وہ اس راستے پر چلنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور رگوں کو کاٹ دینے والی اذیت کے باوجود اسے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہ تھا کہ شاید یہی بہتر ہے۔ اور یہی مناسب۔